کشف المحجوب

تالیف: سید علی ہجویریؒ

ترجمہ: میاں طفیل محمد

حضرت شیخ علی ہجویریؒ کی معرکۃ الآرا تصنیف

کشف المحجوب

ترجمہ، ترتیب و تلخیص بزبان اردو

میاں طفیل محمد

اسلامک پبلی کیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ

جملہ حقوق اشاعت برائے اسلامک پبلی کیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ محفوظ ہیں

نام کتاب: **کشف المحجوب**
مصنف: حضرت شیخ علی ہجویریؒ
اشاعت: نومبر 2013ء
ایڈیشن: 27
تعداد: 1100
قیمت: -/320 روپے
مطبع: نوید حفیظ پریس، لاہور

اہتمام:
عبدالحفیظ احمد (منیجنگ ڈائریکٹر)
اسلامک پبلی کیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ
منصورہ ملتان روڈ، لاہور پاکستان
فون: 042-35417074, 35417071
فیکس 042-35417072
موبائل 0321-4942120
ویب سائٹ www.islamicpak.com.pk
ای میل islamicpak@yahoo.com

فہرست مضامین

عرض ناشر	21
دیباچہ طبع اول	23
دیباچہ طبع دوم	29
مصنف کی زندگی کے مختصر حالات	30
نام ونسب	30
آپ کے اساتذہ	30
تعلیم طریقت	34
دوسرے ہم عصر جن سے آپ متاثر ہوئے	35
دو اہم واقعات	35
آپ کا طریق	37
لاہور میں آمد اور قیام	38
آپ کی تصانیف	39
آپ کا مشہور قول	40
شجرۂ نسب وطریقت	41
ایک اصول حدیث قدسی	43
آغاز سخن	44
سبب تالیف	44

وجہ تسمیہ	45
اس کتاب کا علمی مرتبہ	46
خطبۂ افتتاحیہ	47
بسملہ اور صحتِ نیت	49
خدا کی راہ کے حجاب	51
دلی حجاب	51
نفسی حجاب	53
یہ دنیا ابتلا کا محل ہے	54
انسان کے لیے آسان راہ	55
متلاشیانِ حق کے لیے رہنمائی کا انتظام	56
لوگوں کا حال	57
علم اور اس کے حصول کے بارے میں	58
علم حاصل کرنا فرض ہے	58
علم اور عمل لازم و ملزوم ہیں	59
علم کی قسمیں	61
فرض علوم	62
علم حقیقت	63
علم شریعت	67
علم کے ساتھ فکر کی ضرورت اور اہمیت	68
انسانی علم کی حد	69
صحیح علم اور ادراک کا زندگی پر اثر	70
جاہل اہلِ کتاب پیشوا	71

محض علم ہدایت کے لیے کافی نہیں ہے	72
فقر کے بارے میں	73
فقر کا مرتبہ اور اس کی حقیقت	73
اصلی فقیر	74
فقر اور فقیروں کے بارے میں کچھ رموز	75
مصنوعی فقر	76
تصوف کے بارے میں	78
تصوف کی حقیقت خلق	78
اخلاق کے دو اجزاء	78
خدا کے ساتھ اخلاق	78
مخلوق کے ساتھ اخلاق	78
اصلی صوفی کے اوصاف	80
اہل تصوف کی قسمیں	82
تصوف کی ضرورت	82
صوفی کے لباس کے بارے میں	84
گودڑی (مخصوص لباس) پہننے کے حق میں صوفیا کا استدلال	84
گودڑی پہننے کی شرطیں	86
طریقت اور اخلاص فی الدین کا دار لباس پر نہیں ہے	87
صحیح اور استدلال کی رد	89
طریق ملامت کے بارے میں	91
اہل ملامت کا استدلال	91
ملامت کی شرط	93

صحیح مسلک	94
حضرت عثمانؓ کا ایک واقعہ	96
صحابہؓ کرام میں اہل طریقت کے پیشوا	97
۱۔ خلفائے راشدین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین	97
(۱) حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ	97
(۲) حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ	103
(۳) حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ عنہ	109
(۴) حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ عنہ	110
۲۔ اہل بیتؓ میں سے اہل طریقت کے پیشوا 2	113
(۱) حضرت حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ	113
(۲) حضرت حسین رضی اللہ عنہ	116
(۳) حضرت ابوالحسن علی زین العابدین بن حسین المعروف علی اصغرؓ	117
(۴) حضرت ابو جعفر صادق محمد بن علی بن حسین المعروف امام باقرؓ	124
(۵) حضرت ابو محمد جعفر بن محمد صادق بن علی بن حسین رضی اللہ عنہ	126
۳۔ اصحاب صفہ رضی اللہ عنہم	128
تابعین رضی اللہ تعالیٰ میں اہل طریقت کے پیشوا	132
(۱) حضرت اویس قرنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ	132
(۲) حضرت ہرم بن حیان رضی اللہ عنہ	134
(۳) حضرت ابوعلی حسن بصری رضی اللہ عنہ	136
(۴) حضرت سعید ابن المسیب رضی اللہ عنہ	137
تبع تابعین رضی اللہ عنہم میں اہل طریقت کے پیشوا	139
(۱) حضرت حبیب عجمی رحمۃ اللہ علیہ	139

(۲) حضرت مالک بن دینار رحمۃ اللہ علیہ	140
(۳) حضرت ابو حلیم حبیب بن سلیم راعی رحمۃ اللہ علیہ	141
(۴) حضرت ابو حازم مدنی رحمۃ اللہ علیہ	142
(۵) حضرت محمد بن واسع رحمۃ اللہ علیہ	143
(۶) حضرت ابو حنیفہ نعمان بن ثابت رحمۃ اللہ علیہ	143
(۷) حضرت عبداللہ بن مبارک مروزی رحمۃ اللہ علیہ	147
(۸) حضرت ابو علی فضیل بن عیاض رحمۃ اللہ علیہ	149
(۹) حضرت ابو الفیض ذوالنون بن ابراہیم مصری رحمۃ اللہ علیہ	154
(۱۰) حضرت ابو اسحٰق ابراہیم بن ادہم رحمۃ اللہ علیہ	158
(۱۱) حضرت بشر حافی رحمۃ اللہ علیہ	159
(۱۲) حضرت ابو یزید طیفور بن عیسیٰ بسطامی رحمۃ اللہ علیہ	161
(۱۳) حضرت ابو عبداللہ حارث بن اسد محاسبی رحمۃ اللہ علیہ	162
(۱۴) حضرت ابو سلیمان داؤد طائی رحمۃ اللہ علیہ	162
(۱۵) حضرت ابو الحسن سری بن مغلس سقطی رحمۃ اللہ علیہ	163
(۱۶) حضرت ابو علی شقیق بن ابراہیم ازدی رحمۃ اللہ علیہ	164
(۱۷) حضرت ابو سلیمان عبدالرحمن بن عطیہ دارانی رحمۃ اللہ علیہ	166
(خوف و رجا کا توازن)	
(۱۸) حضرت ابو محفوظ معروف کرخی رحمۃ اللہ علیہ	167
(۱۹) حضرت عبدالرحمن حاتم بن عنوان اصم رحمۃ اللہ علیہ	169
(۲۰) حضرت ابو عبداللہ محمد بن ادریس شافعی رحمۃ اللہ علیہ	170
(۲۱) حضرت ابو عبداللہ احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ	171
(۲۲) حضرت ابو الحسن احمد بن ابوالحواری رحمۃ اللہ علیہ	173

(۲۳) حضرت ابو حامد احمد بن خضرویہ بلخی رحمۃ اللہ علیہ 173
(۲۴) حضرت ابو زکریا یحییٰ بن معاذ رازی رحمۃ اللہ علیہ 175
(۲۵) حضرت ابو حفص عمر بن سالم نیشاپوری رحمۃ اللہ علیہ 177
(۲۶) حضرت ابو صالح حمدون رحمۃ اللہ علیہ 179
(۲۷) حضرت ابو القاسم جنید بن محمد بن جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ 180
(۲۸) حضرت ابو الحسن احمد بن محمد خراسانی نوری رحمۃ اللہ علیہ 182
(۲۹) حضرت یحییٰ ابو محمد عبداللہ بن خفیف رحمۃ اللہ علیہ 184
(۳۰) حضرت ابو محمد عبداللہ بن فضل بلخی رحمۃ اللہ علیہ 185
(۳۱) حضرت ابو بکر محمد بن عمر وراق رحمۃ اللہ علیہ 186
(۳۲) حضرت ابو حمزہ خراسانی رحمۃ اللہ علیہ 187
(۳۳) حضرت ابو اسحاق ابراہیم بن احمد خواص رحمۃ اللہ علیہ 188
(۳۴) حضرت ابو حمزہ بغدادی بزاز رحمۃ اللہ علیہ 189
(۳۵) حضرت ابو محمد سہل بن عبداللہ تستری رحمۃ اللہ علیہ 190
(۳۶) حضرت ابو عبداللہ محمد بن علی حکیم ترمذی رحمۃ اللہ علیہ 191
(۳۷) حضرت ابو سعید احمد بن خراز رحمۃ اللہ علیہ 192
(۳۸) حضرت ابو العباس احمد بن مسروق رحمۃ اللہ علیہ 193
(۳۹) حضرت ابو علی بن حسن بن علی جوزجانی رحمۃ اللہ علیہ 194
(۴۰) حضرت ابو محمد بن حسین حریری رحمۃ اللہ علیہ 194
(۴۱) حضرت ابو بکر محمد بن موسیٰ واسطی رحمۃ اللہ علیہ 195
(۴۲) حضرت ابو بکر بن دلف بن جحدر شبلی رحمۃ اللہ علیہ 196
(۴۳) حضرت ابو محمد بن جعفر بن نصیر خلدی رحمۃ اللہ علیہ 197
(۴۴) حضرت ابو علی محمد بن قاسم رودباری رحمۃ اللہ علیہ 198

(۴۵) حضرت ابو العباس قاسم بن مہدی سیاری رحمۃ اللہ علیہ	198
(۴۶) حضرت ابو عبداللہ محمد بن خفیف شیرازی رحمۃ اللہ علیہ	199
(۴۷) حضرت ابو عثمان سعید بن سلام مغربی رحمۃ اللہ علیہ	201
(۴۸) حضرت ابو القاسم ابراہیم بن محمد بن محمود نصر آبادی رحمۃ اللہ علیہ	201
(۴۹) حضرت ابو الحسن علی بن ابراہیم حصری رحمۃ اللہ علیہ	202
متاخرین میں سے صوفیاء کرام کے ائمہ	204
(۱) حضرت شیخ ابو العباس احمد بن محمد اشقانی رحمۃ اللہ علیہ	204
(۲) حضرت ابو جعفر محمد المصباح صیدلانی رحمۃ اللہ علیہ	204
(۳) حضرت ابو القاسم عبدالکریم بن ہوازن القشیری رحمۃ اللہ علیہ	204
(۴) حضرت ابو القاسم علی بن عبداللہ گرگانی رحمۃ اللہ علیہ	204
(۵) حضرت ابو عبداللہ محمد بن علی داستانی بسطامی رحمۃ اللہ علیہ	204
(۶) حضرت ابو سعید فضل اللہ بن محمد مہنی رحمۃ اللہ علیہ	204
(۷) حضرت ابو احمد مظفر بن احمد بن حمدان رحمۃ اللہ علیہ	204
(۸) حضرت ابو الفضل محمد بن حسن ختلی رحمۃ اللہ علیہ	204
صوفیوں کے مختلف فرقے اور ان کے مذاہب کا فرق	205
۱۔ فرقہ محاسبیہ یا محاسبی فرقہ	205
خصوصیات	205
"رضا" کی حقیقت	205
"مقام" اور "حال" کا فرق	207
مقامات تصوف	207
صوفیاء اور شریعت	208
۲۔ قصاری فرقہ	209

(۲۳) حضرت ابو حامد احمد بن خضرویہ بلخی رحمۃ اللہ علیہ	173
(۲۴) حضرت ابو زکریا یحییٰ بن معاذ رازی رحمۃ اللہ علیہ	175
(۲۵) حضرت ابو حفص عمر بن سالم نیشاپوری رحمۃ اللہ علیہ	177
(۲۶) حضرت ابو صالح حمدون رحمۃ اللہ علیہ	179
(۲۷) حضرت ابو القاسم جنید بن محمد بن جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ	180
(۲۸) حضرت ابو الحسن احمد بن محمد خراسانی نوری رحمۃ اللہ علیہ	182
(۲۹) حضرت یحییٰ ابو محمد عبداللہ بن خفیف رحمۃ اللہ علیہ	184
(۳۰) حضرت ابو محمد عبداللہ بن فضل بلخی رحمۃ اللہ علیہ	186
(۳۱) حضرت ابو بکر محمد بن عمر وراق رحمۃ اللہ علیہ	186
(۳۲) حضرت ابو حمزہ خراسانی رحمۃ اللہ علیہ	187
(۳۳) حضرت ابو اسحٰق ابراہیم بن احمد خواص رحمۃ اللہ علیہ	188
(۳۴) حضرت ابو حمزہ بغدادی بزاز رحمۃ اللہ علیہ	189
(۳۵) حضرت ابو محمد سہل بن عبداللہ تستری رحمۃ اللہ علیہ	190
(۳۶) حضرت ابو عبداللہ محمد بن علی حکیم ترمذی رحمۃ اللہ علیہ	191
(۳۷) حضرت ابو سعید احمد بن خراز رحمۃ اللہ علیہ	192
(۳۸) حضرت ابو العباس احمد بن مسروق رحمۃ اللہ علیہ	193
(۳۹) حضرت ابو علی بن حسن بن علی جوزجانی رحمۃ اللہ علیہ	194
(۴۰) حضرت ابو محمد بن حسین جریری رحمۃ اللہ علیہ	194
(۴۱) حضرت ابو بکر محمد بن موسیٰ واسطی رحمۃ اللہ علیہ	195
(۴۲) حضرت ابو بکر بن دلف بن جحدر شبلی رحمۃ اللہ علیہ	196
(۴۳) حضرت ابو محمد بن جعفر بن نصیر خالدی رحمۃ اللہ علیہ	197
(۴۴) حضرت ابو علی محمد بن قاسم رودباری رحمۃ اللہ علیہ	198

(۴۵) حضرت ابو العباس قاسم بن مہدی سیاری رحمۃ اللہ علیہ	198
(۴۶) حضرت ابو عبداللہ محمد بن خفیف شیرازی رحمۃ اللہ علیہ	199
(۴۷) حضرت ابو عثمان سعید بن سلام مغربی رحمۃ اللہ علیہ	201
(۴۸) حضرت ابو القاسم ابراہیم بن محمد نصر آبادی رحمۃ اللہ علیہ	201
(۴۹) حضرت ابو الحسن علی بن ابراہیم حصری رحمۃ اللہ علیہ	202
متاخرین میں سے صوفیاء کرام کے ائمہ	204
(۱) حضرت شیخ ابو العباس احمد بن محمد اشقانی رحمۃ اللہ علیہ	204
(۲) حضرت ابو جعفر محمد المصباح صیدلانی رحمۃ اللہ علیہ	204
(۳) حضرت ابو القاسم عبدالکریم بن ہوازن القشیری رحمۃ اللہ علیہ	204
(۴) حضرت ابو القاسم بن علی بن عبداللہ گرگانی رحمۃ اللہ علیہ	204
(۵) حضرت ابو عبداللہ محمد بن علی داستانی بسطامی رحمۃ اللہ علیہ	204
(۶) حضرت ابو سعید فضل اللہ بن محمد میہنی رحمۃ اللہ علیہ	204
(۷) حضرت ابو احمد مظفر بن احمد بن حمدان رحمۃ اللہ علیہ	204
(۸) حضرت ابو الفضل محمد بن حسن ختلی رحمۃ اللہ علیہ	204
صوفیوں کے مختلف فرقے اور ان کے مذاہب کا فرق	206
۱۔ فرقہ محاسبیہ یا محاسبی فرقہ	206
خصوصیات	206
"رضا" کی حقیقت	205
"مقام" اور "حال" کا فرق	207
مقامات تصوف	207
صوفیاء اور شریعت	208
۲۔ قصاری فرقہ	209

خصوصیات	209
طریقِ ملامت	209
۳۔ طیفوری فرقہ یا فرقہ طیفوریہ	210
خصوصیات	210
سُکر یعنی بے ہوشی	210
۴۔ جنیدی فرقہ	211
خصوصیات	211
...صحو: یعنی ہوش	211
سُکر کی فضیلت کے بارے میں طیفوریہ کے دلائل	212
صحو کی فضیلت کے بارے میں جنیدیہ کے دلائل	212
قولِ فیصل	213
۵۔ نوری فرقہ	214
خصوصیات: صحبت اور ایثار	214
ایثار	214
نیکیوں کی چابی	218
۶۔ فرقہ سہلیہ	218
خصوصیات	218
مجاہدۂ نفس، اس کی اہمیت اور حقیقت	219
ہوائے نفس کی دو قسمیں	220
۷۔ فرقہ حکیمیہ	221
خصوصیات	221
ولایت اور اس کی حقیقت	221

اولیاء اور شریعت	222
اولیاء سے کرامتوں کا ظہور	223
معجزہ اور کرامت	223
اولیاء اور عصمت	224
کرامتوں کے واقعات	224
انبیاء اور اولیاء	226
۸۔ فرقہ خرازیہ	227
خصوصیت	227
"فنا" اور "بقا" کی حقیقت	227
۹۔ فرقہ خفیفیہ	228
خصوصیت	228
"غیبت" اور "حضور" کی حقیقت	229
"غیبت" اور "حضور" کی کیفیت	229
۱۰۔ فرقہ سیاریہ	230
خصوصیت	230
"جمع" اور "تفرقہ" کے معنی اور حقیقت	230
"جمع" اور "تفرقہ" کے بارے میں صوفیاء کا اختلاف	232
قول فیصل	232
۱۱۔۱۲۔ حلولیہ فرقے	233
خصوصیت اور دینی حیثیت	233
تصوف کے مسائل اور راہ سلوک کے حجاب	235
۱۔ پہلا کشف الحجاب۔ اللہ تعالیٰ کی معرفت کے بارے میں	236

معرفت الٰہی کی ضرورت	235
معرفت کی قسمیں	236
معرفت کے حصول میں عقل کا مقام	236
معرفت کے بارے میں مشائخؒ کے اقوال	239
۲۔ دوسرا کشف الحجاب توحید کے بارے میں	241
توحید کی اہمیت	241
توحید کی قسمیں	242
توحید کے معنی	243
توحید کے بارے میں مشائخؒ کے اقوال	244
۳۔ تیسرا کشف الحجاب ایمان کے بارے میں	246
ایمان کی اہمیت	246
ایمان کے معنی	247
کیا ایمان کے لیے اطاعت شرط ہے؟	247
قول فیصل	247
۴۔ چوتھا کشف الحجاب طہارت کے بارے میں	250
طہارت کی اہمیت	250
طہارت کی قسمیں	250
ظاہری طہارت	252
طہارت کے بارے میں شک اور وسوسے کی صورت میں طرز عمل	252
باطنی طہارت	253
باطنی طہارت میں آدابِ شریعت کی اہمیت	254
باطنی طہارت توبہ اور اس کے متعلقات	256

توبہ کی اہمیت	256
توبہ کی شرطیں	256
توبہ کرنے والوں کی قسمیں	257
کئی گناہوں میں مبتلا شخص کی توبہ	258
توبہ ٹوٹنے کا اندیشہ	258
۵۔ پانچواں کشف الحجاب نماز کے بارے میں	260
نماز کی اہمیت	260
نماز کے معنی	260
نماز کی شرطیں اور طریقہ	261
حضور نبی کریم اور بزرگان دین کی نماز	262
نماز کی حقیقت	263
کیا آدمی نماز کی پابندی سے آزاد ہو سکتا ہے؟	265
فرض اور نفل نمازیں	265
ایمان، محبت الٰہی اور نماز	266
۶۔ چھٹا کشف الحجاب: زکوٰۃ کے بارے میں	268
زکوٰۃ کی اہمیت	268
زکوٰۃ کی حقیقت	270
جودوسخاوت	270
زکوٰۃ اور صدقہ سے صدقہ لینا	273
۷۔ ساتواں کشف الحجاب روزے کے بارے میں	274
روزوں کی اہمیت	274
روزوں کا زمانہ	276

روزے کی شرطیں	276
روزے کی حقیقت	277
نبی کریمؐ اور بزرگان دین کا طریقہ	278
انسانوں کی دو قسمیں	280
۸۔ آٹھویں کشف الحجاب حج کے بارے میں	281
حج کی اہمیت	281
حج کی حقیقت	281
بزرگان دین کا حج	284
۹۔ نویں کشف الحجاب صحبت اور اس کے آداب و احکام یعنی معاشرتی زندگی کے بارے میں	285
ادب کے معنی اور آداب کی اہمیت	285
آداب کی قسمیں	286
آداب سیکھنے کی صورت اچھی صحبت	287
صحبت کی اہمیت	287
چھوٹوں کی صحبت	289
احباب کا انتخاب اور ان کی اہمیت	289
صحبت (معاشرت) کے عام آداب	290
باہمی محبت کو بڑھانے والی چیزیں	291
درویشوں کی قسمیں اور ان کے فرائض	294
آداب اقامت یعنی مقیم لوگوں کے آداب	295
سفر کے آداب	297
کھانے کے آداب	299

رفتار (چلنے) کے آداب 302
سونے (نیند) کے آداب 303
سونے کے بارے میں مشائخ کا اختلاف 303
قولِ فیصل 304
سونے کے آداب 305
چپ رہنے اور کلام کرنے کے آداب 305
سکوت اور کلام کے بارے میں مشائخ کا اختلاف 305
قولِ فیصل 307
کلام کے آداب 308
جب کہ بولنا فرض ہو جاتا ہے 309
سوال کے آداب 309
سوال کرنے کے بارے میں اختلاف 309
جن مقاصد کے لیے سوال کرنا جائز ہے 310
قولِ فیصل 312
سوال کرنے کے آداب 313
نکاح کرنے اور مجرد (بلا نکاح) رہنے کے آداب 314
نکاح کے بارے میں خدا اور رسولؐ کے احکام 314
نکاح اور تجرد 315
نکاح اور تجرد کی شرعی حیثیت 316
نکاح کے بارے میں سنت کی پیروی 317
صوفیاء میں تجرد کے فروغ پانے کی وجہ 318
قولِ فیصل 318

نکاح اور تجرد کے آداب 319
نکاح کے آداب 319
مجرد رہنے کے آداب 320
۱۰۔دسواں کشف الحجاب: صوفیوں کی زبان اور اصطلاحات کے بارے میں 321
خاص زبان اور اصطلاحات کی ضرورت 321
''وقت'' اور ''حال'' اور اُن کا فرق 322
وقت 322
حال 323
''مقام'' اور ''تمکین'' 324
مقام 324
تمکین 325
''محاضرہ'' اور ''مکاشفہ'' 326
محاضرہ 326
مکاشفہ 326
''قبض'' اور ''بسط'' 327
''ہیبت'' اور ''انس'' 328
''قہر'' اور ''لطف'' 329
''نفی'' اور ''اثبات'' 330
''مسامرہ'' اور ''محادثہ'' 331
علم الیقین، حق الیقین اور عین الیقین 332
''علم'' اور ''معرفت'' 333
''شریعت'' اور ''حقیقت'' 333

اس سلسلے کی دوسری اصطلاحات 334
''الحق'' 334
''الحقیقۃ'' 334
''الخطرات'' 335
''الوطنات'' 335
''العلایق'' 335
''الوسایط'' 335
''الزوایِد'' 335
''المَلجاء'' اور ''المَنجاء'' 336
''اللوامع'' اور ''الطوالع'' 336
''الطوارق'' 336
''الوارد'' 336
''الانتباہ'' 336
''الاشتباہ'' 337
''القرار'' 337
''الانزعاج'' 337
اصطلاحات جو اہلِ طریقت توحید کے بیان و وضاحت کیلئے استعمال کرتے ہیں 337
''العالَم'' 337
''القدیم'' 338
''المُحدث'' 338
''الازل'' 338
''الاَبَد'' 338

"اَلذّات"	338
"اَلصِفة"	338
"الشیان"	338
"الضِدّان"	339
"الغَیرَان"	339
"الجوہر"	339
"العرض"	339
"الجسم"	339
"السّوال"	339
"الجواب"	339
"الحُسن"	339
"القُبح"	339
"السّفہ"	340
"الظُلم"	340
"اَلعَدل"	340
"اَلمُلک"	340
"الخاطر"	340
"الواقع"	340
دوسری متفرق اہم اصطلاحات جو صوفیا استعمال کرتے ہیں:	341
"الاختیار"	341
"الامتحان"	341
"البلاء"	342

''التجلی''	342
''التحلی''	343
''التخلی''	343
''الشرود''	344
''القصود''	344
''الاصطفاء''	344
''الاصطلام''	344
''الرین''	345
''الغین''	345
''التلبیس''	345
''الشرب''	346
''الذوق''	346
۱۱۔ گیارھواں کشف الحجاب: سماع کے بارے میں	347
سماع کی حقیقت اور اہمیت	347
سماع کی اقسام	348
جن چیزوں کا سماع فرض ہے	348
سماع قرآن مجید کے اثر کے چند واقعات	350
نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر اثر	350
حضرت عمرؓ پر اثر	351
حضرت عبداللہ بن حنظلہؓ پر اثر	351
حضرت زرارہؓ بن ابی اوفی پر اثر	351
حضرت ابوبکر شبلیؒ پر اثر	351

شیخ ابوالعباس اشقانی" پر اثر	352
شیخ ابوالعباس عطار" پر اثر	352
ایک نیک بخت خاتون کا واقعہ	353
جنوں پر قرآن مجید کا اثر	354
قران مجید کا کفار پر اثر	354
دوسری چیزوں کے سماع کے بارے میں	356
خوش آوازی کے اثر کی چند مثالیں	356
قرآن مجید کو خوش الحانی سے پڑھنے کا حکم	358
شعر کے سماع کے بارے میں	358
گانا اور راگ سننے کے بارے میں	360
راگ اور گانے کے بارے میں صوفیاء کی آراء	361
صاحب کشف المحجوب کی اپنی رائے	361
حضرت ذوالنون مصری" کی رائے	362
حضرت ابوبکر شبلی" کی رائے	362
حضرت ابوعلی رودباری" کی رائے	362
حضرت جنید بغدادی" کی رائے	363
محتاط صوفیاء رحمہم اللہ کا مسلک	363
"وجد" کے بارے میں	364
"رقص" کے بارے میں	364
کپڑے پھاڑنے کے بارے میں	365
سماع کے آداب	365

☆☆☆☆☆

بسم اللہ الرحمن الرحیم

عرض ناشر

حضرت علی ہجویریؒ اُن معروف بزرگانِ دین میں سے ہیں جن سے اس ملک کی کثیر آبادی گہری عقیدت رکھتی ہے۔

آپ کی مشہور و معروف تالیف کشف المحجوب، علمِ تصوف پر ایک مستند کتاب مانی جاتی ہے۔ لیکن اس کی زبان فارسی اور اس کے اردو تراجم ناقص ہونے کی وجہ سے عام اردو دان حضرات اس سے بہت کم مستفیض ہو سکتے تھے۔ اس بلند پایہ کتاب کو میاں طفیل محمد (سابق امیر جماعت اسلامی پاکستان) نے اپنی نظر بندی (اکتوبر ۱۹۶۱ء تا جون ۱۹۶۲ء) کے دوران منٹگمری (حال ساہیوال) جیل میں اردو کا ایسا جامہ پہنا دیا ہے کہ اب اس سے ہر اُردو دان حسب استعداد انشاء اللہ پوری طرح فیض یاب ہو سکے گا۔

یہ جبری نظر بندی دوسرے پہلوؤں سے کتنی ہی قابل افسوس کیوں نہ ہو لیکن اس کا یہ پہلو بڑا خوشگوار ہے کہ اس کے نتیجہ میں میاں صاحب موصوف کو اتنی فرصت میسر آ گئی کہ اپنی علمی کاوش کو صفحۂ قرطاس پر پیش کر سکیں۔ ورنہ جو لوگ میاں صاحب سے واقف ہیں وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ موصوف اپنی ذمہ داریوں میں اتنے زیادہ منہمک رہتے ہیں کہ ایسی علمی خدمت کے لیے کوئی وقت نکال ہی نہیں سکتے۔

یہ بھی ایک تاریخی حقیقت ہے کہ بسا اوقات اہم دینی اور علمی شخصیتوں کی بلند پایہ تصانیف جبر واستبداد کے عطا کردہ جیل کے گوشۂ تنہائی ہی میں پایۂ تکمیل کو پہنچی ہیں۔ ایسے ہی اوقاتِ فرصت میاں طفیل محمد صاحب کی اس علمی کاوش کو پیش کرنے کا سبب ہے۔

یوں تو اس کتاب کے اردو میں بہت سے ترجمے ہیں، لیکن اس ترجمہ کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کو رَواں دَواں شگفتہ انداز اور جدید اسلوب میں ضروری حوالوں سے مزیّن کر کے پیش کیا گیا ہے، جس کو اعلیٰ کتابت وطباعت کے ساتھ ہم پیش کر رہے ہیں۔

جو حضرات تزکیۂ نفس اور اصلاح وتربیت کے لیے کسی بلند پایہ تالیف کے خواہاں تھے ان کے لیے یہ کتاب ایک گراں مایہ خزینۂ علم اور ان کی علمی وعملی پیاس کی تسکین کے لیے بڑی حد تک مفید ومعاون ثابت ہوگی۔

ہمیں امید ہے کہ قارئین ہماری اس پیش کش کو بھی اُسی گرمجوشی سے قبول فرمائیں گے جس کا مظاہرہ ہماری دیگر مطبوعات کے لیے ہوتا رہا ہے۔

نیاز مند

لاہور — منیجنگ ڈائریکٹر

شعبان — اسلامک پبلی کیشنز (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مطابق نومبر ۱۹۶۷ء — ۳۔ کورٹ سٹریٹ، لوئر مال لاہور

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دیباچہ طبع اوّل

انگریز کے یہ دو اقدام کہ اس ملک کی عام آبادی کا ذریعہ تعلیم تو انگریزی ہو اور مقامی فوجیوں میں سے جو انگریزی نہ پڑھ سکیں ان کی تعلیم کے لیے ان کی اپنی زبان کو رومن رسم الخط کے لباس میں استعمال کیا جائے، اس قوم کی استعماری ذہانت کے دو ایسے شاہکار ہیں اور ان کے نتائج واثرات اس قدر دُور رس ہیں کہ ان کی طرف بہت کم لوگوں نے توجہ کی ہے۔ اوّل الذکر اقدام کے ذریعہ سے ہماری نئی تعلیم یافتہ نسلوں کو اپنے پورے پورے علمی ورثہ، اپنی شاندار تاریخ، اپنی تہذیب وکلچر اور اپنی بیشتر ملی روایات ہی سے نہیں، اپنے نامور اسلاف اور ان کے آنکھوں کو خیرہ کر دینے والے درخشاں ترین کارناموں تک سے اس درجہ نابلد اور اہلِ یورپ سے اس قدر مانوس کر دیا گیا کہ ہماری یہ نسلیں یورپ اور انگلستان کے تو بھانڈوں، گویّوں اور مداریوں کو بھی تہذیب وترقی کے واجب الاتباع نمونے سمجھنے لگے ہیں، لیکن اپنی ملت کے مجدد الف ثانیؒ، شاہ ولی اللہؒ اور سید علی ہجویریؒ جیسے اولیائے کبار کے نام سے بھی واقف نہ ہوئیں[1]۔ انھیں یورپ اور امریکہ میں بسنے والی ان قوموں کی تو ساری تاریخ شاندار اور قابل فخر کارناموں سے مزین دکھائی دینے لگی جو اپنے محکوم ملکوں کے کاریگروں کے ہاتھ اس 'جرم' میں کٹوا دیتے کہ وہ ان کے کاریگروں سے اچھی مصنوعات کیوں تیار کرتے ہیں، اور آج بھی جن کی روشن خیالی کا یہ عالم ہے کہ آئے دن اپنے زیر نگیں کمزور لوگوں کے گلے محض اس 'قصور' میں کاٹتے رہتے ہیں کہ ان کا رنگ، زبان، نسل یا مسلک ومذہب ان سے مختلف ہے۔ لیکن ہمارے ان نونہالوں کو اپنی اُس ملت کی پوری تاریخ میں کوئی قابل ذکر چیز بھی نظر نہیں آتی جو اپنے انحطاط کے دور میں بھی ایسے ایسے 'بادشاہ' پیدا کرتی چلی گئی

---

[1] بلکہ میں نے اپنی یونیورسٹیوں میں زیر تعلیم لوگوں میں سے ایسے بھی پائے ہیں جو نہیں جانتے کہ ابوبکرؓ اور عمرؓ کون تھے اور کلمہ توحید کیا ہوتا ہے؟

جنھوں نے مطلق العنانی کے تخت پر بیٹھ کر دوسری قوموں کے راہبوں اور درویشوں کو مات کر دیا، جس نے صرف اہلیت اور قابلیت کی بنا پر غلاموں کو اٹھا کر تختِ سلطنت پر لا بٹھایا اور جس کے کسی فرد سے اگر کوئی ٹھگ اپاہج کا بہروپ بھر کر اس کا جان سے عزیز گھوڑا لے اڑا تو اسے اپنے گھوڑے کی نہیں اس بات کی فکر لاحق ہوئی کہ کہیں فریب کاری کی اس واردات کی خبر پھیلنے سے لوگ اپاہجوں کی مدد سے گریز نہ شروع کر دیں۔ اس لیے اس نے اس مکار سے التجا کی تو اس بات کی کہ بندۂ خدا! گھوڑا بیشک لے جا، لیکن خدارا کسی کو یہ نہ بتائیوں کہ تم نے اسے حاصل کیسے کیا۔

انگریز کے دوسرے اقدام کا نتیجہ یہ ہوا کہ مقامی افواج کی عظیم اکثریت اس لحاظ سے تو خوب ہموار اور تعلیم یافتہ ہوگئی کہ اپنے ہر حکمران کی ہر لڑائی بلا جھجک لڑدے اور اس کے پسندیدہ ہر فکر و خیال کو شرح صدر کے ساتھ اپنا جز وایمان بنانے کے لیے ہمہ تن تیار رہے۔ لیکن جہاں تک اپنی ملکی، قومی، ملی اور دینی ضروریات کے لیے تعلیمیافتہ ہونے کا تعلق ہے، ان کے بارے میں وہ ویسی ہی اَن پڑھ رہی، جیسا کہ ملک کا کوئی دوسرا اَن پڑھ آدمی بے پڑھا ہو سکتا تھا۔ بلکہ عام لوگوں سے الگ تھلگ چھاؤنیوں میں رہنے کی وجہ سے ایک عام اَن پڑھ آدمی سے بھی کچھ بڑھ کر ہی اَن پڑھ اور بے خبر۔

اس ماحول اور نظامِ تعلیم میں ریاضی، طبعیات اور قانون کی تعلیم و تربیت پانیوالے ایک شخص کی حیثیت سے اگر میں آپ کو یہ بتاؤں کہ مجھے بھی جماعت اسلامی میں آ کر ہی یہ معلوم ہوا کہ مجدد الف ثانیؒ ، شاہ ولی اللہؒ، سید احمد شہیدؒ اور شاہ اسمٰعیل شہیدؒ نام کے کوئی بزرگ ہمارے ملک اور قوم میں ہو گزرے ہیں، تو آپ کو کوئی تعجب نہ ہونا چاہیے۔ البتہ سید علی ہجویریؒ کا معروف نام داتا گنج بخشؒ اس وجہ سے سن رکھا تھا کہ ان کا مزار گورنمنٹ کالج اور لا کالج لاہور سے جہاں میں نے چار سال گزارے، بالکل قریب واقع ہے۔ لیکن ان کے متعلق بھی بس یہ تصور تھا کہ یہ صاحب ان صوفیائے کرام سے شاید کچھ بہتر ہوں گے جو شریعت کے ابتدائی فرائض تک سے بے نیاز قبروں پر بیٹھے ''حق، ھُو'' کے نعرے مارتے اور جاہل عوام و خواص میں بیٹوں اور دنیوی ترقیوں کے پروانے بانٹتے رہتے ہیں۔

۱۹۴۸ء سے ۱۹۵۰ء تک مجھے مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ اور مولانا امین احسن اصلاحی صاحب کے ساتھ نیو سنٹرل جیل ملتان میں رہنے کی سعادت نصیب ہوئی اور میں نے ان سے قرآن مجید اور شاہ ولی اللہؒ کی مصفّٰی و مسوّٰی (موطا امام مالکؒ کی فارسی اور عربی شرحیں) پڑھیں[1] اور پھر ۱۹۵۳ء تا ۱۹۵۴ء تحریک ختم نبوت کے زمانے کی نظر بندی کے دوران سنٹرل جیل لاہور میں مولانا امین احسن اصلاحی صاحب سے شاہ ولی اللہؒ کی کتاب 'حجۃ اللہ البالغہ' پڑھی، اور کچھ دوسری دینی کتب کا مطالعہ کیا تو مجھے اندازہ ہوا کہ ہمارے ہاں ہر شعبہ زندگی میں کیسے کیسے نامور بزرگ کس کثیر تعداد میں ہو گزرے ہیں جن کی خاک پا کو بھی اس دور کے ممدوحین میں سے کوئی نہیں پہنچ سکتا۔ چنانچہ دل میں یہ تمنا پیدا ہوئی کہ اگر اللہ موقع اور قابلیت عطا فرمائے تو کم از کم شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ ہی کی چند کتابوں کو جدید انداز اور اردو زبان میں مرتب کر کے لوگوں کے سامنے لایا جائے۔

قرآن مجید اور حدیث شریف کی تعلیمات سے اس بلا واسطہ واقفیت کے بعد اب یہ آرزو تھی کہ علم حقیقت و طریقت کے بارے میں بھی بلا واسطہ اور مستند معلومات حاصل کی جائیں تا کہ دین کے سارے پہلوؤں سے براہ راست واقفیت حاصل ہو جائے۔ اس میں شک نہیں کہ تصوف و طریقت سے جس قدر واقفیت کی عام طور پر ضرورت ہے وہ مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودیؒ صاحب کی تصانیف سے کماحقہ حاصل ہو جاتی ہے اور آدمی اس بات کو بخوبی جان لیتا ہے کہ تصوف و طریقت کا اصل مقصود اور ان کی روح آدمی کا اپنی زندگی کو نفاق سے کلیۃً پاک کر کے خدا کی بندگی کی راہ کو اخلاص کے ساتھ اختیار کر لینا ہے۔ لیکن میں چاہتا تھا کہ کسی ایسے بزرگ کی تعلیمات بھی دیکھی جائیں جسے سب ہی ''حقیقت و طریقت'' میں علم و عمل کے لحاظ سے سند (اتھارٹی) مانتے ہوں۔ مولانا مودودیؒ صاحب ہی سے سن رکھا تھا کہ اہل طریقت میں حضرت علی ہجویری المعروف داتا گنج بخشؒ ایک صحیح الخیال اور بہت بلند مرتبہ بزرگ تھے، جنھیں اس کوچہ کے بھی لوگ مقتداء مانتے ہیں اور ان کی تصنیف ''کشف المحجوب'' اس فن میں سند کا درجہ رکھتی ہے۔ لیکن اس سے پہلے

[1] قرآن مجید میں میرے اصل استاد مولانا مودودیؒ صاحب تھے اور مصفّٰی اور مسوّٰی میں مولانا اصلاحی صاحب، لیکن جہاں کسی آیت یا حدیث کی ایک سے زائد تعبیریں ممکن ہوتیں یا مجھے کوئی اشکال پیش آتا تو وہاں دونوں حضرات سے استفادہ کرتا۔

مجھے اس کتاب کو دیکھنے یا کسی دوسرے ذریعہ سے حضرت علی ہجویریؒ کی تعلیمات کو جاننے کا کوئی موقع دستیاب نہ ہوا تھا۔ مولانا ابوالحسنات سید محمد احمد قادری مرحوم کی مرض الموت کے زمانے میں مجھے معلوم ہوا کہ انھوں نے ''کشف المحجوب'' کے ترجمہ وتشریح پر مشتمل ایک کتاب تصنیف فرمائی ہے۔ مجھے ویسے بھی مولانا مرحوم سے دلی انس تھا اور وہ بھی ہمیشہ بہت شفقت سے پیش آئے تھے۔ اس لیے یہ سن کر کہ انھوں نے ایسی کتاب تیار فرمائی ہے، مجھے اس بات کا شوق ہوا کہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ صاحب کی تصانیف کے ساتھ ساتھ حضرت سید علی ہجویریؒ کی تعلیمات پر مشتمل مولانا ابوالحسنات سید محمد احمد قادری کی تیار کردہ یہ کتاب شائع کرنے کی سعادت بھی اسلامک پبلیکیشنز[1] لمٹیڈ ہی حاصل کرے۔ لیکن اس خیال سے کہ وہ مروّت میں آ کر کوئی فیصلہ کرنے پر مجبور نہ ہو، میں نے مناسب سمجھا کہ مولانا مرحوم سے اس معاملے میں براہِ راست خود بات کرنے سے پہلے کسی دوسرے ذریعہ سے ان کا عندیہ معلوم کیا جائے۔ اس کام کے لیے میں نے اپنے کرم فرما مولانا مفتی محمد حسین نعیمی صاحب خطیب جامع مسجد دالگراں لاہور کو موزوں ذریعہ سمجھ کر ان سے درخواست کی کہ وہ مولانا سے اس سلسلے میں ذکر کریں۔ مگر بات یہیں تک پہنچی تھی کہ مولانا ابوالحسنات صاحب کا انتقال ہو گیا اور معاملہ آگے نہ بڑھ سکتا۔

''کشف المحجوب'' کی طرف سفر میں ابھی میں اسی مقام پر تھا کہ حکومتِ مغربی پاکستان کو کسی طرح اس بات کا ''اطمینان حاصل ہو گیا کہ میں ایک سابق سیاسی جماعت کی سرگرمیوں سے اپنے آپ کو وابستہ کر کے اور وقتاً فوقتاً حکومت کی پالیسیوں پر معاندانہ تنقید کر کے مغربی پاکستان کے امن وامان کو خطرے میں ڈال رہا ہوں؛'' اور اس وجہ سے جیل سے باہر میری موجودگی مغربی پاکستان کے لیے خطرے کا موجب ہے۔ اس لیے مجھے (سردست' چھ ماہ کے[2] لیے جیل میں بند رہنا چاہیے۔ چنانچہ ۱۰ اکتوبر ۱۹۶۱ء کو والد صاحب کو پراسٹیٹ کے اپریشن کے لیے میو ہسپتال میں داخل کرا کے نماز ظہر کے بعد شاہ عالم مارکیٹ لاہور کی مسجد سے نکلا ہی تھا کہ مجھے گرفتار کرے

---

[1] ان دنوں میں اس کمپنی کا منیجنگ ڈائریکٹر تھا اور دینی کتب کی طباعت واشاعت کا کام کر رہا تھا (طفیل محمد)

[2] ۳۰ مارچ ۱۹۶۲ء کو اس میعاد میں مزید چھ ماہ کی توسیع کا حکم آ گیا کہ یہ میعاد ۱۹ اکتوبر ۱۹۶۱ء تک بڑھا دی گئی ہے۔

ڈسٹرکٹ جیل لاہور پہنچا دیا گیا۔ اور پھر ۲۶۔ اکتوبر کو وہاں سے سنٹرل جیل منٹگمری میں منتقل کر دیا گیا۔

میری اس نظر بندی میں کارپردازانِ حکومت کے پیشِ نظر جو چیز بھی ہو وہ تو اب ان کے اور خداوند تعالیٰ کے درمیان معاملہ ہے۔ لیکن میرے حق میں میرا لاہور سے پکڑ کر سنٹرل جیل منٹگمری (حال ساہیوال) پہنچایا جانا سلمانؓ کو فارس سے پکڑ کر مدینہ پہنچانے کے مترادف ثابت ہوا۔ یعنی ہوا یہ کہ جب جیل کی لائبریری کی کتابوں کی فہرست میرے سامنے لائی گئی، تو اس میں ''کشف المحجوب'' بھی شامل تھی۔ میں نے اسے نکلوا کر پڑھنا شروع کیا۔ چند ہی صفحات پڑھنے کے بعد یہ بات میرے دل و دماغ پر مسلط ہو گئی کہ جیسے کچھ بھی مجھ سے ہو سکے مجھے اس کتاب کو دوسرے بندگانِ خدا تک پہنچانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اپنی انفرادی زندگی کو اسلام کے مطلوب معیار انسانیت کے مطابق ڈھالنے کے لیے آدمی کے سامنے جن باتوں کو آنا چاہیے وہ تقریباً سب کی سب اور اجتماعی زندگی سے سدھار اور اصلاح کے لیے جن باتوں کی ضرورت ہے ان میں سے بھی بہت سی اس کتاب میں قرآن مجید، حدیث شریف اور صحابہ کرامؓ، ائمہ دین اور دوسرے نامور بزرگوں کے اقوال کی مدد سے اس مؤثر طریق سے بیان کر دی گئی ہے کہ اگر اس کتاب کو عام لوگوں کے لیے قابل فہم بنا دیا جائے تو آدمی کی کایا پلٹ دینے والی کتابوں میں سے یہ ایک نادر کتاب ہے۔ اسی جذبہ کے تحت میں نے زبان و قلم پر اپنی عدم قدرت کے احساس اور اپنی دوسری بہت سی کمیوں کو جاننے کے باوجود اللہ کا نام لے کر اس کام کو شروع کر دیا۔ اور میری اس کوشش کا نتیجہ آپ کے سامنے ہے۔ خدا کرے کہ اس سے اس کے بندوں کو وہ فائدہ حاصل ہو جس کے لیے میں نے یہ کام کیا ہے۔

میں نے پوری کوشش کی ہے کہ مصنف بزرگوارؒ کی استفادۂ عام کی کوئی بات رہ نہ جائے اور نہ کوئی بات اپنے اصل مفہوم سے سرِ مُو ہٹنے پائے۔ البتہ خاص فلسفیانہ بحثوں اور مسائل کی صوفیانہ توجیہات کو میں نے چھوڑ دیا ہے اور ان چیزوں کو بھی چھوڑ دیا ہے جو پرانے اسلوب نگارش کا حصہ تو ہیں، لیکن اصل مضمون اور مقصود بیان سے ان کا کوئی خاص تعلق نہیں۔ ان کے بجائے تین چیزوں کا میں نے اضافہ کیا ہے۔ ایک یہ کہ ان آیات اور حتی الامکان احادیث کے بھی حوالے دے دیے ہیں

جن کو حضرت علی ہجویریؒ نے اپنی بات کے ثبوت اور وضاحت میں پیش فرمایا ہے[1] دوسرے جہاں مجھے ان آیات و احادیث اور اقوال کے علاوہ اسی مضمون کی کوئی اور آیت، حدیث یا قول ملے ہیں تو انھیں بھی میں نے شامل کر دیا ہے تا کہ اصل مضمون زیادہ سے زیادہ خوبی اور مضبوط دلائل کے ساتھ ادا ہو جائے۔ تیسرے میں نے مصنف رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کے مختصر حالات کا اضافہ کر دیا ہے تا کہ ان کی شخصیت اور کوائف سے بھی قاری کو واقفیت ہو جائے۔

اس کام میں میرے سامنے ملک دین محمد اینڈ سنز لاہور کا شائع کردہ مولانا مولوی محمد حسین صاحب گوندانوالہ ضلع شیخوپورہ کا اردو ترجمہ کشف المحجوب رہا ہے کہ وہی جیل کی لائبریری میں موجود تھا۔ لیکن ترجمہ کے اسلوب سے اندازہ ہوتا ہے کہ فاضل مترجم نے محنت اور احتیاط سے ترجمہ کیا ہے اور ناشر نے بھی کافی حد تک صحت کے ساتھ چھاپنے کا اہتمام کیا ہے۔ اس کے لیے مترجم اور ناشر دونوں شکریہ کے مستحق ہیں اور میں ان دونوں کا شکر گزار ہوں۔

آخر میں ایک گزارش میں محکمہ اوقاف کے ذمہ دار حضرات کی خدمت میں بھی پیش کرنا چاہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ ہمارے مقاماتِ عبرت کی تزئین و آرائش پر ہی ساری توجہ مرتکز کر دینے کے بجائے اس کا کچھ حصہ وہاں پر مدفون بزرگوں کی تعلیمات اور اس مشن کو عام کرنے اور فروغ دینے پر بھی صرف کرنا چاہیے جن کے فروغ و اشاعت کے لیے ان بزرگوں نے اپنی جانیں کھپا دیں۔ یہ ان مرحومین کے لیے بھی اور ملک و ملت کے لیے بھی اس تزئین و آرائش سے کہیں بڑھ کر مفید ہو گا۔ ورنہ اس بات کا سخت اندیشہ ہے کہ یہ عبرت گاہیں افیون، چرس اور بردہ فروشی کے اڈوں سے بدل کر آئندہ صرف سیر و تفریح کی جگہیں بن کر نہ رہ جائیں۔

طفیل محمد

(سیکیورٹی وارڈ، سنٹرل جیل، منٹگمری)

۲۵ مئی ۱۹۶۲ء[2] ۶:۳/۴ بجے شام

---

[1] افسوس ہے کہ اپنے اس ارادے کو میں کماحقہٗ پورا نہیں کر سکا۔ اس لیے کہ جیل میں ایسا کرنے کے لیے میرے پاس ذرائع نہیں تھے اور باہر آنے کے بعد اس کے لیے فرصت نہ پا سکا۔ اس لیے یہ کام بڑی حد تک تشنۂ تکمیل رہا ہے۔ [2] حاشیہ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیے۔

دیباچہ طبع دوم

جیسا کہ دیباچہ طبع اوّل اور عرض ناشر سے ظاہر ہے ''کشف المحجوب'' کی یہ ترتیب و تلخیص اکتوبر ۱۹۶۲ء سے قبل مکمل کر کے طباعت کے لیے دے دی گئی تھی۔ لیکن اشاعت کے سلسلے کی بعض مشکلات کی وجہ سے یہ مئی جون ۱۹۶۶ء سے پہلے شائع نہ ہو سکی۔ اب اسے دوسری بار طباعت کے لیے دینے سے پہلے میں نے اپنی حد تک پھر کوشش کی ہے کہ ''کشف المحجوب'' جیسی بلند پایہ تصنیف کی اس ترجمانی کو ہر اعتبار سے معیاری بنانے کی سعی کی جائے۔ چنانچہ اس کی زبان اور اسلوب بیان کو پہلے سے بہتر اور زیادہ رواں بنا دیا گیا ہے، قرآن و حدیث کے حوالوں میں اضافہ کر دیا گیا ہے اور جہاں جہاں عبارت اور طرز بیان میں ابہام رہ گیا تھا اسے بھی اور بعض مقامات پر مشائخ و صوفیاء رحمہم اللہ کے بعض اقوال پر کچھ حضرات نے جو اعتراضات و اشکالات میرے پاس بھیجے تھے کہ یہ سنت کے خلاف پڑتے ہیں اُن سب کو بھی میں نے اسلوب بیان میں تبدیلی یا حاشیوں کی مدد سے رفع کر دیا ہے۔

امید ہے کہ انشاء اللہ اب یہ کتاب اپنے موضوع اور مقصد دونوں کے لحاظ سے پہلے کی نسبت زیادہ واضح، مفید تر اور خود کافی ثابت ہوگی۔

طفیل محمد

۵۔ اے ذیلدار پارک، اچھرہ ۱۸ جمادی الثانی ۱۳۸۷ھ

لاہور ۲۳ ستمبر ۱۹۶۷ء

☆☆☆

(حاشیہ گزشتہ صفحہ) ۲۵ مئی ۶۲ء کو ٹھیک پونے سات بجے شام ۲۵ مئی کے الفاظ تحریر کر چکا تھا اور ان کے بعد ۱۹۶۲ء لکھنے والا تھا کہ ملک مقبول احمد صاحب اسسٹنٹ انچارج سیکیورٹی وارڈ برآمدہ میں داخل ہوئے اور انھوں نے اطلاع دی کہ سامان تیار کر لیجیے، صبح ۷ بجے تمھیں ہائی کورٹ میں پیشی کے لیے لاہور جانا ہے۔ لاہور پہنچنے کے بعد ہائی کورٹ میں ہیبئس کارپس کی درخواست چل رہی تھی کہ مغربی پاکستان اسمبلی میں میری گرفتاری پر بحث کے نتیجے میں ۲۳ جون ۱۹۶۲ء کو مجھے رہا کر دیا گیا۔ گویا یہ نظر بندی صرف اسی کام کے لیے تھی۔

مصنف کی زندگی کے مختصر حالات

نام ونسب:

آپ کا پورا نام شیخ سید ابوالحسن علی ہجویریؒ ہے۔ لیکن عوام وخواص سب میں ''گنج بخش'' یا ''داتا گنج بخش'' کے نام سے مشہور ہیں۔ آپؒ ۴۰۰ھ ہجری میں غزنی شہر سے متصل ایک بستی ہجویر میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد بزرگوار کا اسم گرامی سید عثمان جلابیؒ ہے۔ جلاب میں بھی غزنی سے متصل ایک دوسری بستی کا نام ہے جہاں سید عثمان رحمۃ اللہ علیہ رہتے تھے۔ حضرت علی ہجویریؒ حضرت زید رحمۃ اللہ علیہ کے واسطے سے حضرت امام حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اولاد سے ہیں[1]۔

آپؒ کے اساتذہ:

آپؒ کے اساتذہ میں حضرت شیخ ابوالعباس اشقانیؒ، شیخ ابوجعفر محمد بن المصباح الصیدلانیؒ، شیخ ابوالقاسم عبدالکریم بن ہوازن القشیریؒ، شیخ ابوالقاسم بن علی بن عبداللہ الگرگانیؒ، ابوعبداللہ محمد بن علی المعروف داستانی بسطانیؒ، ابوسعید فضل اللہ بن محمد مہینیؒ اور ابواحمد مظفر بن احمد بن حمدانؒ کے نام ملتے ہیں۔

شیخ ابوالعباس اشقانی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں حضرت علی ہجویری بیان کرتے ہیں کہ آپ علم اصول اور فروع میں امام اور اور اہل تصوّف میں اعلیٰ پایہ کے بزرگ تھے۔ مجھے آپ سے بڑی محبت تھی اور آپ بھی مجھ پر سچی شفقت فرماتے تھے۔ جب سے میں نے ہوش سنبھالا ہے آپ کے مانند کوئی آدمی نہیں دیکھا۔ نہ آپ سے بڑھ کر شریعت کی تعلیم کرنے والا کوئی دیکھا۔ اکثر فرمایا کرتے: اَشْتَهِيْ عَدَمًا لَا وَجُوْدَلَهٗ۔ یعنی میں ایسی نیستی چاہتا ہوں جس کا کوئی وجود نہ ہو۔ یہ وہی بات ہے جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمائی۔ آپ نے ایک مرتبہ ایک تنکا اٹھایا اور فرمایا: ''اے کاش میری ماں نے مجھے نہ جنا ہوتا۔ اے کاش میں یہ تنکا ہوتا''۔ ایک دفعہ میں شیخ اشقانیؒ

---

[1] مفصل شجرہ نسب وشجرہ طریقت صفحہ نمبر 41 پر ملاحظہ کریں۔

کے پاس آیا تو آپ پڑھ رہے تھے: ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلاً عَبْدًا مَّمْلُوْكًا لَّا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْئٍ (۱۶:۷۵) یعنی ''اللہ ایک مثال دیتا ہے، ایک غلام ہے جو دوسرے کا مملوک ہے اور کسی چیز کا اختیار نہیں رکھتا۔'' بار بار اسے پڑھ رہے تھے اور رو رہے تھے، حتیٰ کہ بے ہوش ہو گئے اور میں نے سمجھا کہ دنیا سے رخصت ہو گئے۔ میں نے عرض کیا: ''اے شیخ! یہ کیا حالت ہے؟ فرمایا کہ گیارہ سال ہو گئے ہیں میرا ورد یہی ہے اس سے آگے نہیں گزر سکا۔

شیخ ابوجعفر محمد بن المصابح الصیدلانی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں فرماتے ہیں کہ آپ صوفیائے متاخرین میں منجملہ رؤسائے متصوفین میں سے تھے، علم حقیقت میں بہت فصیح البیان تھے۔ حسین بن منصور کے طریقہ کی طرف مائل تھے۔ آپ کی بعض تصانیف میں نے ان سے پڑھی ہیں۔

شیخ ابوالقاسم بن عبداللہ الکرگانیؒ کے متعلق لکھتے ہیں کہ اپنے وقت میں بے نظیر تھے۔ وقت کے تمام طالبانِ حق کا آپ پر اعتماد تھا۔ علوم وفنون میں بہت ماہر تھے۔ آپ کا ہر مرید زیور علم سے آراستہ تھا۔ مجھ سے بہت احترام سے پیش آتے تھے اور بہت توجہ سے بات سنتے تھے، حالانکہ میں آپ کے مقابلہ میں نوعمر بچہ تھا۔ ایک روز میں آپ کی خدمت میں بیٹھا تھا کہ میرے دل میں یہ خیال آیا کہ آپ مجھ سے اس قدر عاجزی اور انکساری سے پیش آتے ہیں۔ بغیر اس کے کہ میں کوئی بات کہوں، آپ نے فرمایا: اے میرے باپ کے دوست! خوب جان لے کہ میری عاجزی اور انکساری تیرے لیے نہیں، میری یہ عاجزی احوال کے بدلنے والے کے لیے ہے اور یہ تمام طالبانِ حق کے لیے عام ہے۔ یاد رکھ کہ آدمی خیالات کی قید سے کبھی بھی رہائی حاصل نہیں کر سکتا۔ اس کے لیے بندگی کرنا لازمی ہے۔ خدا کے ساتھ بندگی کی نسبت سے کام رکھ۔ اس ایک نسبت کے سوا دوسری تمام نسبتوں کو اپنے سے دُور کر دے۔ آپ کی کتابیں مشکل ہیں۔

شیخ ابوالقاسم عبدالکریم بن ہوازن القشیری رحمۃ اللہ علیہ کے حالات میں تحریر فرماتے ہیں کہ اپنے زمانہ میں نادر الوجود اور بلند مرتبہ بزرگ تھے۔ ہر فن میں آپ کی تصانیف محققانہ اور عمدہ ہیں۔ بے کار بحث وگفتگو اور لغو باتوں سے آپ بالکل الگ رہتے تھے۔ حسین بن منصور کے

بارے میں صوفیاء میں بحثیں ہوتیں۔ ایک گروہ کے نزدیک وہ مردود اور دوسرے کے نزدیک مقبول بارگاہ تھے۔ آپ فرماتے کہ اگر منصور ارباب معانی وحقیقت میں سے تھا تو کوئی چیز اسے خداوند کریم سے علیحدہ نہیں کر سکتی اور اگر خدا کی درگاہ میں مردود تھا تو مخلوق میں سے کوئی اسے بارگاہِ خداوندی میں مقبول نہیں بنا سکتا۔ ہم اسے حوالۂ خدا کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا: مَثَلُ الصُّوفِیْ کَعِلَّةِ الْبَرْسَامِ اَوَّلُهُ هِذْیَانٌ وَّاٰخِرُهُ سُکُوْتٌ فَاِذَا تَمَکَّنَ خَرَسَ. یعنی صوفی کی مثال برسام کے مرض کی ہے کہ اس کا شروع ہذیان (یعنی جو خیال آئے اسے پاگلوں کی طرح بیان کرتے چلے جانا) ہے اور اس کا آخر سکوت ہے اور جب آدمی درجۂ تمکین کو پہنچ جاتا ہے تو گونگا ہو جاتا ہے۔

اپنے استاد ابوعبداللہ بن محمد بن علی المعروف داستانی بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق فرماتے ہیں کہ آپ تمام علوم کے عالم اور درگاہِ حق کے اہل حشمت میں سے تھے۔ بہت نیک خلق تھے۔ آپ کا کلام مہذب اور اشارات لطیف ہیں۔ میں نے ان کی کتاب ''معانی انفاس'' کی چند چیزیں ان سے سنی ہیں۔ شیخ سہلکی بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ بسطام میں ٹڈی دل آیا۔ تمام درخت اور کھیت اس کے بیٹھنے کی وجہ سے سیاہ ہو گئے۔ لوگوں نے بہت شور مچایا۔ شیخ نے پوچھا، یہ لوگ کیا کر رہے ہیں۔ میں نے عرض کیا کہ ٹڈی آئی ہے اور لوگ سخت غمزدہ ہیں۔ شیخ اٹھے اور کوٹھے پر تشریف لے گئے اور منہ آسمان کی طرف کیا۔ اُسی وقت ٹڈی اُڑ گئی اور عصر کی نماز تک ایک ٹڈی بھی کہیں نظر نہ آتی تھی اور کسی کھیتی کا ایک پتہ تک ضائع نہ ہوا۔

ابوسعید فضل اللہ بن محمد مہینی رحمۃ اللہ علیہ کے ذکر میں لکھتے ہیں کہ آپ طریقت کے جمال اور وقت کے صاحبِ دبدبہ بادشاہ تھے اور تمام اہلِ زمانہ آپ کے گرویدہ تھے۔ تعلیم ابتدا میں ابوعلی زاہد رحمۃ اللہ علیہ سے سرخس میں حاصل کی۔ ایک دن میں تین دن کا سبق لیتے اور تین دن اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مشغول رہتے۔ آپ نے مسلسل ریاضت اور مجاہدہ کیا، یہاں تک کہ اللہ نے آپ کو اعلیٰ مرتبہ پر پہنچایا۔ بہت شاہانہ زندگی بسر کرتے تھے۔ شیخ ابومسلم فارسی نے مجھے بتایا کہ میری ان سے ہمیشہ خصومت رہتی تھی۔ ایک دفعہ میں ان کی زیارت کے لیے گیا۔ میری گودڑی بہت میلی

کھیلی تھی۔ آپ کے پاس پہنچا، تو آپ بہت شاہانہ لباس میں تخت پر دراز تھے اور اوپر مصری دیبا کی چادر اوڑھے ہوئے تھے۔ میں نے یہ دیکھ کر دل میں خیال کیا کہ اس ٹھاٹھ کے ساتھ فقر کا دعویٰ بھی عجیب بات ہے۔ مجھے دیکھو میں اس گودڑی میں فقر کا دعویٰ کرتا ہوں۔ لیکن میرے کوئی بات زبان پر لائے بغیر آپ نے فرمایا کہ تم نے یہ باتیں کس دیوان میں لکھی پائی ہیں؟ میں اس پر اپنے دل میں بہت شرمندہ ہوا۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ: اَلتَّصَوُّفُ قِیَامُ الْقَلْبِ مَعَ اللّٰہِ یعنی تصوف تو اللہ سے دل لگانے کا نام ہے۔

ایک دفعہ آپ نیشا پور سے طوس کو جا رہے تھے۔ راستے میں سرد گھاٹی پڑتی ہے۔ آپ اپنے پاؤں میں سردی محسوس کر رہے تھے۔ ساتھ جو درویش تھا وہ بیان کرتا ہے کہ میرے دل میں خیال آیا کہ اپنے رومال کے دو ٹکڑے کر کے آپ کے پاؤں پر لپیٹ دوں۔ لیکن پھر خیال آیا کہ میرا رومال بہت اچھا ہے، اسے ضائع کیوں کروں۔ لیکن میں نے کچھ کہا نہیں۔ طوس پہنچ کر ہم مجلس میں بیٹھے تھے کہ میں نے آپ سے سوال کیا۔ اے شیخ حقانی! الہام اور وسوسہ شیطانی میں فرق کیا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ الہام تو وہ تھا جس نے تیرے دل میں یہ خیال پیدا کیا کہ اپنے رومال کو پھاڑ کر ابوسعید کے پاؤں کے گرد لپیٹ دوں تاکہ اس کے پاؤں کو سردی نہ لگے، اور شیطانی وسوسہ وہ تھا جس نے تجھے ایسا کرنے سے روکا۔

ابواحمد مظفر بن احمد بن حمدان رحمۃ اللہ علیہ کے حالات میں لکھتے ہیں کہ آپ اولیاء کے رئیس اور صوفیوں کے ناصح تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ریاست ہی کی مسند پر آپ پر بھید کھولا اور کرامت کا تاج آپ کے سر پر رکھا۔ میں نے خود آپ سے سنا کہ دوسرے لوگوں نے جو کچھ بیابانوں اور جنگلوں کی منزلیں قطع کر کے پایا مجھے اللہ تعالیٰ نے وہ چیز مسند اور بالانشینی میں عطا فرمائی۔ فنا اور بقاء میں آپ کا کلام بہت اچھا ہے۔ میں ایک روز کرمان سے آپ کے پاس آیا۔ میرے کپڑے راستے کی گرد سے اَٹے ہوئے تھے۔ آپ نے مجھ سے کہا، کہو ابوالحسن کیا ارادہ ہے؟ میں نے کہا کہ میرا دل سماع کو چاہتا ہے۔ آپ نے اسی وقت انتظام کر دیا اور قوالوں کو بلایا۔ لڑکپن کا زمانہ تھا۔ پہلے ہی کلمات کے سماع سے بے قرار ہو گیا۔ کچھ وقفہ کے بعد جب میرا غلبہ اور جوش کچھ کم ہوا تو پوچھا، کہو، اس سماع سے کیا گزری؟ میں نے عرض کیا۔ اے شیخ! میں بہت خوش ہوا ہوں۔ فرمایا کہ ایک وقت تجھ

پر ایسا آئے گا کہ یہ سماع اور کوے کی آواز تیرے لیے یکساں ہو جائے گی۔ سماع میں قوت اسی وقت تک ہے جب تک مشاہدہ نہیں حاصل ہوتا۔ دیکھو، کہیں اس کی عادت نہ کر لینا کہ تیری طبیعت کا جز بن جائے۔ اگر ایسا ہوا تو تُو یہیں رہ جائے گا۔

تعلیم طریقت:

طریقت میں آپ کے شیخ شیخ ابوالفضل محمد بن حسن ختلی رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ ان کے حالات قلمبند کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ طریقت میں میری اقتداء آپؒ ہی کے ساتھ ہے۔ تفسیر، حدیث اور تصوف تینوں کے آپ عالم تھے۔ تصوف میں آپ حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب پر تھے۔ حضرت شیخ حضریؒ کے مرید اور حضرت سروانیؒ کے مصاحب تھے۔ ساٹھ سال تک مخلوق سے گم اور پہاڑوں میں گوشہ نشین رہے۔ زیادہ تر قیام جبلِ لگام پر رہتا تھا۔ میں نے آپ سے زیادہ بارعب اور صاحب ہیبت کوئی شخص نہیں دیکھا۔ صوفیوں کے لباس سے ہمیشہ کنارہ کش رہے۔ ایک مرتبہ میں آپ کو وضو کرانے کے لیے آپ کے ہاتھوں پر پانی ڈال رہا تھا کہ میرے دل میں خیال آیا کہ میں ایک آزاد آدمی ہوں، آخر میں ان پیروں کی کیوں غلامی کروں جو قسمت میں لکھا ہے وہ پورا ہو گا۔ آپ نے فرمایا، بیٹا جو خیال تیرے دل میں پیدا ہوا ہے، میں اسے جانتا ہوں۔ ہر کام کا ایک سبب اور ذریعہ ہوتا ہے۔ یہ خدمت اور ملازمت آدمی کی بزرگی کا سبب بن جاتی ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ حق تعالیٰ چاہتا ہے تو ایک سپاہی زادے کو تاجِ شاہی پہنا دیتا ہے۔

جس روز آپ کی وفات ہوئی تو آپ بانیاں اور دمشق کے درمیان پہاڑ پر واقع ایک گاؤں بیت الجن میں تھے اور آپ کا سر میری گود میں تھا۔ میرا دل سخت مضطرب اور تکلیف میں تھا جیسے کہ ایسے محسن اور دوست کی علیحدگی کے خیال سے ہونا ہی چاہیے تھا۔ آپؒ نے فرمایا، بیٹا! میں اعتقاد کا مسئلہ بیان کرتا ہوں۔ اگر تو اپنے آپ کو اس کے مطابق درست کر لے گا تو تیرے دل کی یہ تمام تکلیف دُور ہو جائے گی۔ یہ بات یاد رکھ کہ اللہ عزوجل کوئی کام الل ٹپ نہیں کرتا، وہ تمام حالات کو ان کے نیک و بد کا لحاظ رکھ کر پیدا فرماتا ہے۔ تیرے لیے لازم ہے کہ خدا کے فعل میں اس سے

جھگڑا نہ کر اور جو کچھ وہ کرتا ہے اس پر رنجیدہ نہ ہو۔ آپ نے ابھی اتنی بات فرمائی تھی کہ اپنی جان خداوند کریم کے سپرد کر دی۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن۔

کسب روحانی کے لیے آپ (حضرت علی ہجویریؒ) نے شام، عراق، فارس، قہستان، آذربائیجان، طبرستان، خوزستان، کرمان، خراسان، ماوراء النہر اور ترکستان وغیرہ کا سفر کیا۔ ان ممالک میں بے شمار لوگوں سے ملے اور ان کی صحبتوں سے فیض حاصل کیا۔ صرف خراسان میں جن مشائخ سے آپ ملے ان کی تعداد تین سو ہے۔ ان کے بارے میں فرماتے ہیں کہ میں نے خراسان میں تین سو اشخاص ایسے دیکھے ہیں کہ ان میں سے صرف ایک سارے جہان کے لیے کافی ہے۔

دوسرے ہم عصر جن سے آپ متاثر ہوئے:

اپنے زمانے کے جن بزرگوں سے آپ خاص طور پر متاثر ہوئے ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں۔ ان کے بارے میں آپ کے تاثرات بھی توسین میں درج ہیں:

شیخ محمد زکی بن العلاءؒ (زمانے کے سردار اور محبت کا شعلہ)، شیخ القاسم سدیؒ (پیر مجاہدہ)، شیخ الشیوخ ابوالحسن بن سالبہؒ (توحید میں روشن بیان)، شیخ ابواسحاق بن شہریار (صاحب دبدبہ)، شیخ ابوالحسن علی بن بکران (بزرگ صوفی)، شیخ ابوعبداللہ جنیدیؒ (بہت احترام والے)، شیخ ابوطاہر مکشوف (جلیل القدر بزرگ)، شیخ احمد بن شیخ خرقانی، خواجہ علی بن الحسین السیر کانی (وقت کے سیاح)، شیخ مجتہد ابوالعباس دامغانی (خدا کے اقبال کا سایہ)، خواجہ ابوجعفر محمد بن علی الجوینی (محقق بزرگ)، خواجہ رشید مظفر بن شیخ ابوسعید (دلوں کا قبلہ)، خواجہ شیخ احمد جمادی سرخسی (وقت کے پہلوان) اور شیخ احمد نجار سمرقندی (زمانے کے بادشاہ) رحمہم اللہ۔

دو اہم واقعات:

اپنے تلاش و جستجو کے زمانے کا ایک واقعہ بیان فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ مجھے ایک مشکل پیش آئی۔ اس کے حل کے لیے میں نے بہت مجاہدے کیے۔ مگر یہ مشکل حل نہ ہوئی۔ اس سے پہلے بھی مجھے ایک مشکل پیش آئی تھی اور اس کے حل کے لیے میں نے حضرت شیخ ابویزید رحمۃ اللہ علیہ کی قبر

کی مجاوری اختیار کر کے اس پر غور وفکر کیا تھا اور میری وہ مشکل وہاں حل ہوگئی تھی۔ اب کے میں نے پھر ایسا کیا۔ برابر تین ماہ تک میں ان کی قبر کا مجاور بنا رہا۔ ہر روز تین مرتبہ غسل کرتا رہا۔ اور تیس دفعہ وضو کرتا رہا۔ لیکن میری یہ مشکل حل نہ ہوئی۔ بالآخر میں نے خراسان جانے کا ارادہ کیا اور راستے میں رات کے وقت ایک خانقاہ میں رات بسر کرنے کے لیے ٹھہرا۔ وہاں صوفیوں کی ایک جماعت بھی تھی۔ میرے پاس اس وقت موٹے کُھردرے ٹاٹ کی ایک گودڑی تھی اور وہی میں نے پہن رکھی تھی۔ ہاتھ میں ایک عصا اور کوزہ (لوٹا) تھا۔ اس کے سوا اور کوئی سامان میرے پاس نہیں تھا۔ ان صوفیوں نے مجھے بہت حقارت کی نظر سے دیکھا۔ اور اپنے خاص انداز میں ایک دوسرے سے کہا کہ یہ ہم میں سے نہیں ہے۔ اور وہ اپنی اس بات میں سچے تھے۔ کیونکہ میں فی الواقع ان میں سے نہ تھا۔ میں تو محض ایک مسافر کی حیثیت سے رات بسر کرنے کے لیے ان کے پاس پہنچ گیا تھا۔ ورنہ ان کے طور طریقوں سے میرا کوئی سروکار نہ تھا۔ انھوں نے خانقاہ کے نیچے ایک کمرہ میں مجھے بٹھا دیا اور ایک سوکھی روٹی اور وہ بھی روکھی میرے آگے رکھ کر خود کھانے کے لیے اوپر چوبارہ میں جا بیٹھے۔ جو کھانے وہ خود کھا رہے تھے ان کی خوشبو مجھے آ رہی تھی اور اس کے ساتھ چوبارہ پر سے وہ طنزیہ انداز میں مجھ سے باتیں کرتے تھے۔ جب وہ کھانے سے فارغ ہوئے تو خربوزے لے کر بیٹھ گئے اور چھلکے مجھ پر پھینکتے رہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ ان کی طبیعت کی خوشی اس وقت میری توہین پر موقوف تھی۔ میں اپنے دل میں خدا سے کہہ رہا تھا کہ بار خدایا، اگر میں نے تیرے دوستوں کا لباس نہ پہنا ہوا ہوتا تو میں ضرور ان کی ان حرکات کا مزا ان کو چکھا دیتا۔ لیکن چونکہ میں اسے خداوند تعالیٰ کی طرف سے ابتلا سمجھ کر برداشت کر رہا تھا، اس لیے جس قدر وہ طعن و ملامت مجھ پر زیادہ کرتے تھے میں خوش ہوتا تھا۔ یہاں تک کہ اس طعن کا بوجھ اٹھانے سے میری وہ مشکل جس کے لیے میں مجاہدوں اور اس سفر کی مشقت اٹھا رہا تھا وہیں حل ہوگئی، اور اسی وقت مجھ کو معلوم ہو گیا کہ مشائخ رحمہم اللہ جاہلوں کو اپنے درمیان کیوں رہنے دیتے ہیں اور ان کا بوجھ کس لیے اٹھاتے ہیں۔ نیز یہ کہ بعض بزرگوں نے ملامت کا طریقہ کیوں اختیار کیا ہے؟ واقعہ یہ ہے کہ اس سے بعض اوقات وہ عقدے حل ہو جاتے ہیں جو دوسرے طریقوں سے حل نہیں ہوتے۔

عراق کا ایک واقعہ اپنے متعلق بیان کرتے ہیں کہ عراق میں اپنے قیام کے زمانے میں ایک دفعہ میں دنیا کمانے اور اسے خرچ کرنے میں بہت دلیر ہو گیا۔ جس کسی کو کوئی ضرورت پیش آتی وہ میری طرف رجوع کرتا اور میں نہ چاہتا کہ میرے دروازے سے کوئی خالی جائے۔ اس لیے اس کی ضرورت پوری کرنے کی کوشش کرتا۔ یہاں تک کہ میں بہت زیادہ مقروض اور اس صورت حال سے سخت پریشان ہو گیا۔ آخر وقت کے بزرگوں میں سے ایک بزرگ نے مجھے لکھا: ''بیٹا! دیکھو، اس قسم کی مشغولیت میں کہیں خدا سے دُور نہ ہو جاؤ۔ یہ مشغولیت ہوائے نفس ہے۔ اگر کسی کے دل کو اپنے سے بہتر پاؤ تو اس کی خاطر پریشانی اٹھاؤ۔ تمام مخلوق کے کفیل بننے کی کوشش نہ کرو۔ کیوں کہ اپنے بندوں کے لیے خدا خود کافی ہے۔'' فرماتے ہیں کہ اس نصیحت سے مجھے سکون قلب حاصل ہوا۔ اور میں نے یہ جانا کہ مخلوقات سے دُور رہنا صحت وسلامتی کی راہ ہے۔ انسان کو چاہیے کہ وہ خود اپنی طرف نہ دیکھے تاکہ کوئی اور بھی اس کی طرف نہ دیکھے۔ اور یہ حقیقت ہے کہ آدمی خود ہی اپنے آپ کو اہم اور بڑی چیز خیال کرتا ہے ورنہ دنیا اسے کچھ بھی نہیں سمجھتی۔ وہ تو صرف اپنا کام اُس سے نکالتی ہے۔

آپ کا طریق:

آپ کے نزدیک صوفی صفا سے مشتق ہے اور صفا کی اصل دل کو غیر اللہ سے منقطع اور دنیا غدار سے خالی کر کے اللہ سے جوڑنا ہے۔ گویا اس کا مطلب اخلاص اور سچی محبت کے ساتھ خدا کی بندگی کی راہ اختیار کرنا ہے نہ کہ کوئی خاص وضع قطع اختیار کرنا۔ آپ فرماتے ہیں: کہ طالب کو تمام احوال میں شرع اور علم کا پیرو ہونا چاہیے۔ کیونکہ سلطانِ علم سلطانِ حال پر غالب اور اس سے افضل ہے۔ چنانچہ آپ چالیس برس مسلسل سفر میں رہے لیکن کبھی نماز باجماعت ناغہ نہیں کی اور ہر جمعہ کی نماز کے لیے کسی قصبہ میں قیام فرمایا۔ عام رہن سہن عام لوگوں کی طرح رکھتے۔ صوفیوں کے ظاہری رسوم اور وضع قطع سے آپ شیخِ طریقت شیخ ابو الفضل محمد بن ختلیؒ کی طرح ہمیشہ مجتنب رہے۔ بلکہ اس سے آپ کو ایک گونہ نفرت تھی۔ اور ان چیزوں کو ریاکاری ونمائش اور معصیت کا نام دیتے تھے۔

نکاح کے بارے میں آپ نے فرمایا کہ: جو شخص مخلوق میں رہنا چاہے اس کے لیے نکاح کرنا شرط ہے۔ اور اگر بغیر نکاح کے اس کے زنا میں مبتلا ہو جانے کا اندیشہ ہو تو اس کے لیے نکاح فرض ہے۔ لیکن جو مخلوق سے الگ تھلگ رہتا ہو اس کے لیے مجرد رہنا اچھا ہے تا کہ اس کی وجہ سے کوئی نیک بخت پریشان نہ ہو اور وہ بھی یکسوئی کے ساتھ خدا کی ملازمت کر سکے۔ آپ چونکہ اپنی عمر کا بیشتر حصہ سفر اور مسافرت ہی میں رہے۔ اس لیے آپ نے شادی نہیں کی بلکہ تجرد کی زندگی گزاری۔ لیکن تجرد کے ہلاکت خیز خطرات کے سلسلے میں فرماتے ہیں کہ اللہ عزوجل نے گیارہ برس تزویج (نکاح) کی آفت سے بچایا، لیکن تقدیر کا لکھا سامنے آیا اور میں بن دیکھے ایک پری صفت کا دل و جان سے گرویدہ ہو گیا اور ایک سال اس طرح اس میں مستغرق رہا کہ قریب تھا کہ میرا دین تباہ و برباد ہو جاتا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے کامل لطف و مہربانی سے میرے دل پر عصمت و پاکیزگی کا فیضان فرمایا اور اپنی رحمت سے مجھے اس آفت[1] سے نجات بخشی۔

لاہور میں آمد اور قیام:

آپ اپنے مرشد کے حکم سے خدا کے دین کی تبلیغ و اشاعت کے لیے سلطان محمود غزنوی کے بیٹے ناصر الدین مسعود کے زمانے (۴۲۱ھ بمطابق ۱۰۳۰ء تا ۴۳۲ھ بمطابق ۱۰۴۰ء) میں لاہور تشریف لائے۔ آپ سے پہلے آپ کے پیر بھائی حسین زنجانی اس خدمت پر مامور تھے۔ اس لیے جب آپ کو لاہور آنے کا حکم ہوا تو آپ فرماتے ہیں کہ میں نے شیخ سے عرض کیا کہ وہاں حسین زنجانی موجود ہیں میری کیا ضرورت ہے۔ لیکن شیخ نے فرمایا، نہیں تم جاؤ۔ فرماتے ہیں کہ میں رات کے وقت لاہور پہنچا اور صبح کو حسین زنجانی کا جنازہ شہر سے باہر لایا گیا۔

تبلیغ و اشاعت دین کے سلسلے میں آپ نے برصغیر ہند کے دوسرے حصوں کا بھی سفر کیا۔ چنانچہ آپ ''کشف المحجوب'' میں حضرت ابوحلیم حبیب بن اسلم راعی رحمۃ اللہ علیہ کے حالات میں لکھتے ہیں: شیخ رحمۃ اللہ علیہ کی اور بھی بہت سی روایتیں ہیں۔ وقت کی تنگی کی وجہ سے ان کو چھوڑتا ہوں، اور مجھے یہ سخت دقت پیش آ رہی ہے کہ میری کتابیں غزنی میں ہیں اور میں ملک ہندوستان

[1] یعنی اللہ تعالیٰ نے کسی معصیت میں مبتلا ہونے سے بچالیا۔

کے ایک گاؤں ھنور میں ہوں جو کہ ملتان کے گردونواح میں واقع ہے اور بالکل غیر جنسوں میں گرفتا ہوں۔ والحمد للّٰہ علی السّرّاءِ و الضّرّاء.

لیکن آپ کا مقام اور مرکز لاہور ہی رہا۔ اور آخر لاہور ہی میں ۴۶۵ھ میں انتقال فرمایا اور یہیں دفن ہیں۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیۡہِ رَاجِعُوۡن۔

آپ کا روضہ ناصر الدین مسعود کے بیٹے ظہیر الدولہ نے تعمیر کرایا۔ اور خانقاہ کا فرش اور ڈیوڑھی جلال الدین اکبر بادشاہ (۹۶۳ھ بمطابق ۱۵۵۵ء تا ۱۰۱۴ھ بمطابق ۱۶۰۵ء) کی تعمیر ہیں۔ خواجہ معین الدین اجمیریؒ (۱۲۳۹ء) اور خواجہ فرید الدین گنج شکرؒ نے کسبِ فیض کے لیے آپؒ کے مزار پر چلہ کشی کی۔

آپ کی تصانیف:

آپ نے حسب ذیل کتب تصنیف فرمائیں، لیکن اب ''کشف المحجوب'' کے سوا کوئی اور کتاب نہیں ملتی:

۱۔ کشف المحجوب

۲۔ منہاج الدین (یہ کتاب اصحاب صفہ رضی اللہ عنہم کے مناقب پر تھی)

۳۔ الرعایہ لحقوق اللہ

۴۔ کتاب الفنا والبقا

۵۔ اسرار الخرق والمؤنات

۶۔ بحر القلوب

۷۔ کتاب البیان لاہل العیان

شعر و شاعری سے بھی آپ کو دلچسپی تھی اور آپ کا ''دیوان'' بھی تھا۔ کشف المحجوب میں اس کا ذکر کرتے ہوئے آپؒ نے لکھا ہے کہ بعض لوگ دوسروں کی تصانیف کو اپنے نام سے منسوب کر کے شائع کر دیتے ہیں۔ چنانچہ ایک شخص نے مجھ سے میرے شعروں کا دیوان دیکھنے کے لیے

مانگا اور پھر واپس نہ کیا، اور اس نے شروع سے میرا نام محو کر کے اسے اپنے نام سے پیش کر دیا۔ چونکہ دیوان کا یہی ایک نسخہ تھا جو وہ لے گیا۔ اس لیے میں کچھ نہ کر سکا اور اس نے میری محنت کو برباد کر دیا۔

اسی طرح ایک اور شخص نے میری دوسری کتاب ''منہاج الدین'' جو میں نے تصوف پر تصنیف کی تھی، مجھ سے مانگی اور اس پر سے میرا نام مٹا کر عوام الناس میں اسے اپنے نام سے شائع کر دیا۔

آپؒ کا مشہور قول:

آپؒ فرمایا کرتے تھے: ''نفس کو اس کی خواہش سے دُور رکھنا حقیقت کے دروازہ کی چابی ہے۔''

شجرۂ نسب وطریقت حضرت علی ہجویریؒ وسیّد عبدالقادر جیلانیؒ وخواجہ معین الدین اجمیریؒ

(مرتبہ: پیر غلام دستگیر نامیؔ)

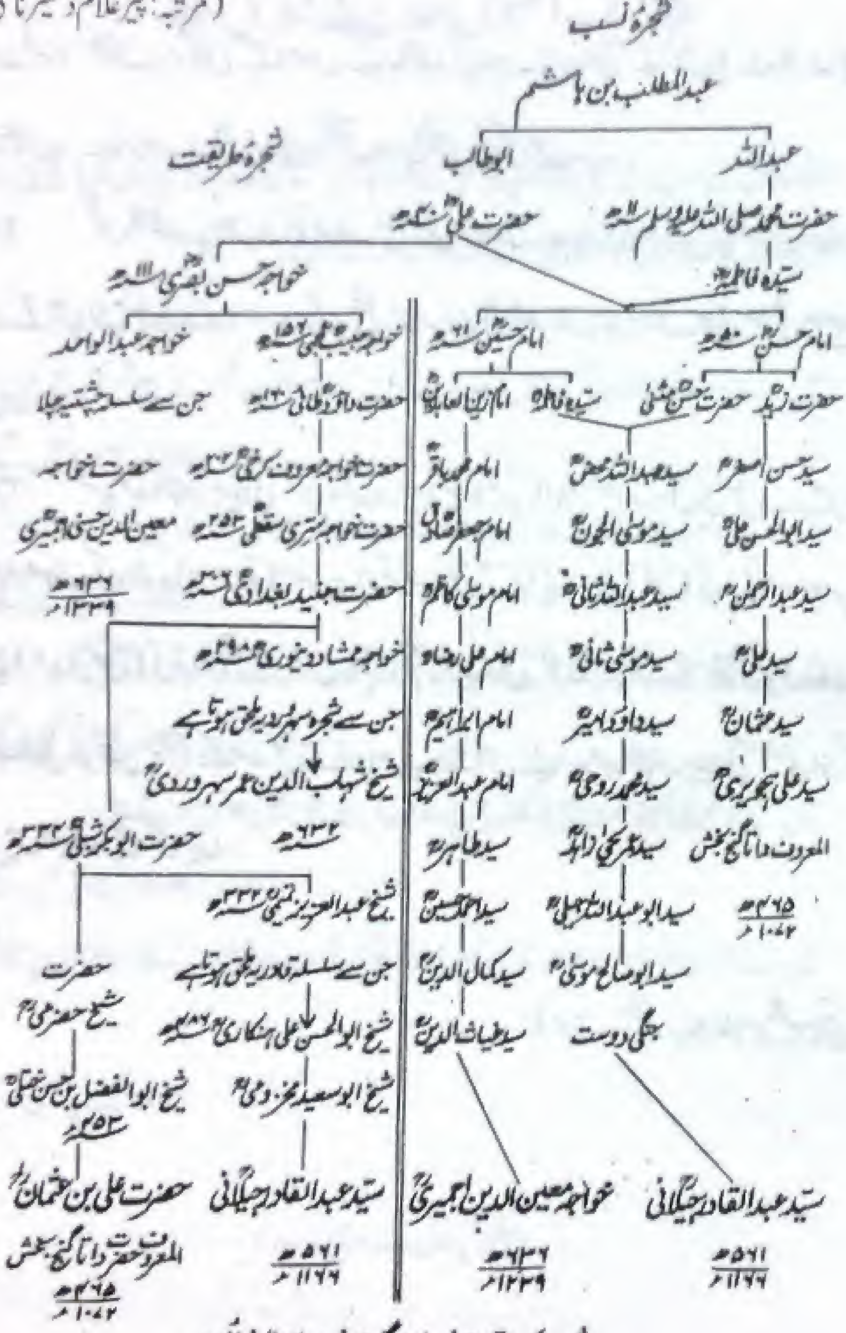

(شجرہ کے متعلق نوٹ اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)

نوٹ نمبر ۱: مختلف بزرگوں کے ناموں کے ساتھ دیے ہوئے سن ان کے سال ہائے وفات ہیں۔
اور نشان سے مراد یہ ہے کہ درمیان پشتیں درج نہیں کی گئی ہیں۔

نمبر ۲: شجرہ نقشبندیہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے جاری ہوا ہے۔ پاکستان و ہند کے علاقے میں اس سلسلے کے نامور بزرگ شیخ احمد سرہندیؒ المعروف مجدد الف ثانی متوفی ۱۰۳۴ھ ہیں۔

نمبر ۳: سید عبدالقادر جیلانیؒ کی والدہ (ام الخیر فاطمہؒ) امام جعفر صادق کی نسل سے تھیں اور امام موصوف کی والدہ (ام خردہؒ) حضرت ابوبکر صدیقؓ کے ایک بیٹے (محمدؒ) کی پوتی اور دوسرے بیٹے (عبدالرحمٰنؓ) کی نواسی تھیں۔ جس بنا پر امام جعفر صادقؒ فخراً فرمایا کرتے تھے کہ وَلَدَنِی الصِّدِّیْقُ مَرَّتَیْنِ یعنی مجھے صدیقؓ نے دو مرتبہ جنا۔ اس لیے سید عبدالقادر جیلانیؒ حسنی اور حسینی سید ہیں اور صدیقی بھی ہیں۔

(مرتب: بشکریہ پیر غلام دستگیر نامی)

ایک انمول حدیث قدسی

اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا کہ: "میں نے پانچ چیزوں کو پانچ چیزوں میں رکھ دیا ہے۔ لوگ انھیں دوسری چیزوں میں تلاش کرتے ہیں۔

بھلا وہ کیسے پائیں گے؟

میں نے اپنی رضا کو مخالفتِ نفس میں رکھ دیا ہے، لوگ اُسے موافقتِ نفس میں تلاش کرتے ہیں،

بھلا وہ کیسے پائیں گے؟

میں نے آرام کو جنت میں رکھ دیا ہے، لوگ اُسے دنیا میں تلاش کرتے ہیں،

بھلا وہ کیسے پائیں گے؟

میں نے علم وحکمت کو بھوک میں رکھ دیا ہے، لوگ اُسے مال میں تلاش کرتے ہیں،

بھلا وہ کیسے پائیں گے؟

میں نے تونگری کو قناعت میں رکھدیا ہے، لوگ اُسے مال میں تلاش کرتے ہیں،

بھلا وہ کیسے پائیں گے؟

میں نے عزت کو اپنی اطاعت میں رکھ دیا ہے، لوگ اُسے بادشاہوں کے دروازوں پر تلاش کرتے ہیں،

بھلا وہ کیسے پائیں گے؟"

(بشکریہ ہفت روزہ ایشیا، لاہور)

آغازِ سخن

حضرت شیخ سیّد علی ہجویری المعروف داتا گنج بخش رحمۃ اللہ علیہ کی آٹھ دس تصانیف میں سے صرف ''کشف المحجوب'' ہم تک پہنچی ہے۔ فارسی زبان میں اس فن پر یہ پہلی کتاب ہے اور علمِ تصوّف میں سند کا درجہ رکھتی ہے۔

سببِ تالیف:

کتاب کی ساتویں فصل میں ''کشف المحجوب'' کا سببِ تالیف بیان کرتے ہوئے مصنفؒ نے بتایا ہے کہ غزنی کے ایک شخص ابو سعید نے آپ سے حسبِ ذیل باتوں پر روشنی ڈالنے کی درخواست کی:

۱۔ تصوف کے راستہ کی تحقیق

۲۔ تصوف کے مقامات کی کیفیت

۳۔ تصوف کے مختلف مذاہب اور ہر ایک کے مقالات کا بیان

۴۔ تصوف کے اشارات اور رموز کا بیان

۵۔ اللہ تعالیٰ کی محبت اور اس کی کیفیات دلوں میں کس طرح جاگزیں ہوتی ہیں؟

۶۔ اس کی کیا وجہ ہے کہ انسانی عقل اللہ تعالیٰ کی ماہیت کی تہہ تک نہیں پہنچ پاتی۔

۷۔ انسانی نفوس کو خداوند تعالیٰ کی حقیقت سے نفرت اور روح کو اس کی صفات کے ساتھ سکون اور آرام کیوں ہے؟ اس سلسلے کی ساری باتیں بیان فرما دیجیے۔

آپ فرماتے ہیں کہ میں نے ان سوالات میں اخلاص اور سچی طلبِ حق کی خوشبو محسوس کی اور ان سوالات کو پیشِ نظر رکھ کر یہ کتاب تالیف کی..... اس تالیف کی ضرورت کے متعلق فرماتے ہیں:

''پیشہ ور اہلِ طریقت اور غلط رو صوفیوں کے غلبہ کی وجہ سے سچے متلاشیانِ حق کو صحیح راہ

معلوم کرنے میں دقت پیش آرہی ہے۔ علمِ حقیقت ہمارے زمانہ میں اور خصوصاً ہمارے ملک میں پرانا ہو گیا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ تمام مخلوقات اپنی نفسانی خواہشات میں مبتلا ہے اور اللہ تعالیٰ کی رضا کی راہ سے منہ موڑ چکی ہے۔ زمانے کے علماء اور مدعیانِ طریقت تک اللہ کی رضا جوئی کی صحیح راہ کے خلاف چل رہے ہیں جو اپنے آپ کو خدا کے عارف کہتے ہیں وہ بھی اس کی معرفت سے نابلد ہیں۔ اب یہ اللہ ہی کے ارادے پر منحصر ہے کہ اُس چیز کو اپنی اصلی صورت میں نمایاں کرنے کے اسباب پیدا فرمائے جسے اہل زمانہ کھو چکے ہیں۔ کیونکہ جب اہل علم تحقیق کا راستہ چھوڑ کر تقلید میں مبتلا ہو جاتے ہیں تو تحقیق اُن سے اپنا منہ چھپا لیتی ہے۔''

آپ فرماتے ہیں کہ یہ معلوم کرنے اور اس بارے میں یکسوئی حاصل کرنے کے لیے کہ میں اس کارِ عظیم میں ہاتھ ڈالوں یا نہ ڈالوں، میں نے استخارہ کیا، اور استخارہ سے پہلے اپنے دل سے تمام نفسانی اغراض کو مٹا دیا کہ اس تالیف میں کوئی نفسانی غرض نہ شامل ہونے پائے۔ جب میں یکسو ہو گیا تو سائل کے سوالات کا مفصل جواب تحریر کرنے کے لیے کمربستہ ہو گیا اور اس کی استدعا کا حکم بجالانے کا عزمِ صمیم کر لیا۔ اس سے پہلے بھی میں نے اسی مضمون کی بہت سی کتابیں تیار کی تھیں۔ مگر سب کی سب ضائع ہو گئیں اور پیشہ ور لوگوں نے ان کتابوں سے بعض باتوں کو چرا کر بہت سی مخلوقِ خدا کو شکار کیا۔

وجہ تسمیہ:

کتاب کے نام کے بارے میں فرماتے ہیں کہ میں نے اس کتاب کا نام ''کشف المحجوب'' اس وجہ سے رکھا ہے تاکہ کتاب کا نام اس کے مضامین پر دلالت کرے اور اصحابِ علم کتاب کا نام سن کر یہ سمجھ لیں کہ یہ کتاب کس فن کے متعلق ہے۔ نیز چونکہ یہ کتاب خدا کے راستہ کے بیان اور بشریّت کے حجاب دُور کرنے کی غرض سے ہی لکھی گئی ہے اس لیے ''کشف المحجوب'' سے موزوں تر اس کے لیے کوئی اور نام نہیں ہو سکتا تھا۔

اس کتاب کا علمی مرتبہ:

''کشف المحجوب'' کو ہر زمانے میں علمِ طریقت پر بے مثل کتاب تصور کیا گیا ہے۔ چنانچہ حضرت نظام الدین اولیاءؒ فرماتے ہیں کہ جس شخص کا کوئی مرشد نہ ہوا سے ''کشف المحجوب'' کے مطالعہ سے مل جائے گا۔ ملاّ جامیؒ فرماتے ہیں کہ کشف المحجوب اس فن کی مشہور اور معتبر کتاب ہے اور اس میں لطائف وحقائق جمع کر دیے گئے ہیں۔ داراشکوہ نے اس کے متعلق لکھا ہے کہ حضرت علی ہجویریؒ مرشدِ کامل ہیں اور کشف المحجوب ان کی مشہور ومعروف تصنیف ہے۔ کسی شخص کو اس کی کسی بات پر کوئی کلام نہیں اور فارسی زبان میں تصوف پر اس پایہ کی کوئی کتاب نہیں۔

حضرت شرف الدین یحیٰی منیری رحمۃ اللہ علیہ اپنے مکتوبات میں جگہ جگہ کشف المحجوب کا ذکر کرتے ہیں اور ''لطائف اشرفی'' میں جو حضرت جہانگیر اشرف سمنانیؒ کے ملفوظات پر مشتمل ہے کشف المحجوب کے جگہ جگہ حوالے دیے گئے ہیں۔

نیز ''مشک آنست کہ خود بگوید'' کے مصداق کتاب قاری کو خود بتا دے گی کہ وہ کس مرتبے کی ہے، اور آیا مصنف فی الواقع ''ناقصاں راپیرِ کامل'' اور ''کاملاں راہ راہنما'' ہے یا نہیں۔

(مرتب)

خطبۂ افتتاحیہ

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ ط

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط

رَبَّنَا اٰتِنَا مِنْ لَّدُنْکَ رَحْمَۃً وَّھَیِّیْٔ لَنَا مِنْ اَمْرِنَا رَشَدًا ط اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ الَّذِیْ کَشَفَ لِاَوْلِیَائِہٖ بَوَاطِنَ مَلَکُوْتِہٖ وَقَشَعَ لِلْاَصْفِیَآئِہٖ سَرَائِرَ جَبَرُوْتِہٖ وَاَھْرَقَ دَمَ الْمُحِبِّیْنَ بِسَیْفِ جَلَالِہٖ وَاَذَاقَ سِرَّ الْعَارِفِیْنَ بِرُوْحِ وِصَالِہٖ ھُوَ الْمُحْیِ لِمَوَاتِ الْقُلُوْبِ بِاَنْوَارِ اِدْرَاکِ صَمْدِیَّتِہٖ وَکِبْرِیَائِہٖ وَالْمُنْعِشُ لَھَا بِرَاحَۃِ رُوْحِ الْمَعْرِفَۃِ بِنَشْرِ اَسْمَائِہٖ وَالصَّلٰوۃُ وَالسَّلَامُ عَلٰی رَسُوْلِہٖ مُحَمَّدٍ وَّاٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَاَزْوَاجِہٖ.
اَمَّا بَعْدُ:

یعنی میں شیطانِ مردود کی دخل اندازیوں سے اللہ کی پناہ مانگتا ہوں اور اس کام کو اللہ کے نام سے شروع کرتا ہوں جو رحمٰن اور رحیم ہے۔ اے ہمارے پروردگار! اپنی بارگاہ سے ہم پر رحمت کا نزول فرما اور ہمارے کام میں ہمیں راست روی کی توفیق مہیا فرما۔ تعریف اللہ ہی کے لیے ہے جس نے اپنے اولیاء (دوستوں) پر اپنے نظام سلطنت کے اسرار کھولے۔ اپنے برگزیدہ بندوں پر اپنی قوت وجبروت کے راز واضح کیے اور اپنے جلال کی تلوار سے (جب اور جہاں اس کی مصلحت متقاضی ہوئی) اپنے محبوبوں کا خون بہایا اور عارفوں کو اپنے وصل کی شراب سے بہرہ اندوز فرمایا۔ وہی اپنی بے نیازی اور عظمت و کبریائی کے ادراک کے نور سے مردہ دلوں کو زندہ کرنے والا اور اپنے اسمائے مبارک کی حقیقی معرفت کی خوشبو سے انھیں مالا مال کرنے والا ہے۔ اور اس کی رحمت اور سلامتی کا نزول ہو اس کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر اور ان کی آل پر اور ان کے اصحاب پر اور ان کی ازواجِ مطہرات پر۔

رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْھُمْ اَجْمَعِیْنَ.

اس کے بعد اب

میں علی بیٹا عثمان کا اور عثمان بیٹا علی جلابی کا جو غزنی کا رہنے والا ہوں اور جس

نے ہجویر میں آ کر بود و باش اختیار کی، اس کام کا آغاز کرتا ہوں:۔

بسمله[1] اور صحتِ نیّت

ہمیں یہ حکم دیا گیا ہے کہ اپنے کاموں کا آغاز خداوند تعالیٰ کے نام (یعنی بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط سے اور اس کی مدد واستعانت طلب کرتے ہوئے کریں۔ کیونکہ کاموں کی بھلائی کسب وتدبیر پر موقوف نہیں ہے بلکہ خدا کی قضا اور توفیق پر موقوف ہے۔ چنانچہ اللہ عزوجل نے اپنے پیارے رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے پیروؤں کو ارشاد فرمایا: ''فَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ (۱۶ : ۹۸) یعنی ''جب تم قرآن مجید کو پڑھو تو پہلے شیطان مردود کی دخل اندازیوں سے اللہ کی پناہ مانگو۔'' اور اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم اور اس کی سورتوں کا آغاز بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط سے فرمایا۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اپنے پیروؤں کو بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط سے اپنے کاموں کو شروع کرنے کی تعلیم فرمائی۔ بندے کو اپنے کام میں خداوند تعالیٰ کی مدد اور توفیق اسی صورت میں حاصل ہو سکے گی جب کہ وہ اسے خدا کے نام اور اس سے مدد ورہنمائی طلب کرتا ہوا کرے گا۔

اس کے علاوہ نیت کی درستی بھی ضروری شے ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ نے فرمایا: اَلْاَعْمَالُ بِالنِّیَّاتِ یعنی اعمال کا انحصار نیتوں پر ہے۔ نیت کو کاموں میں اتنا بڑا دخل حاصل ہے کہ محض نیت کے اختلاف سے ایک کام ایک حکم سے دوسرے حکم میں داخل ہو جاتا ہے اور اس کی نوعیت اور نتائج سب بدل جاتے ہیں حالانکہ اس کی ظاہری شکل وصورت وہی رہتی ہے۔ مثلاً ایک مسافر کسی شہر میں مقیم ہونے کی نیت کیے بغیر عرصہ دراز تک بھی آ کر ٹھہرا رہے تو وہ مقیم تصور نہیں ہو گا۔ اور اس کا حکم مسافر ہی کا رہے گا۔ لیکن جب وہ اقامت کی نیت سے کسی شہر میں آئے تو باوجود اس کے کہ ظاہری عمل ایک سا ہو گا، وہ مقیم بن جائے گا اور اس پر مقیم کا حکم جاری ہو گا۔ اسی طرح وہ شخص جو روزے کی نیت کیے بغیر دن بھر بھوکا پیاسا رہے روزہ دار تصور نہیں ہو گا اور نہ اس کے بھوکا پیاسا رہنے پر اسے کوئی اجر وثواب ملے گا۔ لیکن اگر وہ روزے کی نیت کے ساتھ بھوکا رہے تو اس طرح بھوکا رہنے پر اسے قربِ خداوندی حاصل ہو گا۔

[1] بسملہ یعنی بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ط

اگر کام شروع کرتے وقت انسان کا ارادہ صحیح نیت پر ہو لیکن اس کے بعد اس عمل میں کوئی خلل واقع ہو جائے جس کی وجہ سے وہ اسے پایۂ تکمیل کو نہ پہنچا پائے تو وہ معذور متصور ہوگا اور اس کا اجر اسے مل جائے گا۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نِیَّتُ الْمُؤْمِنِ خَیْرٌ مِّنْ عَمَلِہٖ یعنی مومن کی نیت اس کے عمل سے برتر ہے۔ نیت آدمی کے عمل کے بغیر بھی نفع بخش ہو سکتی ہے لیکن کوئی عمل بغیر صحیح نیت کے اسے نفع نہیں دیتا۔ نیز نیت میں جس قدر اخلاص ہوگا اس عمل کا اجر وثواب بڑھتا چلا جائے گا۔

صحت نیت کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کے پیشِ نظر صرف خداوند تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کا حصول ہو، کوئی نفسانی غرض اس میں شامل نہ ہو۔ یاد رکھو کہ ہر وہ کام جس میں آدمی کے پیشِ نظر حق تعالیٰ کی خوشنودی نہ ہو وہ اغراضِ نفسانی کے تحت ہوتا ہے۔ اور جس کام میں نفسانی غرض شامل ہو جاتی ہے اس میں سے برکت اٹھ جاتی ہے اور آدمی کا دل راہِ راست سے منحرف ہو جاتا ہے۔ نفسانیت دوزخ کی کنجی ہے کیونکہ نفس کی لذات ومرغوبات کے پیچھے ہی آدمی جہنم کی راہ اختیار کرتا ہے۔ اس کے برعکس جنت کی کنجی یہ ہے کہ آدمی اپنے نفس کو حق تعالیٰ کی رضا کی راہ پر گامزن کرے اور اسے اس کی خواہشات کی راہ سے روکے۔ چنانچہ اللہ عزّ وجل نے فرمایا: ''فَاَمَّا مَنْ طَغٰی o وَاٰثَرَ الْحَیٰوۃَ الدُّنْیَا o فَاِنَّ الْجَحِیْمَ ھِیَ الْمَاْوٰی o وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّہٖ وَنَھَی النَّفْسَ عَنِ الْھَوٰی o فَاِنَّ الْجَنَّۃَ ھِیَ الْمَاْوٰی o (۷۹:۳۷۔۴۱) یعنی جس شخص نے خداوند تعالیٰ سے سرکشی اختیار کی اور دنیا کی زندگی کو (آخرت کی نعمتوں اور خدا کی رضا پر) ترجیح دی تو ایسے شخص کا ٹھکانا دوزخ ہے۔ اور جو اپنے رب کے سامنے پیش ہونے سے ڈرا اور (اس خوف سے) اس نے نفس کو اس کی خواہشات سے روکا، اس کا ٹھکانا جنت ہے۔''

پس جو کام آدمی کرے اس میں اسے دیکھنا چاہیے کہ اس کے سامنے خداوند تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی کا حصول ہے یا اُس کی محرک اِس کی کوئی نفسانی خواہش ہے۔ اگر دوسری صورت ہو تو وہ اس کام سے رُک جائے یا جس حد تک اس میں نفسانی خواہش کو دخل ہو اُس سے اپنی نیت اور ارادے کو پاک کرے۔

خدا کی راہ کے حجاب

خداوند تعالیٰ کی فرماں برداری اختیار کرنے میں انسان کی راہ میں جو رکاوٹیں حائل ہوتی ہیں اُن کو تصوف کی زبان میں ''حجاب'' کہتے ہیں اور ان کی دو قسمیں ہیں۔ ایک حجاب رَینی اور دوسرا حجاب غَینی۔

رَینی حجاب:

رَینی حجاب ایک مستقل رُکاوٹ ہے۔ یہ کبھی نہیں اٹھے گا۔ کیونکہ اس کے لاحق ہو جانے کے بعد آدمی کے دل پر مہر ہو جاتی ہے اور اس پر ٹھپہ لگ جاتا ہے۔ رَین (زنگ چڑھ جانا) خَتم (مہر لگ جانا) اور طَبَع (ٹھپہ لگ جانا) تینوں الفاظ کو قرآن مجید نے اس بارے میں ایک ہی معنی میں استعمال کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ''اِذَا تُتْلٰی عَلَیْهِ اٰیٰتُنَا قَالَ اَسَاطِیْرُ الْاَوَّلِیْنَ ○ كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا یَكْسِبُوْنَ ○ (۸۳: ۱۳۔۱۴) ''یعنی جب اس کے سامنے آیات پڑھی جاتی ہیں تو کہتا ہے، چھوڑو جی، پرانے قصے کہانیاں ہیں۔ نہیں، بلکہ اصل بات یہ ہے کہ اِن لوگوں کی بدکرداریاں زنگ بن کر ان کے دلوں پر جم گئی ہیں۔'' دوسری جگہ فرمایا:

''اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَیْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ ○ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰی سَمْعِهِمْ ؕ وَعَلٰی اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِیْمٌ ○ (۲: ۶۔۷) یعنی جن لوگوں نے (ان بنیادی حقائق کو) ماننے سے انکار کر دیا ہے، ان کے لیے یکساں ہے کہ انھیں ڈراؤ یا نہ ڈراؤ وہ ماننے والے نہیں۔ ان کے دلوں اور کانوں پر اللہ نے مہر کر دی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ پڑ گیا ہے، اُن کے لیے (تو اب) عذابِ عظیم ہی ہے۔'' اسی بات کو تیسری جگہ اللہ تعالیٰ نے اس طرح بیان فرمایا:

فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّیْثَاقَهُمْ وَكُفْرِهِمْ بِاٰیٰتِ اللّٰهِ وَقَتْلِهِمُ الْاَنْبِیَآءَ بِغَیْرِ حَقٍّ وَّقَوْلِهِمْ

قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ط بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ٥ (۴:۱۵۵) ''یعنی اُن کی عہد شکنی کی وجہ سے اور اس وجہ سے کہ انھوں نے اللہ کی آیات کو جھٹلایا اور متعدد پیغمبروں کو ناحق قتل کیا اور (حق کھل کر سامنے آ جانے پر اسے قبول کرنے کے بجائے الٹا یہ) کہا کہ ہمارے دل غلافوں میں محفوظ ہیں، (دل محفوظ نہ کہو) بلکہ ان کی باطل پرستی کے سبب اللہ نے ان کے دلوں پر ٹھپہ لگا دیا ہے۔ اس لیے ان میں سے شاذ و نادر ہی کوئی ایمان لاتا ہے۔''

جن لوگوں کا اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں ذکر فرمایا ہے، یہ ہیں وہ لوگ جن کے دلوں پر رَینی حجاب ڈال دیا گیا ہے۔ لیکن جیسا کہ خود ان آیات سے ظاہر ہے۔ یہ صورت ان کے اپنے طرزِ عمل اور اپنے کرتوتوں کے نتیجہ میں پیدا ہوتی ہے۔ یہ بات نہیں ہے کہ وہ خود تو صحیح راہ کے متلاشی تھے مگر اللہ نے ان کو ہدایت سے محروم کر دیا۔ چنانچہ حق تعالیٰ نے اس بات کو صاف طور پر واضح فرما دیا ہے کہ:

فَلَمَّا زَاغُوْٓا اَزَاغَ اللّٰهُ قُلُوْبَهُمْ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْفَاسِقِيْنَ ٥ (۶۱:۵) ''یعنی جب انھوں نے خود ہی کجروی اختیار کر لی تو اللہ نے بھی ان کے دلوں کو ٹیڑھا کر دیا کیونکہ اللہ کا یہ دستور نہیں ہے کہ نافرمانی کی راہ اختیار کر لینے والے لوگوں کو (زبردستی) راہ دکھائے۔'' ورنہ جو شخص اخلاص کے ساتھ ہدایت اور راست روی کا طلبگار ہو اسے اللہ ضرور راہِ راست دکھاتا ہے۔ فرمایا:

يَهْدِىْٓ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ (۴۲:۱۳) ''اللہ تعالیٰ راہنمائی کرتا ہے جو اس کی طرف رجوع کرے۔''

وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ فِى الْاَرْضِ...... (۲:۲۶-۲۷) ''گمراہی میں اللہ اُنہی لوگوں کو مبتلا کرتا ہے جو فاسق ہیں، جو اللہ کے عہد کو مضبوط باندھ لینے کے بعد توڑ دیتے ہیں۔ اللہ نے جن روابط کو جوڑنے کا حکم دیا ہے انھیں کاٹتے ہیں اور زمین میں فساد برپا کرتے ہیں۔'' اللہ کا اس بارے میں اٹل قاعدہ یہ ہے کہ

وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا (۲۹:۲۱) "یعنی جو لوگ ہماری راہ میں محنت اٹھاتے اور جدوجہد کرتے ہیں ان کو ہم ضرور اپنا راستہ دکھاتے ہیں۔" بلکہ اس بارے میں اللہ تعالیٰ کی شفقت اور مہربانی کا تو یہ عالم ہے کہ مَنْ یُّؤْمِنْ بِاللّٰهِ یَهْدِ قَلْبَهٗ (۶۴:۱۱) "یعنی جو شخص اللہ پر ایمان لے آئے اس کے دل کو وہ راہِ راست دکھا دیتا ہے۔" اس سے بڑھ کر اور کیا عنایت ہو سکتی ہے کہ اپنی کتاب ہر طرح سے محفوظ کر کے اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے ہاتھ میں دے دی اور بتا دیا: "ذٰلِکَ الْکِتٰبُ لَارَیْبَ فِیْهِ. هُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ (۲:۲) یہ اللہ کی کتاب ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں۔ یہ راہ دکھاتی ہے پرہیزگاروں (ہدایت کے طلبگاروں) کو۔"

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب کوئی شخص گناہ کرتا ہے تو اس کے دل پر اس گناہ کی شامت سے ایک سیاہ داغ پڑ جاتا ہے، پھر اگر اس نے اس گناہ سے توبہ کر لی اور آئندہ گناہوں سے باز رہا تو وہ داغ مٹ جاتا ہے اور دل صاف ہو جاتا ہے۔ ورنہ یہ داغ بڑھتے بڑھتے تمام دل کو گھیر لیتا ہے اور اسے سیاہ کر دیتا ہے۔ اسی کو اللہ تعالیٰ نے کَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ مَّا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ اور بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَیْهَا بِکُفْرِهِمْ اور خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰی قُلُوْبِهِمْ کے الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔ اس کا علاج بھی توبہ ہے، جس کی تفصیل آگے آئے گی۔

غینی حجاب:

رَینی حجاب، کے برعکس 'غینی حجاب' ایک عارضی رکاوٹ ہے اور یہ تھوڑی سی محنت و کوشش اور اللہ کی طرف رجوع کرنے سے دُور ہو سکتی ہے جیسا کہ اوپر درج کردہ آیات سے واضح ہے۔ یہ کم و بیش سبھی کو لاحق ہوتا رہتا ہے۔ اس کے دُور کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ آدمی سچے دل کے ساتھ اللہ کی طرف رجوع کرے۔ جن چیزوں کے بارے میں وہ خود بھی جانتا ہے کہ یہ خدا کی نافرمانی کے کام ہیں ان کو ترک کرے اور جن کو خدا کے عاید کردہ فرائض اور پسندیدہ کام جانتا ہے ان کے

لیے کمر بستہ ہو۔ ورنہ ظاہر بات ہے کہ جو شخص نہ راہ ہدایت کا خواستگار ہو، نہ اس کی ضرورت محسوس کرے اور نہ اس کے لیے کوئی محنت اور کوشش کرنے کے لیے تیار ہو، اسے ہدایت کیسے حاصل ہو؟ جس شخص کو نہ اپنی بیماری کا احساس ہو، نہ اُس کے برے انجام کی کوئی پرواہ ہو اور نہ وہ اس سے شفایابی کا طلبگار ہو، اس کے گھر کے سامنے بہترین ہسپتال بھی کھلا موجود ہو تو اُسے اس سے کیا فیض پہنچ سکتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''کَیْفَ یَهْدِی اللّٰهُ قَوْمًا کَفَرُوْا بَعْدَ اِیْمَانِهِمْ وَشَهِدُوْٓا اَنَّ الرَّسُوْلَ حَقٌّ وَّجَآءَهُمُ الْبَیِّنٰتُ ط وَاللّٰهُ لَا یَهْدِی الْقَوْمَ الظّٰلِمِیْنَ o (۳: ۸۶) یعنی ان لوگوں کو اللہ کیسے ہدایت بخشے جنھوں نے نعمتِ ایمان پالینے کے بعد پھر کفر کا رویہ اختیار کیا حالانکہ وہ یہ بھی شہادت دے چکے ہیں کہ رسول سچا ہے اور سب باتیں ان پر واضح ہو چکی ہیں (جان لو کہ) ایسے ظالم اور بے ڈھب لوگوں کو اللہ ہدایت نہیں دیا کرتا۔'' پس ایمان کی نعمت اور دین کی راہ پالینے کے بعد غفلت میں مبتلا رہنا اور خدا کی اطاعت کو عملاً اختیار نہ کرنا انسان کے لیے سخت خطرے کی حالت ہے۔ اگر آدمی اپنی اس حالت کو بدلنے کی کوشش نہ کرے گا تو اس کے متعلق اندیشہ ہے کہ یہ ''غینی حجاب'' آہستہ آہستہ ''رینی حجاب'' کی صورت اختیار کر لے۔

ان دونوں حجابوں کا فرق اس طرح سے سمجھئے، جیسے کہ ایک تو فی الاصل پتھر ہے اور اس سے آئینہ بن ہی نہیں سکتا اور دوسرا دراصل ایک آئینہ ہے جو زنگ آلود ہو گیا ہے اور صیقل کرنے سے صاف ہو سکتا ہے۔ لیکن یہ یاد رکھیے کہ جو دل پتھر کی صورت اختیار کرتے ہیں ان کو اللہ زبردستی پتھر نہیں بنادیتا۔ بلکہ آدمی خود ایسی راہ اختیار کرتا ہے جو اسے اس منزل پر پہنچانے والی ہوتی ہے اور اس راہ پر بڑھتے بڑھتے وہ اس مقام پر پہنچ جاتا ہے۔ ورنہ اصل حقیقت تو یہی ہے کہ کُلُّ مَوْلُوْدٍ یُوْلَدُ عَلٰی فِطْرَةِ الْاِسْلَامِ[1] یعنی ہر بچہ فطرتِ اسلام (خدا کی مخلصانہ اور بے آمیز بندگی کی راہ) پر پیدا ہوتا ہے۔

یہ دنیا ابتلا کا محل (یعنی امتحان گاہ) ہے:

اس سلسلے میں دوسری بات جو یاد رکھنے کی ہے وہ یہ ہے کہ اس جہان کو اللہ عزّ وجل نے ابتلاء اور آزمائش کا محل بنایا ہے۔ یہ دارالامتحان اور امانتوں کی جگہ ہے۔ جزا اور سزا کی جگہ یہ نہیں ہے۔

[1] موطا امام مالکؒ، کتاب الزہد

اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اس عالم کو حجاب کے محل میں رکھا ہے اور اس کی پوری حقیقت کو انسان کی آنکھوں سے چھپا دیا ہے۔ انسانوں کی رہنمائی کے لیے اُس پر سے جس قدر پردہ اٹھانا ضروری تھا وہ اللہ تعالیٰ نے خود ہی اپنے رسولوں کے ذریعہ سے اٹھا دیا ہے اور اس کے بعد یہ اعلان فرما دیا: اِنَّا هَدَیْنٰهُ السَّبِیْلَ اِمَّا شَاكِرًا وَّاِمَّا كَفُوْرًا ○ (۷۶: ۳) یعنی ہم نے انسان کو راہ دکھا دی، اب اس کا جی چاہے شکر گزاری کی روش اختیار کرے اور جی چاہے نافرمانی اور نمک حرامی کی راہ اختیار کرے۔ ''لیکن فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ○ وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ج هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ○ (۲: ۳۸۔۳۹) یعنی جو لوگ ہماری ہدایت کی پیروی کریں گے ان کے لیے کسی خوف اور رنج کا موقع نہ ہوگا۔ مگر جو اس کو رد کریں گے اور ہماری آیات کو جھٹلائیں گے، وہ آگ میں جانے والے لوگ ہیں، جہاں وہ ہمیشہ رہیں گے۔''

انسان کے لیے آسان راہ:

پھر اس بات کو بھی یاد رکھو کہ اللہ تعالیٰ نے کمال شفقت و مہربانی سے اس کائنات میں یہ صورت رکھی ہے کہ جس کام کے لیے کسی چیز کو پیدا فرمایا ہے اور جو کام فطرۃً یا صراحۃً اس نے کسی کے سپرد کیا ہے اس کا راستہ اس کے لیے آسان فرما دیا ہے۔ اگر آدمی نے اپنی غلط روی سے اپنی طبیعت اور عادت کو کج نہ کر لیا ہو تو اس کی طبیعت اور مزاج کے سب سے زیادہ موافق راہ وہی ہے جو اللہ نے اپنے رسولوں کے ذریعہ سے بنی نوع انسان کے سامنے واضح فرما دی ہے۔ کیونکہ یہ راہ اس ہستی کی تجویز کردہ ہے جو خود انسان کی خالق اور مصور ہے۔ قرآن مجید میں اس راہ کو ''اَلْیُسْرٰی'' سے تعبیر کیا گیا ہے۔ یعنی ''آسان راہ''۔ وہ راہ جو انسان کی فطرت و ساخت اور اس کی جبلت کے عین مطابق ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''وَنُیَسِّرُكَ لِلْیُسْرٰی (۸:۸۷) ہم 'اَلْیُسْرٰی' کو تمھارے لیے آسان کر دیں گے۔'' پھر فرمایا: ''فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰی وَاتَّقٰی وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰی فَسَنُیَسِّرُهٗ لِلْیُسْرٰی (۹۲: ۵۔۷) یعنی جس شخص نے خدا کی راہ میں دیا اور خدا ترسی کی راہ اختیار کی اور بھلائی کی تصدیق کی اُس کے

لیے ہم ''الْیُسْرٰی'' کو آسان کر دیں گے''۔ اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کو واضح کرتے ہوئے فرمایا: ''کُلٌّ مُیَسَّرٌ لِمَا خُلِقَ لَهٗ یعنی ہر چیز کے لیے وہ راہ آسان کر دی گئی ہے جس کے لیے اسے پیدا کیا گیا ہے۔'' گویا اس راہ کو اختیار کرنے میں انسان کی اپنی نفسانی خواہشات، بگڑی ہوئی عادات اور نیت کی خرابی کے سوا اور کوئی چیز حائل نہیں ہے۔ ورنہ خدا کی بندگی کی راہ تو فی الحقیقت اپنی اصل پر قائم انسان کے عین من کی مراد ہے اور اس کی فطرت، اس کے مزاج اور اس کی ضرورتوں کے عین مطابق اور موافق ہے۔

متلاشیانِ حق کے لیے رہنمائی کا انتظام:

پھر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس دنیا سے رخصت ہو جانے کے بعد اللہ تعالیٰ نے انسانوں کی ہدایت و رہنمائی کے لیے اس بات کا بھی پکا انتظام فرما دیا ہے کہ متلاشیانِ حق اور راہِ ہدایت کے طلب گاروں کے لیے انسانوں کے اندر سچے اہلِ حق کا ایک گروہ ہمیشہ موجود رہے جو بندگانِ خدا کی حق کی طرف ٹھیک ٹھیک راہنمائی کر سکے۔ حضور نبی کریمؐ نے اس امر کی خوش خبری دیتے ہوئے فرمایا: ''لَا تَزَالُ طَائِفَةٌ مِّنْ اُمَّتِیْ عَلَی الْخَیْرِ وَالْحَقِّ حَتّٰی تَقُوْمَ السَّاعَةُ''[1] یعنی امت میں سے ایک گروہ حق اور بھلائی کی راہ پر قائم رہے گا یہاں تک کہ قیامت قائم ہو جائے۔'' نیز فرمایا: ''لَا یَزَالُ فِیْ اُمَّتِیْ اَرْبَعُوْنَ عَلٰی خُلُقِ اِبْرَاهِیْمَ ۔ یعنی ہر زمانے میں میری امت میں (کم از کم) چالیس شخص ابراہیم علیہ السلام کے خُلق پر موجود رہیں گے۔''

پس جو شخص بھی راہِ راست کا طلبگار ہو اور نیک نیتی کے ساتھ اس پر چلنا چاہے اس کے لیے یہ مستقل خوش خبری ہے کہ اسے نہ تو راہِ راست معلوم کرنے میں ایسی کوئی مشکل پیش آئے گی جس پر قابو نہ پایا جا سکے اور نہ یہ صورت ہی انشاء اللہ اسے پیش آئے گی کہ دنیا میں اسے کوئی ساتھی و ہم سفر نہ ملے۔ صرف طلب صادق اور مخلصانہ کوشش و محنت شرط ہے۔ کم از کم اتنی طلب صادق اور کوشش و محنت جتنی ایک متوسط آدمی اپنی جائیداد کے مقدمہ کے لیے اچھا اور دیانت دار وکیل اور اپنے بچے کی

---

[1] اسی مضمون کی ایک دوسری روایت ہے:

عن ثوبان رضی اللہ عنہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال: لاتزال طائفةٌ من امتی علی الحق ظاھرین لا یضرُّھم من یخذلھم حتی یاتی امرُ اللہ یعنی حضرت ثوبانؓ بیان کرتے ہیں کہ نبی ﷺ نے فرمایا کہ میری امت میں سے ایک گروہ ہمیشہ حق پر کھلا قائم رہے گا اور ان کو دھوکا دینے والا ان کا کچھ نہ بگاڑ سکے گا اور یہ صورت تا قیامت باقی رہے گی۔ (ترمذی، ابوداؤد، مسلم) (مرتب)

یا اپنی بیماری کے علاج کے لیے اچھا اور دیانت دار طبیب تلاش کرنے کے لیے کرتا ہے۔

لوگوں کا حال:

اس راہ میں پہلا قدم صحیح اور قابل اعتماد علم کا حصول ہے۔ کیونکہ صحیح علم کے بغیر نہ آدمی صحیح راہ پا سکتا ہے اور نہ اس پر چل سکتا ہے۔ لیکن مصیبت یہ ہے کہ ہمارے زمانے میں اور خصوصاً ہمارے ملک میں علم کی کسی کو پرواہ نہیں ہے۔ تمام مخلوقات نفسانی خواہشات میں مبتلا اور خداوند تعالیٰ کی رضا وخوشنودی سے روگرداں ہے۔ زمانے کے علماء اور وقت کے مدعی تک راہ راست کے خلاف چل رہے ہیں۔ اس زمانے میں لوگوں نے اپنی خواہشات نفس کا نام شریعت رکھ لیا ہے۔ حب جاہ کا نام عزت، تکبر کا نام علم، دکھاوے کی عبادت کا نام تقویٰ، کینہ کو ظاہر کرنے کے بجائے اس کو دل میں پوشیدہ رکھنے کا نام حلم، مجادلہ ومناظرہ اور نہایت کمینگی کے ساتھ محاربہ کرنے کا نام عظمت، نفاق کا نام زہد، جو منہ میں آئے اسے بک دینے کا نام معرفت، نفسانیت کا نام محبت، الحاد کا نام فقر، جحود (انکارحق) کا نام صفوت، زندیق ہو جانے کا نام فنا اور جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کو ترک کر دینے کا نام طریقت رکھ لیا ہے۔ یہاں تک کہ ارباب معانی (اصل اہل حق) اُن جہلا سے اسی طرح سے مغلوب ہو گئے ہیں جس طرح خلافتِ راشدہ کے سقوط کے بعد اہل بیت رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین پر آلِ مروان نے غلبہ حاصل کر لیا تھا۔ اس بارے میں حضرت ابوبکر واسطی رحمۃ اللہ علیہ نے کیا ہی خوب فرمایا ہے کہ: ''اُبْتُلِیْنَا بِزَمَانٍ لَیْسَ فِیْھَا ذَابُ الْاِسْلَامِ وَلَا اَخْلَاقُ الْجَاھِلِیَّۃِ وَلَا اَحْکَامُ ذِی الْمُرُوْۃِ. یعنی ہم آزمائے گئے ہیں ایسے زمانے کے ساتھ جس کے لوگوں میں نہ اسلام کے آداب ہیں نہ ہی جاہلیت کے اخلاق ہیں اور نہ عام انسانی شرافت کی خصلتیں ہیں۔''

ایسے حالات میں حق جل وعلا کے سوا کون ہے جو اُس چیز کو لانے کا ارادہ اور اس کے اسباب پیدا فرمائے جسے اہل زمانہ کھو چکے ہیں۔ جس کے ارادتمند تک اس کے ظہور پذیر ہونے سے مایوس ہو چکے ہیں اور جس کے عارفین کی معرفت بھی اس کے وجود سے جدا ہو چکی ہے۔

بہر حال پہلا قدم صحیح علم سے شروع ہوتا ہے۔ اس لیے آگے ہم ''علم اور اس کے حصول'' ہی سے آغاز کرتے ہیں۔ **واللہ المستعان وما توفیقی اِلّا باللہ۔**

علم اور اس کے حصول کے بارے میں

علم حاصل کرنا فرض ہے:

دین ہو یا دنیا، علم کے بغیر انسان کچھ بھی نہیں پا سکتا۔ اسی لیے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تاکید فرمائی کہ: ''طَلَبُ الْعِلْمِ فَرِيْضَةٌ عَلٰى كُلِّ مُسْلِمٍ وَمُسْلِمَةٍ [1] یعنی علم حاصل کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے۔'' پھر فرمایا: ''اُطْلُبُوا الْعِلْمَ وَلَوْ كَانَ بِالصِّيْنِ یعنی علم حاصل کرو اگرچہ یہ چین (نہایت دُور دراز ممالک) میں جا کر حاصل کرنا پڑے۔'' قرآن مجید میں اللہ عزّ وجل نے ارشاد فرمایا ہے: ''اِنَّمَا يَخْشَى اللّٰهَ مِنْ عِبَادِهِ الْعُلَمٰٓؤُا (۳۵:۲۸) یعنی خدا کے بندوں میں سے جو علم رکھنے والے ہیں وہی خدا سے ڈرتے ہیں۔'' نیز فرمایا: ''لِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ (۵۵:۴۶) یعنی جو شخص اپنے رب کے حضور پیش ہونے سے ڈرا اس کے لیے دو جنتیں ہیں۔'' گویا خداوند تعالیٰ کا خوف جنت کی کنجی ہے اور یہ خوف علم سے پیدا ہوتا ہے۔

لیکن دین میں جس علم کے حصول کو فرض قرار دیا گیا ہے اُس سے مراد دنیا جہان کے ہر علم کا حصول نہیں ہے۔ کیونکہ دنیا میں تو علم بے شمار ہیں۔ ان سب کا حصول نہ ہر انسان کے لیے ممکن ہے اور نہ اس کے لیے ضروری اور فرض ہے۔ جس علم کا سیکھنا ہر ایک کے لیے فرض قرار دیا گیا ہے وہ خداوند تعالیٰ کی شریعت اور خصوصاً اس کے فرائض و واجبات کا علم ہے۔ اس کے ساتھ دوسرے علوم کا اس حد تک حصول جس حد تک یہ شریعت الٰہی کے احکام اور ان کے مختلف پہلو سمجھنے کے لیے درکار ہوں وہ آپ سے آپ ضروری ہو جاتا ہے۔ مثلاً علم طبیعات، علم حساب، علم جغرافیہ، علم نجوم ہیئت، علم سیاست و اقتصادیات، علم قانون اور علم صنعت و تجارت وغیرہ۔ کیونکہ ان کے کم از کم اصولی علم کے بغیر انسان کی انفرادی و اجتماعی اور عمرانی زندگی کے مسائل کا فہم و ادراک اور ان پر

---

[1] حدیث کے اصل الفاظ میں ''مسلمة'' کا ذکر نہیں ہے (مشکوٰۃ، کتاب العلم)۔ لیکن ''مسلم'' کا لفظ مسلمان مرد اور عورت دونوں پر محیط ہے۔ (مرتب)

اصول شریعت کا انطباق کرنا ممکن نہیں ہے۔ اس سے زائد جس قدر علوم آدمی حاصل کرے وہ مستحسن اور مطلوب ہے لیکن فرض نہیں ہے۔

جہاں تک انسان کے لیے مضر اور نقصان دہ اور غیر نافع علوم کا تعلق ہے ان کی اللہ تعالیٰ نے بھی مذمت فرمائی ہے اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس سے پناہ مانگی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''وَيَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنفَعُهُمْ (۲:۱۰۲) یعنی وہ ان باتوں کو سیکھتے ہیں جو ان کو ضرر پہنچانے والی ہیں اور ان کو کوئی فائدہ پہنچانے والی نہیں ہیں۔'' حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اَللّٰهُمَّ اَعُوْذُبِکَ مِنْ عِلْمٍ لَا يَنْفَعُ یعنی اے اللہ! میں اس علم سے تیری پناہ مانگتا ہوں جو نفع دینے والا نہ ہو۔'' اس لیے ایسے علوم سے الگ رہنا چاہیے۔

علم اور عمل لازم وملزوم ہیں

یاد رکھو کہ علم کے ساتھ عمل ضروری ہے۔ نہ عمل کے بغیر علم نافع ہے اور نہ علم کے بغیر عمل نفع بخش ہے۔ جس علم کی پشت پر عمل موجود نہ ہو وہ علم جہل ہی کے زمرے میں شامل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ''نَبَذَ فَرِيْقٌ مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَاءَ ظُهُوْرِهِمْ كَاَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ (۲:۱۰۱) یعنی اہل کتاب میں سے ایک گروہ نے اللہ کی کتاب کو اس طرح پس پشت ڈال دیا گویا انھیں کچھ علم ہی نہیں ہے۔'' اس سے معلوم ہوا کہ بے عمل عالم اصحاب علم کے زمرے ہی سے خارج ہے، چہ جائیکہ اس علم سے اسے کوئی نفع حاصل ہو۔ اگر عمل کے بغیر مجرد علم کسی درجے میں بھی قابل قدر ہوتا تو اللہ عزّ وجل کی طرف سے یہ نہ فرمایا جاتا کہ: ''لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ٥ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ (۶۱:۲۔۳) یعنی کیوں کہتے ہو وہ باتیں جو کرتے نہیں ہو؟ یاد رکھو کہ اللہ کے نزدیک یہ بات بڑی اشتعال انگیز ہے کہ آدمی کہے اور کرے نہیں۔'' اور حدیث میں ہے:

عَنِ ابْنِ مَسْعُوْدٍ عَنِ النَّبِیِّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا تَزُوْلُ قَدَمَا ابْنِ آدَمَ يَوْمَ الْقِيَامَةِ حَتّٰى يُسْئَلَ عَنْ خَمْسٍ:

(۱) عَنْ عُمُرِهٖ فِیْ اَفْنَاهُ

(۲) وَعَنْ شَبَابِهٖ فِیْ مَا اَبْلَاهُ

(۳/۴) وَعَنْ مَالِهٖ مِنْ اَیْنَ اکْتَسَبَهٗ وَفِیْ مَا اَنْفَقَهٗ

(۵) وَمَا ذَا عَمِلَ فِیْ مَا عَلِمَ. (ترمذی مذکورہ مشکوۃ، کتاب الرّقاق)

''ابن مسعودؓ بیان کرتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ (قیامت کے روز) خدا کی عدالت سے کوئی شخص خلاصی نہ پا سکے گا جب تک کہ اس سے ان پانچ چیزوں کا حساب نہ لے لیا جائے:

(۱) اس کی عمر کے بارے میں کہ اسے اس نے کن کاموں میں کھپایا۔

(۲) اور اس کی جوانی کے بارے میں کہ اس کو اس نے کن مشاغل میں لگایا۔

(۳/۴) اور اُس کے مال کے بارے میں کہ اسے اس نے کن طریقوں سے اور کیسے کمایا اور کیسے اور کہاں خرچ کیا؟

(۵) اور یہ کہ جو علم اسے حاصل تھا اس پر کہاں تک عمل کیا۔''

پس جان لو کہ عمل کے بغیر علم کچھ کام نہ آئے گا۔ اور ابھی جب کہ مہلت کی گھڑی حاصل ہے اس بات پر نگاہ کرو کہ کتنی چیزیں ایسی ہیں جن کو آپ جانتے ہیں کہ وہ اللہ اور اس کے رسولؐ نے آپ کے لیے فرض اور واجب قرار دی ہیں لیکن آپ ان سے غافل ہیں۔ اور اس کے برعکس کتنی چیزیں ایسی ہیں جن کے بارے میں خدا اور اس کے رسولؐ نے وعیدیں سنائیں ہیں اور ان کو ناپسندیدہ قرار دیا ہے اور آپ ان میں مبتلا ہیں۔

جس طرح سے عمل کے بغیر علم نافع نہیں ہے، اسی طرح سے علم کے بغیر عمل بھی نافع نہیں ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اَلْمُتَعَبِّدُ بِلَا فِقْهٍ كَالْحِمَارِ فِی الطَّاحُوْنِ یعنی بے سمجھے عبادت کرنے والا آدمی خراس کے گدھے (کولھو کے بیل) کی مانند ہے''۔ اس سے معلوم ہوا کہ بے سمجھے بوجھے عبادت کرنے والا عابد کے حکم میں داخل نہیں ہے۔ ظاہر بات ہے کہ اگر کوئی شخص صبح سے شام تک فاقے سے رہے، لیکن وہ نہیں جانتا کہ یہ خداوند تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی

حاصل کرنے کا ذریعہ ہے، تو ان میں سے کوئی فعل بھی عبادت میں داخل نہیں ہو گا۔ ان افعال کو عبادت میں داخل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ نہ صرف اسے ان کے خدا کی رضا کے کام ہونے کا علم ہو بلکہ اس کے ساتھ اس کے دل میں ان کو خدا کی عبادت کے طور پر کرنے کی نیت بھی ہو۔

یہی نہیں، بلکہ جب تک انسان اپنے علم پر عامل نہ ہو، اس کے لیے آگے راہ ہی نہیں کھلتی۔ اپنے علم پر جتنا وہ عمل کرتا چلا جائے گا اس کے لیے آگے راہ کھلتی چلی جائے گی۔ اور جہاں وہ ٹھیر جائے گا آگے راستہ بند رہے گا۔ حضرت ابراہیم ادہم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ میں نے ایک پتھر کو راستے میں پڑا دیکھا جس پر لکھا تھا کہ مجھے الٹ کر پڑھو۔ میں نے اسے الٹ کر دیکھا تو دوسری طرف لکھا: ''اَنْتَ لَا تَعْمَلُ بِمَا تَعْلَمُ فَكَيْفَ تَطْلُبُ مَا لَا تَعْلَمُ یعنی جو کچھ تو جانتا ہے اگر اس پر عمل نہیں کرے گا تو تیرے اندر ان باتوں کو جاننے کی طلب کیسے پیدا ہو گی جو تو نہیں جانتا۔''

پس علم اور عمل لازم و ملزوم ہیں۔ ایک طرف علم سے صحیح عمل کی راہ کھلتی ہے اور آدمی کو صحیح اور غلط، اور ناجائز، اور بھلے اور برے میں تمیز حاصل ہوتی ہے۔ دوسری طرف معلوم پر عمل پیرا ہونے سے ہی علم سے نفع اور فیض حاصل ہوتا ہے اور آگے مزید علم کی راہ کھلتی ہے۔

علم کی قسمیں

علم دو ہیں۔ ایک علم خداوند تعالیٰ کا اور دوسرا علم مخلوق کا۔

خداوند تعالیٰ کا علم اس کا اپنا اور اس کی ذاتی صفت ہے اور اس کے ساتھ قائم ہے۔ اس کے علم کی نہ کوئی حد ہے اور نہ انتہا۔ اس سے کوئی شے پوشیدہ نہیں۔ وہ تمام موجودات کو بھی جانتا ہے اور تمام معدومات کو بھی۔ یعنی اسے ان سب چیزوں اور باتوں کا بھی علم ہے جو موجود ہیں اور ان سب کو بھی وہ جانتا ہے جو موجود نہیں ہیں۔ قرآن مجید میں ہے: ''اِنَّ اللّٰـهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ (۲:۲۳۱)(۵:۹۷)(۲۴:۲۹)(۶۴:۱۱) یعنی اللہ ہر شے کا علم رکھتا ہے۔'' نیز فرمایا: ''وَاَنَّ اللّٰـهَ قَدْ اَحَاطَ بِكُلِّ شَيْءٍ عِلْمًا (۶۵:۱۲) یعنی اللہ کا علم ہر شے کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔'' عَالِمُ

الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ (۶:۷۳)(۵۹:۲۲) یعنی وہ سب کچھ جو مخلوق سے پوشیدہ ہے وہ اس کو بھی جانتا ہے اور جو کچھ مخلوق کے لیے ظاہر و معلوم ہے اس کو بھی جانتا ہے۔"

اس کے برعکس مخلوق کا علم سب کا سب خدا کا عطا کردہ ہے اور اس کی ایک حد اور انتہا ہے جو خداوند تعالیٰ کی طرف سے مقرر کی جاتی ہے۔ یہ حاصل بھی ہوتا ہے اور ضائع بھی ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: "وَلَا يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهِ إِلَّا بِمَا شَآءَ (۲:۲۵۵) یعنی بندے اس کے علم میں سے کسی چیز کو اپنے احاطۂ علم میں نہیں لا سکتے مگر اتنا ہی جتنا وہ خود ان کو دینا چاہے۔" اور پھر فرمایا: "وَمَا أُوتِيتُم مِّنَ الْعِلْمِ إِلَّا قَلِيلًا (۱۷:۸۵) یعنی تمہیں بہت تھوڑا علم دیا گیا ہے۔" اور یہ جان لو کہ مخلوقات میں سے کوئی بھی خدا کے ساتھ اس کے سارے علم میں شریک نہیں۔ اس لیے طالب کو چاہیے کہ وہ خداوند تعالیٰ کے عطا کردہ علم و ہدایت کو مشعلِ راہ بنائے اور اپنے تمام اعمال میں اس بات کو سامنے رکھے کہ خدا اسے اور اس کے تمام افعال کو دیکھتا ہے۔

پھر انسان کے علم و عمل کا ایک ظاہر ہے اور ایک ان کا باطن ہے۔ مثلاً کلمہ شہادت کا ظاہر یہ ہے کہ اسے زبان سے ادا کیا جائے اور اس کی صداقت کا اقرار کیا جائے اور اس کا باطن یہ ہے کہ اس کے پسِ پشت حقیقت کی معرفت آدمی کو حاصل ہو اور اس کا دل اس کی تصدیق کرے۔ اسی طرح معاملاتِ زندگی کا ظاہری شکل و صورت ان کا ظاہر ہے اور ان کے پیچھے کارفرما نیت اور ان کا اصل محرک ان کا باطن ہے۔ باطنی حقیقت کی موجودگی کے بغیر محض ظاہر کا اہتمام نفاق ہے اور ظاہری شکل و صورت کے بغیر محض باطن کا دعویٰ صریح بے دینی اور زندقہ ہے۔ اہلِ طریقت باطن کے بغیر ظاہر کو "نقص" اور ظاہر کے بغیر محض باطن کو "ہوس" قرار دیتے ہیں۔ اس لیے طالبِ حق کے لیے ظاہر اور باطن دونوں کی درستی یکساں ضروری ہے۔

فرض علوم

جن علوم کا سیکھنا انسان کے لیے فرض ہے اس کے دو حصے ہیں: ایک علم حقیقت، اور دوسرا علمِ شریعت۔

علمِ حقیقت:

علمِ حقیقت جسے علمِ اصول بھی کہتے ہیں اس کے تین ارکان ہیں:

(۱) خدا کی ذات اور اس کی توحید اور شرک کے حدود کا علم۔

(۲) خدا کی صفات اور اس کے احکام و فرامین کا حکم۔

(۳) خدا کے افعال اور ان کی حکمتوں کا علم۔

خدا کی ذات کا علم یہ ہے کہ ہر عاقل و بالغ یہ جان لے کہ اللہ تعالیٰ موجود ہے، وہ ایک ہے، ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ اس کے واسطے نہ کوئی سمت و جہت مخصوص ہے اور نہ مکان۔ اس کے واسطے نہ زوال ہے اور نہ کوئی حد۔ نہ اس کے کوئی مثل ہے اور نہ مثال اور نہ جنس۔ وہ ہر جگہ موجود ہے اور سب کچھ دیکھتا اور سنتا ہے۔ کسی دل کا کوئی بھید بھی اس سے پوشیدہ نہیں ہے۔ نہ خلق کو پیدا کرنے میں اس کا کوئی شریک ہے، نہ امر و تدبیر میں اور نہ فرمانروائی میں۔ کسی حیثیت سے اور کسی معاملے میں بھی شریک ہونا تو درکنار کسی دوسرے کو اس کی جناب میں دَم مارنے کا بھی یارا نہیں ہے۔ بس وہی ایک خالق اور باقی سب مخلوق ہے۔

خدا کی صفات کا علم یہ ہے کہ اس کی تمام صفات اس کی ذات کے ساتھ قائم اور موجود ہیں اور دائمی ہیں۔ لیکن نہ اس کا جز ہیں اور نہ اس سے علیحدہ ہیں۔ وہ اللہ ہے اور الٰہِ واحد ہے۔ زندۂ جاوید ہے۔ ہر چیز پر قادر اور ہر موجود و معدوم اور ہر غیب و شہادت سے پوری طرح باخبر ہے۔ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ اس کی ہر بات حق، اُس کا ہر حکم شُدنی اور مخلوق کے لیے واجب التعمیل اور واجب الاطاعت ہے۔ دوسرے تمام احکام اور اطاعتیں اس کے احکام اور اطاعت کے تحت ہیں۔ مستقل بالذات اطاعت صرف اسی کا حق ہے۔

خدا کے افعال کا علم یہ ہے کہ تمام مخلوق اور اس کائنات میں جو کچھ ہے سب کا خالق اور پالنہار بھی اللہ تعالیٰ ہے، اور موت و حیات، عروج و زوال، رزق کی کمی بیشی، خیر و شر، خشک و تر اور تمام موجودات اور اس کے سب تغیرات بھی خداوند تعالیٰ کے افعال ہیں۔ اور ان میں سے ہر فعل

اپنے فاعل کی نشاندہی کر رہا ہے۔ اسی لیے فرمایا: ''اَفَلَا یَنۡظُرُوۡنَ اِلَی الۡاِبِلِ کَیۡفَ خُلِقَتۡ ○ وَاِلَی السَّمَآءِ کَیۡفَ رُفِعَتۡ ○ وَاِلَی الۡجِبَالِ کَیۡفَ نُصِبَتۡ ○ وَاِلَی الۡاَرۡضِ کَیۡفَ سُطِحَتۡ ○ (۸۸:۱۷۔۲۰) یعنی کیا یہ لوگ اس پر نظر نہیں کرتے کہ ہم نے اونٹ کو کیسا (موزوں) بنایا؟ آسمان کو کیسا بلند کیا؟ پہاڑوں کو کیسا جما دیا اور زمین کو کیسا بچھا دیا؟۔'' پھر فرمایا: ''اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَاخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَالنَّهَارِ لَاٰیٰتٍ لِّاُولِی الۡاَلۡبَابِ ○ (۳:۱۹۰) یعنی زمین و آسمان کی پیدائش میں اور رات دن کے باری باری سے آنے میں عقل رکھنے والوں کے لیے بہت نشانیاں ہیں۔'' اگر ان کو آنکھیں کھول کر دیکھو اور ان پر غور و فکر کرو تو ان میں سے ہر شے تمھیں اپنے خالق و فاعل اور اس کائنات کے پس پردہ حقیقت کا پتہ دے گی۔

خداوند تعالیٰ کی ذات اور صفات کے بارے میں اس کے حسب ذیل ارشادات خاص طور پر توجہ طلب ہیں:

۱۔ فَاعۡلَمۡ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ. (۴۷:۱۹)

''جان لو کہ اللہ کے سوا کوئی خدا نہیں ہے''۔

۲۔ فَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّ اللّٰهَ مَوۡلٰىكُمۡ. (۸:۴۰)

''خوب جان لو کہ اللہ ہے تمھارا آقا''۔

۳۔ وَاعۡتَصِمُوۡا بِاللّٰهِ هُوَ مَوۡلٰىكُمۡ. (۲۲:۷۸)

''اللہ کا دامن پکڑو، وہ ہے تمھارا آقا۔''

۴۔ اُعۡبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمۡ مِّنۡ اِلٰهٍ غَيۡرُهٗ. (۷:۵۹، ۶۵، ۷۳، ۸۵۔۔۔۔۔۱۱:۵۰، ۶۱، ۸۴۔۔۔۔۔۲۳:۳۲)۔

''اللہ کی بندگی کرو، اس کے سوا تمھارا کوئی خدا نہیں ہے۔''

۵۔ قُلۡ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ ○ اَللّٰهُ الصَّمَدُ ○ لَمۡ یَلِدۡ وَلَمۡ یُوۡلَدۡ ○ وَلَمۡ یَكُنۡ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ○ (۱۱۲:۱تا۴)

''ان کو بتا دو کہ وہی ایک خدا ہے۔ اسے کسی کی حاجت نہیں۔ نہ کوئی اس کا بیٹا ہے

اور نہ باپ اور نہ ہی کوئی اس کا برابر کا ہے۔''

۶۔ مَااتَّخَذَ صَاحِبَةً وَّلَا وَلَدًا. (۳:۷۲)

''نہ اس نے کسی کو اپنی بیوی بنایا اور نہ اپنا بیٹا۔''

۷۔ لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ (۱۱:۴۲)۔

''اس کے مثل کوئی نہیں ہے۔''

۸۔ وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ.

''مشرق و مغرب سب اللہ کے ہیں۔ جدھر تم رُخ کرو گے اسی طرف اللہ کا رُخ ہے۔''

۹۔ لَمْ يَتَّخِذْ وَلَدًا وَّلَمْ يَكُنْ لَّهٗ شَرِيْكٌ فِي الْمُلْكِ.

''نہ اس نے کسی کو بیٹا بنایا اور نہ کوئی بادشاہی میں اس کا شریک ہے۔''

۱۰۔ وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا وَيَخْلُقُ مَا يَشَآءُ ط وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ o

''اللہ ہی بادشاہ ہے آسمانوں اور زمین کا اور ان سب چیزوں کا جو زمین اور آسمانوں کے درمیان پائی جاتی ہیں اور وہ ہر شے پر قادر ہے۔''

۱۱۔ اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ط اَلْحَيُّ الْقَيُّوْمُ ج لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّلَا نَوْمٌ ط لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ط مَنْ ذَا الَّذِيْ يَشْفَعُ عِنْدَهٗ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ط يَعْلَمُ مَا بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يُحِيْطُوْنَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖ اِلَّا بِمَا شَآءَ ط وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ط وَلَا يَئُوْدُهٗ حِفْظُهُمَا ط وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيْمُ o (۲۵۵:۲)

''اللہ، وہ زندۂ جاوید ہستی جو تمام کائنات کو سنبھالے ہوئے ہے اس کے سوا کوئی خدا نہیں ہے۔ وہ نہ سوتا ہے اور نہ اُسے اونگھ لگتی ہے۔ زمین و آسمان میں جو کچھ ہے، اسی کا ہے۔ کون ہے (یعنی کوئی نہیں) جو اس کی جناب میں اس کی اجازت کے بغیر سفارش کر

سکے۔ جو کچھ بندوں کے سامنے ہیں اسے بھی وہ جانتا ہے اور جو کچھ اُن سے اوجھل ہے اس سے بھی وہ واقف ہے۔ اور اس کی معلومات میں سے کوئی چیز ان کے علم میں نہیں آسکتی الّا یہ کہ کسی چیز کا علم وہ خود ہی ان کو دینا چاہے۔ اس کی حکومت آسمانوں اور زمین پر چھائی ہوئی ہے اور اُن کی نگہبانی اس کے لیے کوئی تھکا دینے والا کام نہیں ہے۔ بس وہی ایک بزرگ و برتر ذات ہے۔"

۱۲۔ اَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ. (۷:۵۴)

"خبردار مخلوق بھی اسی کی ہے اور بادشاہی بھی اسی کی۔"

۱۳۔ اِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ (۲:۱۸۱، ۲۲۴،۲۴۴......)

"اللہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔"

۱۴۔ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ. (۵:۷، ۳:۱۱۹)

"اللہ دلوں کے چھپے راز تک جانتا ہے۔"

۱۵۔ فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ (۸۵:۱۶)

"وہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔"

۱۶۔ وَاِذَا قَضٰى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهُ كُنْ فَيَكُوْنُ. (۲:۱۱۷، ۳:۴۷، ۱۹:۳۵، ۴۰:۶۸)

"اور جب وہ کسی بات کا فیصلہ کرتا ہے تو اس کے لیے بس یہ حکم دیتا ہے کہ 'ہو جا' اور وہ ہو جاتی ہے۔"

۱۷۔ قَوْلُهُ الْحَقُّ (۶:۷۳)

"اس کی ہر بات بالکل سچ اور ہو کر رہنے والی ہے۔"

۱۸۔ اِنَّ رَبَّكَ سَرِيْعُ الْعِقَابِ وَاِنَّهُ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ (۶:۱۶۵)۔

"تمھارا رب سزا دینے میں بھی بہت تیز دست ہے اور درگزر فرمانے والا بھی ہے۔"

۱۹۔ اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيْدٌ (۸۵:۱۲)

''تیرے رب کی پکڑ بڑی سخت ہے۔''

۲۰۔ وَهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ (۱۲:۶۴)

''اور وہ سب رحم کرنے والوں سے بڑھ کر رحم فرمانے والا ہے۔''

۲۱۔ وَهُوَ الْغَفُوْرُ الْوَدُوْدُ (۸۵:۱۴)

''اور وہ بڑا ہی بخشنے والا اور (اپنی مخلوق سے) محبت کرنے والا ہے۔''

علم شریعت:

علمِ شریعت کے بھی تین ارکان ہیں:

۱۔ خدا کی کتاب

۲۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت

۳۔ اجماعِ امت

شریعت کا رکنِ اوّل خدا کی کتاب کی آیات محکمات ہیں۔ ان سے مراد عقاید، فرائض اور امر ونہی سے متعلق وہ آیات ہیں جن کے معنی ومفہوم اور مدعا ومقصود متعین کرنے میں اشتباہ کی گنجائش نہیں ہے۔ چنانچہ اللہ عزّ وجل نے فرمایا: ''مِنْهُ اٰيٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ (۳:۷) یعنی اس میں ایک تو آیاتِ محکمات ہیں جو کتاب کی اصل بنیاد ہیں اور دوسری متشابہات (جن کے مفہوم میں اشتباہ کی گنجائش ہے)''۔ جہاں اور جس مسئلہ میں کوئی اشتباہ یا اختلاف پیدا ہوا سے ان محکمات کی کسوٹی پر رکھ کر دیکھنا چاہیے کہ اُن سے اقرب اور زیادہ مطابقت رکھنے والی کون سی شکل ہے۔ صحیح صورت وہی ہوگی جو محکمات سے اقرب اور ان کے پیش کردہ تصوّرِ دین سے زیادہ مطابق ہوگی۔

شریعت کا دوسرا رُکن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت یعنی آپؐ کا طریقہ ہے۔ خداوند تعالیٰ کے احکام اور ان کے ٹھیک منشاء ومفہوم کو جاننے کا انسانوں کے پاس واحد مستند ذریعہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے۔ اور آپؐ کی ذات سے مراد آپؐ کے فرمودات وتقاریر اور

آپؐ کے افعال ہیں جو اللہ عزّ وجل نے اپنی کمال مہربانی سے احادیث اور سیرت کی کتب میں محفوظ کرادیے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ''وَمَآ اٰتٰکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰکُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا (۵۹:۷) یعنی جو کچھ خدا کا رسول تمہیں دے اسے لے لو اور جس سے تمہیں منع کرے اُس سے رُک جاؤ۔'' نیز فرمایا: ''لَقَدْ کَانَ لَکُمْ فِیْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ (۳۳:۲۱) یعنی تمہارے لیے ہر معاملہ میں رسول کی زندگی میں بہترین نمونہ موجود ہے۔'' پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا: ''قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰهُ وَیَغْفِرْ لَکُمْ ذُنُوْبَکُمْ (۳:۳۱) یعنی اے پیغمبرؐ! لوگوں سے کہہ دو کہ اگر تم حقیقت میں اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی اختیار کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہاری خطائیں بخش دے گا۔''

شریعت کا تیسرا رُکن اجماعِ اُمّت ہے۔ اس کے رُکنِ شریعت ہونے کی بنیاد حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے کہ: ''لَا تَجْتَمِعُ اُمَّتِیْ عَلَی الضَّلَالَةِ، عَلَیْکُمْ بِالسَّوَادِ الْاَعْظَمِ، یعنی میری امت کبھی گمراہی پر جمع نہیں ہوگی۔ تم سوادِ اعظم کے ساتھ رہنا۔'' اور قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''وَمَنْ یُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَیَّنَ لَهُ الْهُدٰی وَیَتَّبِعْ غَیْرَ سَبِیْلِ الْمُؤْمِنِیْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰی وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ (۴:۱۱۵) یعنی راہِ راست واضح ہو جانے کے بعد جو رسول کی مخالفت کرے اور اہلِ ایمان کی راہ کے سوا کسی اور راہ پر چلے تو اسے ہم اسی راہ پر چلائیں گے جدھر وہ خود پھر گیا اور اسے جہنم میں جھونکیں گے۔'' ظاہر بات ہے کہ ''سَبِیْلُ الْمُؤْمِنِیْنَ'' سے مراد اسلام کی وہ راہ ہے جس پر اہلِ ایمان کے تمام اہلِ علم یا ان کی اکثریت متفق ہو یعنی جس پر ان کا اجماع ہو۔[1]

---

[1] امام شافعیؒ کے نزدیک ''اجماع'' اس چیز کا نام ہے کہ ''ایک مسئلے میں تمام اہلِ علم متفق ہوں اور کوئی ایک قول بھی اس کے خلاف نہ پایا جاتا ہو۔'' اور ابن جریر طبری اور ابوبکر رازی کی اصطلاح میں اکثریت کا قول بھی ''اجماع'' ہے۔ امام احمدؒ جب کسی مسئلے میں یہ کہتے ہیں کہ ''ہمارے علم میں اس کے خلاف کوئی قول نہیں ہے'' تو اس کا مطلب یہ لیا جاتا ہے کہ امام موصوف کے نزدیک اس مسئلہ میں اجماع ہے۔ (اسلامی ریاست از مولانا مودودیؒ ص ۲۵۸۔۲۸۹) (مرتب)

علم کے ساتھ فکر کی ضرورت اور اہمیت:

علم کے ساتھ فکر بھی ضروری چیز ہے۔ کیونکہ فکر اور تدبر کے بغیر نہ تو آدمی کے اندر صحیح فہم پیدا ہوتا ہے اور نہ اس کے بغیر علم آدمی کی زندگی پر کوئی گہرا اور دیرپا اثر ڈال سکتا ہے۔ چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تَفَكُّرُ سَاعَةٍ خَيْرٌ مِّنْ عِبَادَةِ سِتِّيْنَ سَنَةً یعنی ایک گھڑی فکر وتدبر کرنا ساٹھ برس کی (نفل) عبادت سے بہتر ہے۔''

انسانی علم کی حد:

کوئی شخص یا ساری دنیا کے لوگ مل کر بھی اپنے اور دوسرے انسانوں کے نزدیک علم میں خواہ کتنا ہی کمال حاصل کرلیں، لیکن ان کے اس علم کی ایک حد ہے، اور اصل علم جو صرف خدا کے پاس ہے اس کے مقابلہ میں اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ انسانی علم کا تو یہ حال ہے کہ تمام انسان مل کر بھی خدا کی کائنات کے ایک ذرّے تک کے بارے میں پورا علم رکھنے کا دعویٰ نہیں کر سکتے۔ انسانی علم کا اصل کمال یہی ہے کہ وہ یہ جان لے کہ فی الحقیقت وہ کچھ نہیں جانتا۔ جیسا کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ سے عرض کیا: ''لَا اُحْصِیْ ثَنَاءً عَلَيْكَ یعنی خدایا! میں تیری صفت بیان کرنے سے قاصر ہوں۔'' اللہ تعالیٰ نے تو صرف اپنی نعمتوں اور کلمات کے بارے میں فرمایا ہے: ''وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا (۳۴:۱۴۔۱۸:۱۶) یعنی اگر تم اللہ کی نعمتوں کو صرف شمار کرنے لگو تو ان کو شمار نہیں کر سکتے۔'' اور ''لَوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّیْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا (۱۰۹:۱۸) یعنی اگر میرے رب کے کلمات کو لکھنے کے لیے تمام سمندر سیاہی بن جائیں تو یہ سمندر ختم ہو جائیں گے مگر میرے رب کے کلمات ختم نہیں ہوں گے۔ خواہ ان کے ساتھ اتنے ہی سمندروں کی اور بھی سیاہی کیوں نہ بنالی جائے۔''[1]

---

[1] دراصل اپنے علم کے زعم میں مبتلا ہی وہ شخص ہوتا ہے جو خدا اور اس کی بے پایاں کائنات کے تصور تک سے نابلد ہو۔ ورنہ کوئی ایسا شخص اپنے عجز کا اظہار کیے بغیر نہیں رہ سکتا جو صرف اتنا بھی جانتا ہو کہ جس زمین کے ذرا ذرا سے ٹکڑوں پر اپنا حکم چلتا دیکھ کر بعض نادان لوگ اپنے آپ کو خدا کی اختیارات کے مالک سمجھنا شروع کر دیتے ہیں، وہ پوری زمین ایک ایسی کائنات کے ایک گوشے میں گھومنے والی ذرا سی گیند ہے، جس کی وسعت کا اندازہ تو در کنار اس کا تصور کرنے سے بھی (بقیہ حواشی اگلے صفحے پر ملاحظہ فرمائیں)

صحیح علم اور ادراک کا زندگی پر اثر:

حضرت حاتم رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ جب سے میں نے چار علموں کو حاصل کر لیا ہے اس وقت سے میں دوسرے تمام علوم واذکار سے فارغ ہو گیا ہوں۔ لوگوں نے پوچھا کہ وہ چار علم کون سے ہیں؟ آپؒ نے فرمایا:

(۱) جب سے مجھے یہ علم ہو گیا ہے کہ میرا رزق میرے لیے علیحدہ کر کے رکھ لیا گیا ہے جو کسی صورت میں بھی کم وبیش نہیں ہو سکتا، اس وقت سے میں غمِ روزگار یعنی رزق زیادہ طلب کرنے کی فکر سے آزاد ہو گیا ہوں۔

(۲) جب سے میں نے یہ جان لیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا مجھ پر ایک حق ہے جس کو میرے سوا میری طرف سے کوئی اور اَدا نہیں کر سکتا، اس وقت سے میں اس حق کو اَدا کرنے میں مشغول ہو گیا ہوں۔

(۳)۔ جب سے مجھے یہ یقین حاصل ہو گیا ہے کہ میرے سر پر موت سوار ہے اور اس سے میں کہیں بھاگ نہیں سکتا، میں نے اس سے سازگاری کر لی ہے۔ اور

(بقیہ حواشی گزشتہ صفحہ):

انسانی دماغ عاجز ہے۔ خدا کی اس کائنات کی صرف وسعت کا کچھ تصور اس امر سے کیا جا سکتا ہے کہ اجرامِ فلکی کے ایک مجموعہ سے جو ہمارے سورج سے تیس (۳۰) لاکھ گناہ زیادہ روشن ہے، آغاز آفرینش کے وقت سے اس سے نکلی ہوئی روشنی پہلی مرتبہ ۱۹۵۰ء میں ہماری زمین پر پہنچی ہے۔ یہاں یہ بھی یاد رہے کہ روشنی ایک سیکنڈ میں ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل کی رفتار سے دوڑتی ہے۔ گویا ستاروں کا یہ مجموعہ ہماری اس زمین سے اتنی دور ہے کہ اس کائنات کی پیدائش کے وقت سے چلی ہوئی روشنی کی شعاعیں ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سیکنڈ کی رفتار سے دوڑتی ہوئی ۱۹۵۰ء میں زمین پر پہنچی ہیں، اور بے شمار ستارے اور دوسرے اجرامِ فلکی ایسے ہیں جن سے چلی ہوئی روشنی کی کوئی کرن ابھی زمین تک نہیں پہنچ سکی۔

اب غور کیجئے کہ اس بے پایاں کائنات کے اندر اگر کسی شخص نے موٹر یا ہوائی جہاز یا ریڈیو یا ایٹم بنا لیا یا اپنے قریب ترین ہمسایہ چاند جس کی روشنی ڈیڑھ دو سیکنڈ میں ہم تک پہنچ جاتی ہے اس کے گھر میں کوئی ڈھیلا پھینک دیا تو خدا کی کائنات میں اس کی اس سے زیادہ کیا حیثیت ہے کہ کسی شخص نے اپنے صحن سے ایک ٹھیکری اٹھا کر دیوار کے اُس پار گلی میں پھینک دی یا لاہور کے کسی شہری کو لاکھوں برس لاہور میں رہنے کے بعد معلوم ہو گیا کہ راوی کے اُس پار نور جہاں اور جہانگیر کی قبریں ہیں۔ جس خدا کی کائنات کے سب سے چھوٹے ذرّے (ایٹم) میں بھری ہوئی قوت کا یہ عالم ہے کہ تمام اہلِ دنیا اس کے خوف سے لرز رہے ہیں، اس کی اپنی قوت اور طاقت کا کیا کہنا۔ یہی وجہ ہے کہ اسحاق نیوٹن جو دنیا کا سب سے بڑا نہیں تو چند بڑے علمائے سائنس میں سے ایک ہے، اپنے علم کی انتہا کو پہنچ کر بے اختیار بول اٹھا کہ "میری حیثیت اس بچے سے زیادہ نہیں ہے جو سمندر کے کنارے کچھ گھونگے جمع کر کے خوش ہو رہا ہو۔" (مرتب)

(۴)۔ جب سے میں نے یہ جان لیا ہے کہ میرا ایک خدا ہے جو میرے تمام افعال کی خبر رکھتا ہے تو میں نے ایسی تمام باتوں سے ہاتھ کھینچ لیا ہے جن کے ارتکاب سے قیامت کے روز مجھے اس کے روبرو نادم اور شرمسار ہونا پڑے۔

اور حکایتوں میں بیان کرتے ہیں کہ بصرہ کا ایک رئیس اپنے باغ میں گیا اور اس کی نظر اپنے سُنار کی حسین بیوی پر پڑی۔ رئیس نے سُنار کو تو کسی کام کے لیے باہر بھیج دیا اور اس کی عورت کو حکم دیا کہ گھر کے تمام دروازے بند کر دو۔ اس عورت نے کہا کہ میں اور تمام دروازے تو بند کر سکتی ہوں لیکن ایک دروازہ بند نہیں کر سکتی۔ رئیس نے دریافت کیا کہ وہ کونسا دروازہ ہے جسے تو بند نہیں کر سکتی؟ عورت نے جواب دیا کہ جس دروازہ سے ہمارا خدا ہمیں دیکھ رہا ہے۔ عورت کی یہ بات سن کر وہ رئیس سخت نادم ہوا۔ اپنے ارادۂ بد سے اس نے توبہ کی اور اس عورت سے معافی مانگی۔

قابلِ اجتناب پیشوا:

حضرت شیخ المشائخ یحیٰی بن معاذ رازی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: ''اِجْتَنِبْ صُحْبَةَ ثَلَاثَةِ اَصْنَافٍ مِّنَ النَّاسِ: اَلْعُلَمَاءِ الْغَافِلِيْنَ وَالْفُقَرَاءِ الْمُدَاهِنِيْنَ وَالْمُتَصَوِّفَةِ الْجَاهِلِيْنَ. یعنی تین قسم کے لوگوں سے بچو: ایک غافل علماء سے، دوسرے چکنے چپڑے اور دکھاوے کے فقراء سے اور تیسرے جاہل صوفیوں سے۔''

غافل علماء وہ ہیں جنھوں نے حصولِ دنیا کو اپنا قبلۂ مقصود بنا رکھا ہے۔ ظالم حکمرانوں کے درباروں کا طواف کرتے رہتے ہیں۔ خدا کے بجائے مخلوق سے عزت و مرتبہ کی طلب رکھتے ہیں۔ بزرگانِ دین اور دوسرے اہلِ علم کی تحقیر کرتے ہیں اور حسد اور عناد کو اپنا مذہب بنائے ہوئے ہیں۔

مکّار اور دکھاوے کے فقراء وہ ہیں جنھوں نے ظاہر میں فقیری کا روپ بنا رکھا ہے۔ باطن میں حرص کے بندے ہیں۔ جب کوئی شخص کوئی کام ان کی خواہش کے مطابق کرتا ہے تو خواہ وہ باطل ہی کیوں نہ ہو، وہ اس کی تعریف کرتے ہیں اور جب کوئی شخص کوئی کام ان کی خواہش کے خلاف کرتا ہے تو خواہ وہ حق ہی کیوں نہ ہو، وہ اس کی مذمت کرتے ہیں۔ اور مخلوقات کو حق کے

بجائے باطل کی تعلیم دیتے ہیں اور اپنا شکار بناتے ہیں۔

جاہل صوفی وہ ہوتا ہے کہ جس نے نہ کسی بزرگ کی صحبت اختیار کی، نہ کہیں سے تربیت حاصل کی اور نہ اسے حق اور باطل کی تمیز ہو، بلکہ یونہی اپنے آپ کو لوگوں میں صوفی مشہور کر دیا ہو۔

محض علم ہدایت کے لیے کافی نہیں ہے:

یہ بھی یاد رکھو کہ محض علم آدمی کی ہدایت کے لیے کافی نہیں ہے۔ حقیقت اور شریعت کے علوم ہدایت کا ذریعہ ہیں اور انسان کے تجرباتی علوم اس میں مددگار ہوتے ہیں۔ طلب ہدایت کے لیے ان علوم کا حاصل کرنا ضروری ہے۔ مگر ہدایت اللہ تعالیٰ کی عنایت اور عطا سے حاصل ہوتی ہے۔ اس لیے حصولِ علم کے ساتھ اخلاص اور تضرّع کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع اور اس سے ہدایت کی مخلصانہ طلب ضروری ہے۔ کوئی عالم ہو یا صوفی یا فقیر، شریعت کا علم سب کے لیے لازم ہے۔ شریعت کے علم کے بغیر نہ کوئی عالم کہلا سکتا ہے اور نہ صوفی نہ فقیر، اور نہ ان میں سے کسی چیز کا وہ دعویٰ کر سکتا ہے۔

☆☆☆☆☆

فقر کے بارے میں

فقر کا مرتبہ اور اس کی حقیقت:

خدا کے ہاں فقیری اور درویشی کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دعا فرمایا کرتے ہیں: ''اَللّٰهُمَّ اَحْيِنِیْ مِسْكِيْنًا وَّاَمِتْنِیْ مِسْكِيْنًا وَّاحْشُرْنِیْ فِیْ زُمْرَةِ الْمَسَاكِيْنِ یعنی اے میرے اللہ! مجھے فقیری کی حالت میں زندہ رکھ، فقیری کی حالت میں موت دے اور فقراء کے زمرے ہی میں میرا حشر فرما۔'' حضورؐ نے فرمایا کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ فرمائے گا: ''اِئْتُوْا مِنِّیْ اَحِبَّائِیْ فَيَقُوْلُ لَمَلٰئِكَةُ مَنْ اَحِبَّاءُ كَ؟ فَيَقُوْلُ اللّٰهُ اَلْفُقَرَاءُ وَالْمَسَاكِيْنُ یعنی اللہ تعالیٰ حکم دے گا کہ میرے دوستوں کو میرے پاس لاؤ۔ فرشتے پوچھیں گے کہ آپ کے دوست کون ہیں؟ اللہ تعالیٰ فرمائے گا فقراء اور مساکین۔''

لیکن فقراء اور مساکین سے مراد وہ لوگ ہیں جو خدا پر بھروسہ کر کے دنیا کمانے کی فکر سے بے نیاز ہو کر اپنے آپ کو خدا کے کام اور اس کی ملازمت کے لیے وقف کر دیں۔ جیسے کہ اصحابِ صُفّہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم ہر وقت مسجد نبوی میں حاضر رہتے تھے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جس وقت جو کام چاہیں ان سے لے سکیں۔ یہ لوگ ظاہری اور باطنی تمام اسباب کو نظر انداز کر کے خدا کی طرف رجوع کرتے ہیں اور اسی کی ذات کے ساتھ دوستی اور محبت اور بھروسہ کرتے ہیں۔ یہ اس کی ذات کے سوا کسی کو دوست نہیں بناتے۔ اسی طرح کے لوگوں کے بارے میں یہ ارشاد ہوا کہ: ''لِلْفُقَرَاءِ الَّذِيْنَ اُحْصِرُوْا فِیْ سَبِيْلِ اللّٰهِ لَا يَسْتَطِيْعُوْنَ ضَرْبًا فِی الْاَرْضِ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِيَاءَ مِنَ التَّعَفُّفِ (۲:۲۷۳) یعنی تمہاری فی سبیل اللہ امداد اور خدمت کے حقدار وہ فقراء ہیں جو خدا کے کام میں اس طرح سے گھر گئے ہیں کہ چل پھر کر اپنی روزی کے لیے دوڑ

دھوپ نہیں کر سکتے اور ان کی خودداری کو دیکھ کر ایک ناواقف آدمی یہ خیال کرتا ہے کہ وہ مال دار ہیں۔''انہی لوگوں کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا کہ:''وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدَاةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ (۶:۵۲) اے نبیؐ! ان لوگوں کو اپنے سے دُور نہ پھینکو جو رات دن اپنے رب کو پکارتے رہتے ہیں اور اس کی رضا کے طلبگار ہیں۔''

فقر کی اصل متاع دنیا کا ترک اور اس سے علیحدگی نہیں ہے، بلکہ دل کو اس کی محبت سے خالی اور بے نیاز کرنا ہے۔ چنانچہ تصوف کی اصطلاح میں فقیر وہ ہوتا ہے جو متاع دنیا سے بالکل بے نیاز ہو۔ اس کے پاس خواہ سرے سے کچھ موجود نہ ہو یا اسکے پاس دنیا کے سارے اسباب موجود ہوں، دونوں میں سے کسی حالت میں اس کی کسی چیز میں خلل نہ آئے۔ نہ کسی چیز کے نہ ہونے سے اسے کوئی پریشانی لاحق ہو اور نہ سارے اسباب موجود ہونے سے وہ اپنے آپ کو غنی اور دولت مند محسوس کرے۔ گویا دنیا کی کسی متاع کا ہونا اور نہ ہونا اس کے نزدیک یکساں ہو، بلکہ تنگ دستی اور افلاس کی صورت میں وہ زیادہ خوش ہو۔ کیونکہ فقیر جس قدر تنگ دست ہو ٹھیک ہے کہ اس صورت میں اس پر حال کا انکشاف زیادہ ہوگا اور اس پر غفلت کم طاری ہوگی۔ چنانچہ حضور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی فرمایا:''بَطْنٌ جَائِعٌ اَحَبُّ اِلَى اللّٰهِ مِنْ سَبْعِيْنَ عَابِدًا عَاقِلًا یعنی بھوکے پیٹ رہنے والا خدا کے نزدیک ستر صاحب عقل عابدوں سے زیادہ محبوب ہے۔'' نیز یہ کہ:''اَلْجُوْعُ طَعَامُ اللّٰهِ فِى الْاَرْضِ یعنی بھوک اس دنیا میں خدا کی غذا ہے۔''

اصلی فقیر:

ایک شیخ فرماتے ہیں کہ:''لَيْسَ الْفَقِيْرُ مَنْ خَلَا مِنَ الزَّادِ اِنَّمَا الْفَقِيْرُ مَنْ خَلَا مِنَ الْمُرَادِ، یعنی فقیر وہ نہیں ہوتا جو زادِ راہ اور متاع دنیا سے خالی ہاتھ ہو۔ اصل فقیر وہ ہے جو مراد (طلب دنیا) اور حرص سے خالی ہو''۔ اور حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:''اَلْفَقِيْرُ مَنْ لَا يَسْتَغْنِىْ بِشَيْئٍ دُوْنَ اللّٰهِ یعنی فقیر وہ ہے جسے اللہ عزوجل کے سوا کسی اور چیز سے چین نہ آئے'' اور حضرت رویم بن محمد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: مِنْ نَعْتِ الْفَقِيْرِ حِفْظُ سِرِّهٖ وَصِيَانَةُ نَفْسِهٖ وَاَدَاءُ فَرِيْضَتِهٖ یعنی فقیر کی صفت یہ ہے کہ وہ اپنے بھید کی حفاظت کرے اور اپنے نفس پر نگاہ رکھے

اور اسے آفتوں سے بچائے اور خداوند تعالیٰ کے عائد کردہ فرائض کو ادا کرے۔

پس ذات خداوندی کے ماسوا تمام چیزوں سے دل کو فارغ رکھنے کا نام فقر ہے۔ فقیر کی اصل عزت یہ ہے کہ اس کے تمام اعضاء و جوارح خدا کی نافرمانی سے محفوظ ہوں اور ان کو وہ تمام نامناسب چیزوں سے بچائے رکھے۔ وہ کسی معصیت میں مبتلا نہ ہو یہاں تک کہ اس کا بدن روحانی اور اس کا دل ربانی ہو جائے۔

فقر اور غناء اور ان کے بارے میں صحیح روش:

مشائخ رحمہم اللہ میں اس بارے میں اختلاف ہے کہ فقر اور غنا کی حالتوں میں سے افضل حالت کون سی ہے۔ لیکن میں علی بن عثمان جلابی کہتا ہوں کہ یہ ایک بیکار بحث ہے۔ ''غنی'' خدا کا نام ہے اور وہی اس کا سزاوار ہے۔ مخلوقات فی الحقیقت اس نام کی مستحق نہیں ہو سکتی۔ انسان تو پیدا ہی محتاج اور فقیر ہوا ہے، اس لیے اس کے لیے فقر کا نام ہی سزاوار ہے۔ ہاں خدا کے ماسوا کسی اور کو مجازاً غنی کہہ دیا جائے تو جائز ہے۔ خداوند تعالیٰ اپنی ذات سے غنی ہے۔ وہ مسبب الاسباب ہے۔ اس کے غنا کے لیے نہ کوئی سبب ہے اور نہ اس کے لیے کسی سبب کی ضرورت ہے۔ بندے کو جو غنا حاصل ہوتا ہے وہ خدا کا عطا کردہ اور اسباب کا رہینِ منت ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ''يَآاَيُّهَا النَّاسُ اَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ اِلَى اللّٰهِ وَاللّٰهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ (۳۵:۱۵) یعنی اے لوگو! تم سب خدا کے محتاج اور فقیر ہو اور خدا جو ہے وہی حقیقتاً غنی اور حمید ہے۔'' دوسری جگہ فرمایا: ''وَاللّٰهُ الْغَنِيُّ وَاَنْتُمُ الْفُقَرَآءُ (۴۷:۳۸) یعنی اللہ ہی غنی ہے، تم سب محتاج اور فقیر ہو۔''

پس بندہ پیدائشی محتاج اور فقیر ہے۔ اگر اس پر غناء کی حالت کسی درجہ میں آتی ہے تو وہ اللہ کی عطا اور بخشش سے آتی ہے۔ ''اَلْغَنِيُّ مَنْ اَغْنَاهُ اللّٰهُ یعنی غنی وہ ہے جسے اللہ تعالیٰ غنی کرے۔'' اور جب وہ چاہتا ہے غنا کو فقر سے اور فقر کو غنا سے بدل دیتا ہے۔

چونکہ یہ جہان ابتلاء اور آزمائش کا محل ہے، اس لیے اس جہان میں غنا کی حالت ہو یا فقر کی، دونوں انسان کے لیے ابتلاء اور آزمائش ہی کی صورتیں ہیں۔ انسان کو فقر کی حالت میں صبر

کرنا چاہیے اور غنا کی حالت میں شکر کی روش اختیار کرنی چاہیے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ایوب علیہ السلام کو فقر اور مصیبت کی حالت میں شدتِ صبر کی بدولت نعم العبد قرار دیا (۳۸:۴۴)، اور حضرت سلیمان علیہ السلام کو شکرِ نعمت کی بدولت نعم العبد فرمایا (۳۸:۳۰)۔ گویا صبرِ ایوب علیہ السلام اور شکرِ سلیمان دونوں بارگاہِ الٰہی میں ایک درجہ میں ہیں۔ ورنہ متاعِ دنیا سے خالی ہاتھ ہونا جہاں خدا کی طرف رجوع اور تضرّع کا سبب ہو سکتا ہے، وہاں اُس سے روگردانی کا سبب بھی بن سکتا ہے۔ جیسا کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کَادَ الْفَقْرُ اَنْ یَّکُوْنَ کُفْرًا یعنی اندیشہ ہے کہ متاعِ دنیا سے محرومی کفر کی صورت نہ اختیار کر لے۔'' اس لیے صحیح صورت یہ ہے کہ جس حال میں مالک رکھے اس پر قانع اور اس کی بندگی واطاعت کی راہ پر قائم رہنا چاہیے۔ غنا بھی خدا کی نعمت ہے۔ اس میں غفلت کرنی آفت ہے، اور فقر بھی خدا کی نعمت ہے اس میں حرص اور بے صبری میں مبتلا ہونا آفت ہے۔ میرے استاد حضرت ابوالقاسم قُشَیری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: ''لوگوں نے فقر اور غنا کے بارے میں بحثیں کی ہیں اور اپنا اپنا ایک نہ ایک مذہب مقرر کر لیا ہے۔ مجھے اگر خداوند تعالیٰ غنی کرے تو میں غافل ہونے کے بجائے اس کا شکر ادا کروں گا اور اگر وہ مجھے فقیر بنا دے تو حریص اور اس سے منہ پھیرنے والا بننے کے بجائے صبر کروں گا۔''

مصنوعی فقر:

مخلوقات میں سے وہ شخص بہت کمینہ اور رذیل ہے جو درحقیقت تو خدا کا فقیر نہ ہو لیکن لوگ اسے ایسا سمجھیں اور وہ خود بھی اپنے آپ کو ایسا ظاہر کرے اور اس طرح لوگوں میں عزت اور مقبولیت حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ جو چیز بندے کو خدا سے دُور اور غائب کرے وہ عزت نہیں بلکہ بدترین قسم کی ذلت ہے۔ مشائخ رحمہم اللہ نے ہمیشہ مریدوں کو اس صورتِ حال سے متنبہ کیا ہے۔ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ درویشوں کو نصیحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں: ''یَامَعْشَرَ الْفُقَرَاءِ اِنَّکُمْ تُعْرَفُوْنَ بِاللّٰهِ وَتُکْرَمُوْنَ لِلّٰهِ فَانْظُرُوْا کَیْفَ تَکُوْنُوْنَ مَعَ اللّٰهِ اِذَا خَلَوْتُمْ بِهٖ. یعنی اے درویشوں کے گروہ کے لوگو! تم لوگوں میں اللہ والوں کی حیثیت سے

جانے جاتے ہو اور اللہ سے تعلق رکھنے کی بنا پر ہی تعظیم کیے جاتے ہو، جب تم اللہ کے ساتھ تنہائی میں ہو اس وقت اپنا جائزہ لیا کرو کہ خدا کے ساتھ تمہارے تعلق کا فی الواقع کیا حال ہے۔'' شیخ ابو سعید رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ''اَلْفَقِیْرُ ھُوَ الْغَنِیُّ بِاللّٰہِ یعنی اصل فقیر وہ ہے جو اللہ کے ساتھ غنی ہو۔'' جب اسے خداوند تعالیٰ مل جائے تو پھر اور کسی شے کی اسے حاجت نہ رہے اور وہ نہ ہو تو اسے چین نہ آئے۔

☆☆☆☆☆

تصوّف کے بارے میں

تصوف کی حقیقت: خُلُق

حضرت محمد بن علی بن حسین بن ابی طالب رضی اللہ تعالیٰ عنہم فرماتے ہیں: ''اَلتَّصَوُّفُ خُلُقٌ فَمَنْ زَادَ عَلَیْکَ فِی الْخُلُقِ زَادَ عَلَیْکَ فِی التَّصَوُّفِ یعنی تصوف نیک خوئی کا نام ہے، جتنا کوئی شخص نیک خوئی میں بڑھا ہوا ہوگا، اتنا ہی تصوف میں بڑھ کر ہوگا۔''

اخلاق کے دو اجزاء:

اور اخلاق (نیک خوئی) کے دو اجزاء ہیں۔ ایک خالق کے ساتھ اخلاق، اور دوسرا مخلوق کے ساتھ اخلاق۔

(۱) خدا کے ساتھ اخلاق اور نیک خوئی برتنے کا مطلب یہ ہے کہ بندہ اس کی قضا پر راضی ہو۔ اس کے کسی فیصلے پر اسے شکایت نہ پیدا ہو۔ اس کا ہر فیصلہ اسے بسر وچشم اور سر بسر تسلیم ہو۔

(۲) مخلوق کے ساتھ اخلاق اور نیک خوئی یہ ہے کہ مخلوق کے ساتھ اس کے تعلق سے جو ذمہ داریاں اس پر عاید ہوتی ہیں ان کو خدا کے لیے اٹھائے اور خدا ہی کی رضا جوئی اور خوشنودی کے لیے ان کو ادا کرے۔ اس کام میں کوئی اور غرض اس کے سامنے نہ ہو۔

حضرت مرتعش رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ تصوف نیک خُلُق کا نام ہے، (اَلتَّصَوُّفُ حُسْنُ الْخُلُقِ) اور اس کی تین قسمیں ہیں:

ایک خدائے بزرگ وبرتر کے ساتھ نیک خُلقی، جس کا مطلب اس کے تمام احکام کی سرِ مو ریا کے بغیر اور پورے اخلاص کے ساتھ تعمیل اور اطاعت ہے۔

دوسرے مخلوقات کے ساتھ نیک خُلقی، جس کے معنی اپنے سے بزرگوں کے ساتھ عزت،

اپنے سے چھوٹوں کے ساتھ شفقت اور اپنے ہم رتبہ لوگوں کے ساتھ برابری اور مساوات کا برتاؤ کرنا ہے اور اس کے بدلے میں کسی بدلے کی خواہش نہ رکھنا ہے۔

تیسرے قسم نیک خُلقی کی یہ ہے کہ شیطان اور خواہشات نفسانی کی پیروی ہرگز نہ کی جائے۔

حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''اَلتَّصَوُّفُ مَبْنِیٌّ عَلٰی ثَمَانِ خِصَالٍ: اَلسَّخَاءُ وَالرِّضَاءُ وَالصَّبْرُ وَالْاِشَارَةُ وَالْغُرْبَةُ وَلَبْسُ الصُّوْفِ وَالسِّیَاحَةُ وَالْفَقْرُ. اَمَّا السَّخَاءُ فَلِاِبْرَاهِیْمَ وَاَمَّا الرِّضَاءُ فَلِاِسْمٰعِیْلَ وَاَمَّا الصَّبْرُ فَلِاَیُّوْبَ وَاَمَّا الْاِشَارَةُ فَلِزَكَرِیَّا وَاَمَّا الْغُرْبَةُ فَلِیَحْیٰی وَاَمَّا لَبْسُ الصُّوْفِ فَلِمُوْسٰی وَاَمَّا السِّیَاحَةُ فَلِعِیْسٰی وَاَمَّا الْفَقْرُ فَلِمُحَمَّدٍ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ وَعَلَیْهِمْ اَجْمَعِیْنَ. یعنی یہ کہ تصوف کی آٹھ خصلتیں ہیں: ا۔ سخاوت، ۲۔ رضا، ۳۔ صبر، ۴۔ اشارت، ۵۔ غربت، (اجنبی ہو جانا)، ۶۔ لباس صوف، ۷۔ سیاحت، اور ۸۔ فقر۔ سخاوت کا نمونہ حضرت ابراہیمؑ ہیں کہ انھوں نے اپنی جان سے لے کر اپنے بیٹے تک سب کو خدا کی راہ میں قربان کر دیا۔ رضا کا نمونہ حضرت اسمٰعیل ہیں کہ رضا الٰہی کے آگے بسر وچشم اپنے آپ کو ذبح کے لیے پیش کر دیا۔ صبر کا نمونہ حضرت ایوبؑ ہیں کہ انھوں نے خدا کی غیرت کی خاطر اپنے وسیع کنبے اور سارے گھر بار کی اپنی آنکھوں کے سامنے تباہی اور اپنے پورے جسم میں کیڑے پڑ جانے کی تکلیف کو نہایت صبر کے ساتھ برداشت فرمایا۔ اشارت کا نمونہ حضرت زکریاؑ ہیں جنھوں نے خدا کے حکم کی تعمیل میں کلام تک بند کر دیا اور کئی روز تک صرف اشاروں سے بات کرتے رہے۔ غربت کا نمونہ حضرت یحییٰؑ ہیں جو خدا کی رضا جوئی میں اپنے وطن میں اپنے خویشوں سے بیگانہ[1] رہے۔ صوف پوشی میں حضرت موسیٰؑ نمونہ ہیں جو اُون کے کپڑے پہنتے تھے۔ خدا کی راہ میں سیاحت کے لیے حضرت عیسیٰؑ نمونہ ہیں جو بس ایک پیالہ اور کنگھی لے کر گھر سے چلے لیکن جب ایک شخص کو پیالے کے بجائے چُلّو سے پانی پیتے دیکھا تو پیالہ بھی پھینک دیا اور جب ایک دوسرے شخص کو دیکھا وہ کنگھی کے بجائے اپنے ہاتھ کی انگلیوں

---

[1] یاد رکھیے کہ ہم بھی ہر روز نماز وتر میں اللہ تعالیٰ سے یہ عہد کرتے ہیں: ''وَنَخْلَعُ وَنَتْرُكُ مَنْ یَّفْجُرُكَ، اور ہم الگ ہو جاتے ہیں اور چھوڑ دیتے ہیں اس کو جو تیری نافرمانی کرتا ہے۔ (مرتب)

سے اپنے بالوں کو خلال کر لیتا ہے تو کنگھی بھی پھینک دی۔ فقر کا نمونہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں کہ آپؐ کو خداوند تعالیٰ کی طرف سے روئے زمین کے خزانوں کی کنجیاں پیش کی گئیں کہ شان وشوکت اور آرائش کے ساتھ زندگی گزاریں لیکن آپؐ نے اس کو پسند فرمایا کہ ایک روز پیٹ بھریں اور دو روز بھوکے رہیں، اور جیسا کہ گزشتہ باب میں گزر چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے آپؐ نے دعا فرمائی کہ اے خدایا! مجھے فقر ہی کی حالت میں زندہ رکھ، فقر ہی کی حالت میں مجھے موت دے اور فقراء ہی کے زمرے میں میرا حشر فرما۔

اصلی صوفی کے اوصاف:

''تصوف'' اور ''صوفی'' دراصل لفظ ''صفا'' سے مشتق ہیں۔ اس کی ضد کدر (کدورت) ہے۔ پس جس شخص نے اپنے اخلاق اور معاملات کو مہذّب بنایا اور اپنی طبیعت کو کدورتوں اور کھوٹ اور مَیل سے پاک صاف کر لیا اور اسلام یعنی حق تعالیٰ کی سچی عبودیّت کا وصف اپنے اندر پیدا کر لیا تو وہ صوفی بن گیا اور اہلِ تصوف میں شامل ہو گیا[1] گویا صفا کی اصل غیر اللہ سے دل کو منقطع اور دنیا غدّار سے دل کو خالی کر لینا ہے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ میں یہ دونوں صفات بدرجۂ اتم پائی جاتی تھیں۔

حضرت صدیق رضی اللہ عنہ کا دل غیر اللہ سے کس طرح کلّی طور پر منقطع اور شرک کے ہر شائبہ سے پاک ہو چکا تھا، اس کا اندازہ اس سے کیا جا سکتا ہے کہ جب حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات سے تمام صحابہؓ بے حال ہو رہے تھے بلکہ ان کا ذہنی توازن اس درجہ متزلزل ہو رہا تھا کہ حضرت عمرؓ تک کی حالت یہ ہو گئی تھی کہ ہاتھ میں ننگی تلوار لیے اعلان فرما رہے تھے کہ جس نے یہ کہا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم وفات پا گئے ہیں میں اس کا سر قلم کر دوں گا۔ اس موقع پر حضرت ابوبکر

---

[1] اس بارے میں مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''مراتب ولایت میں سے انتہائی مرتبہ مقام عبدیت ہے اور ولایت کے درجوں میں مقام عبدیت سے اُدھر (آگے) کوئی مقام نہیں...... سیر وسلوک سے مقصود نفسِ لمّارہ کا تزکیہ اور اسے پاک کرنا ہے تاکہ جھوٹے خداؤں کی عبادت سے جو نفسانی خواہشات کے وجود سے پیدا ہوتی ہے نجات حاصل ہو جائے اور حقیقت میں خدائے واحد برحق کے سوا کوئی توجہ کا قبلہ نہ رہے۔ (مکتوب نمبر ۳۰ دفتر اوّل مکتوبات مجدد الف ثانیؒ) (مرتّب)

صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ تشریف لائے اور یہ صورتِ حال دیکھ کر بآواز بلند فرمایا: "مَنْ كَانَ يَعْبُدُ مُحَمَّدًا فَإِنَّ مُحَمَّدًا قَدْ مَاتَ وَمَنْ كَانَ يَعْبُدُ رَبَّ مُحَمَّدٍ فَإِنَّهُ حَيٌّ لَا يَمُوتُ. یعنی سن لو! جو شخص محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بندگی کرتا تھا وہ جان لے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم وفات پا گئے ہیں اور جو شخص محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے رب کی بندگی کرتا تھا اس کے لیے خوش خبری ہے کہ وہ رب بدستور زندہ ہے اور کبھی نہیں مرے گا۔" اور اس کے بعد یہ آیت تلاوت فرمائی: "وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۚ أَفَإِنْ مَاتَ أَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلَىٰ أَعْقَابِكُمْ (۳:۱۴۴) یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم (بھی خدا کے دوسرے رسولوں کی طرح) اللہ کے ایک رسول ہیں، ان سے پہلے بھی بہت سے رسول گزر چکے ہیں، تو کیا اگر وہ فوت ہو جائیں یا مار ڈالے جائیں تو تم پیٹھ موڑ کر بھاگ جاؤ گے؟"

اس اعلانِ حق کا کانوں میں پڑنا تھا کہ سب لوگوں کی آنکھیں کھل گئیں۔

جہاں تک اس امر کا تعلق ہے کہ حضرت صدیق اکبرؓ کا دل دنیا غدار سے کس درجہ خالی ہو چکا تھا یہ اس واقعہ سے ظاہر ہے کہ جب غزوۂ تبوک کے موقع پر گھر کا پورا اثاثہ لے کر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو حضورؐ نے دریافت فرمایا: "مَا خَلَّفْتَ لِعِيَالِكَ؟ کہو! اپنے گھر والوں کے لیے کیا چھوڑ کر آئے ہو؟" فَقَالَ اللّٰهُ وَرَسُولُهُ حضرت صدیق نے جواب دیا: "اللہ اور اس کے رسولؐ کی محبت اور ان کی پیروی۔"

یہی دو چیزیں ہیں جو تصوف اور سچے صوفی کی اصل متاع ہیں۔ ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: "اَلصُّوْفِيُّ إِذَا نَطَقَ بَانَ نُطْقُهُ عَنِ الْحَقَائِقِ وَإِنْ سَكَتَ نَطَقَتْ عَنْهُ الْجَوَارِحُ بِقَطْعِ الْعَلَائِقِ، یعنی صوفی وہ ہے کہ جب بولے تو اس کی زبان پر حق جاری ہو اور جب خاموش ہو تو اس کے جسم کا ایک ایک رونگٹا زبانِ حال سے شہادت دے کہ اس کے اندر دنیا کی کوئی ہوس موجود نہیں۔"

اہل تصوّف کی قسمیں:

اہل تصوف کے ہاں صوفیوں کی تین قسمیں ہیں:

ا۔ صوفی، اُس شخص کو کہتے ہیں جو اپنے آپ کو حق میں فنا کر دے اور اس کے اندر کوئی کدورت اور تیرگی باقی نہ ہو۔

۲۔ متصوّف، اُس شخص کو کہتے ہیں جو مجاہدہ سے اس درجے کے حصول کے لیے کوشاں ہو اور اس کے تقاضوں کے مطابق اپنے آپ کو اور اپنے معاملات کو درست کرنے کی سعی میں مشغول ہو۔ یعنی جو سچا صوفی بننے کی کوشش میں لگا ہوا ہو۔

۳۔ مستصوف، وہ ہے جو دنیا کا مال و متاع اور مرتبہ و عزت حاصل کرنے کے لیے اہل تصوف کی وضع و قطع اور طور و اطوار اختیار کیے ہوئے ہو۔ مگر صفا اور تصوف کی اسے کچھ خبر نہ ہو۔ ان لوگوں کے بارے میں صوفیاء کرام نے فرمایا ہے: ''اَلْمُسْتَصوِفُ عَنْدَالصُّوفِيَۃِ کَالذُّبَابِ وَعِنْدَ غَیْرِھِمْ کَالذِئَابِ یعنی صوفیائے کرام کے نزدیک مستصوف مکھی کی مانند حقیر اور قابل نفرت ہیں کہ وہ جو کچھ کرتے ہیں ہوس ہوتی ہے اور غیر صوفیاء (عام لوگوں) کے لیے وہ بھیڑیوں کی مانند ہیں کہ ان کے دین و ایمان کو چیرتے پھاڑتے پھرتے ہیں۔

تصوّف کی ضرورت:

تصوّف کے اثبات کی بحث کے آخر میں حضرعلی ہجویریؒ پہلے منکرینِ تصوّف کے جواب میں ابوالحسن ابوشحنہ رحمۃ اللہ علیہ کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ: ''اَلتَّصَوُّفُ الْیَوْمَ اِسْمٌ وَلَا حَقِیْقَۃٌ وَقَدْ کَانَ حَقِیْقَۃٌ، یعنی آج کل کا تصوف تو صرف ایک نام ہے جس کے پیچھے کوئی حقیقت موجود نہیں ہے لیکن اس سے پہلے (یعنی صحابہؓ اور سلف کے زمانے میں) یہ ایک حقیقت تھا، اُس دور میں اس کا نام تو بے شک نہیں تھا مگر بطور ایک حقیقت کے وہ موجود تھا۔'' اور یہ قول نقل کر کے حضرت علی ہجویریؒ ان لوگوں سے کہتے ہیں کہ تم لوگ تصوف کے بارے میں جو رائے قائم کر رہے ہو وہ اس کی موجودہ صورت کو دیکھ کر قائم کر رہے ہو، اس تصوف سے تو ہم بھی نالاں ہیں۔ اگر تصوف کے انکار

سے تمھاری مراد محض اس کے نام سے انکار ہے تو کچھ حرج نہیں۔ کیونکہ اگر معنی اور ان کی حقیقت موجود ہیں تو نام کے لیے نہ کوئی جھگڑا ہے اور نہ اصرار ہے۔ لیکن اگر معنی اور حقیقتِ تصوف سے انکار کرتے ہو تو سمجھ لو کہ یہ تو کل شریعت کا انکار ہے۔ یہی نہیں، بلکہ یہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فضائلِ حمیدہ اور آپؐ کے صحابہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے اوصافِ جمیلہ کا انکار ہے۔ کیونکہ اس انکار کے بعد پورا دین ریاکاری بن جاتا ہے۔ دین کی اصل روح اور اس کی جان تو احکامِ الٰہی کی اخلاص و محبت کے ساتھ پیروی ہی ہے۔ اگر اس کا انکار کر دیا تو پھر دین کہاں رہا۔ لیکن اگر اس کو مانتے ہو اور یہ موجود ہے تو اسی کو ہم تصوف کہتے ہیں۔

حضرت ابوالحسن رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: لَيْسَ التَّصَوُّفُ رُسُوْمًا وَّلَا عُلُوْمًا وَلٰكِنَّهُ الْاَخْلَاقُ. یعنی تصوف کسی خاص وضع قطع یا علمی سندات کا نام نہیں ہے، تصوف تو ایک وصف اور اخلاق کا نام ہے۔'' اور حضرت ابوالحسن نوری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''اَلتَّصَوُّفُ هُوَ الْحُرِّيَّةُ وَالْفُتُوَّةُ وَتَرْكُ التَّكَلُّفِ وَالسَّخَاءُ وَبَذْلُ الدُّنْيَا، یعنی تصوف نام ہے نفس اور حرص و ہوا کی غلامی سے آزادی پانے کا، باطل کے مقابلہ میں جرأت و مردانگی دکھانے کا، دنیوی تکلفات کو ترک کر دینے کا، اپنے مال کو دوسروں پر صرف کر دینے کا اور دنیا کو دوسروں کے لیے چھوڑ دینے کا۔'' اور حضرت ابوحفص حدادنیشاپوری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: ''اَلتَّصَوُّفُ كُلُّهٗ اَدَبٌ وَلِكُلِّ حَالٍ اَدَبٌ، فَمَنْ لَزِمَ اٰدَابَ الْاَوْقَاتِ بَلَغَ الرِّجَالِ وَمَنْ ضَيَّعَ الْاٰدَابَ فَهُوَ بَعِيْدٌ مِنْ حَيْثُ يَظُنُّ الْقَبُوْلَ یعنی تصوف کل کا کل آداب و احکام کی پابندی کا نام ہے۔ اور ہر وقت، ہر مقام اور ہر حال کے لیے متعین آداب و احکام ہیں۔ جو شخص ہر موقع محل کے آداب و احکام کی پابندی کو اپنے اوپر لازم کر لے وہ اس مرتبہ کو پہنچ گیا جہاں آدمی کو پہنچنے کی تمنا کرنی چاہیے اور جس نے ان آداب و احکام کی پرواہ نہ کی اور ان کو ضائع کر دیا تو ایسا شخص اس مقام سے بہت دُور ہے جہاں سے وہ بارگاہِ خداوندی میں باریابی کی امید کر سکے۔''

☆☆☆☆☆

صوفی کے لباس کے بارے میں

گودڑی (مخصوص لباس) پہننے کے حق میں صوفیاء کا استدلال:

صوفیاء کا عام طریقِ لباس گودڑی پہننا ہے اور ان کے نزدیک ایسا کرنا سنت ہے، اس لیے کہ روایتوں میں آیا ہے کہ "کَانَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ یَلْبَسُ الصُّوْفَ وَیَرْکَبُ الْحِمَارَ، یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم صوف (پشم کا بنا ہوا لباس) پہنتے تھے اور گدھے کی سواری فرماتے تھے۔" اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "عَلَیْکُمْ بِلُبْسِ الصُّوْفِ تَجِدُوْنَ حَلَاوَۃَ الْاِیْمَانِ فِیْ قُلُوْبِکُمْ، صوف (اون کا لباس) اختیار کرو، اس سے تم اپنے دلوں میں ایمان کی مٹھاس پاؤ گے۔" آپ نے حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سے فرمایا: "لَاتُضَیِّعِی الثَّوْبَ[1] حَتّٰی تُرَقِّعِیْہِ یعنی اے عائشہ! کپڑے کو ضائع نہ کیا کرو جب تک کہ پیوند لگا کر اسے خوب چلا نہ لو۔" حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے کپڑوں میں تیس تیس پیوند لگے ہوتے تھے۔ آپ فرمایا کرتے کہ اچھا کپڑا وہ ہے جس کی قیمت کم ہو۔ حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے جنگ بدر میں شریک ہونے والے ستر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو صوف کے کپڑے پہنے دیکھا ہے۔[2] حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ بھی صوف کے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ حضرت اویس قرنی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ اور ہرم بن حبان رضوان اللہ علیہم اجمعین تینوں کا

---

[1] مشکوٰۃ شریف، کتاب اللباس، ص ۳۷۵ میں "لَا تُضَیِّعِی الثَّوْبَ" کے بجائے "لَاتَسْتَخْلِقِیْ ثَوْبًا" کے الفاظ مذکور ہیں۔ یہ روایت امام ترمذی کی ہے اور انھوں نے اسے "غریب" لکھا ہے۔ محدثین کی اصطلاح میں غریب اس روایت کو کہتے ہیں جس کا راوی کسی دور میں ایک ہی ہو۔ اس کے معنی ناقابلِ اعتنا کے نہیں ہیں۔ نیز لَاتُضَیِّعِیْ اور لَا تَسْتَخْلِقِیْ میں بھی مفہوم کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں ہے۔

[2] یہاں یہ بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ صوف (اون اور پشم سے بنا ہوا لباس) کا اس زمانے میں تو عربوں میں عام رواج تھا اور پسماندہ اور صحرائی علاقوں میں اب بھی عموماً اسی کا رواج ہے۔ اس لیے یہ کوئی مضبوط دلیل نہیں ہے کہ جنگ بدر میں شریک ہونے والے ستر صحابہ کرامؓ صوف کے کپڑوں میں ملبوس تھے۔

بیان ہے کہ انھوں نے اُن کو پشم کے لباس میں دیکھا جس پر چیتھڑے لگے ہوئے تھے۔ اور حسن بصری، مالک بن دینار اور سفیان ثوری رحمہم اللہ سب کے سب پیوندوں والی گودڑی پہنتے تھے۔ اور محمد بن علی ترمذی اپنی کتاب تاریخ المشائخ میں بیان کرتے ہیں کہ حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ بھی شروع میں صوف پوش اور گوشہ نشینی کی زندگی اختیار کیے ہوئے تھے۔ یہاں تک کہ آپؒ نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا اور حضورؐ نے آپ سے فرمایا: کیا تمھارے لیے یہ مناسب نہیں ہے کہ میری سنت کو زندہ کرنے کے لیے لوگوں کے درمیان رہو؟ آپ نے فوراً گوشہ نشینی کی زندگی ترک کر دی۔ لیکن اس کے بعد بھی کبھی بیش قیمت لباس نہیں پہنا۔ حضرت ابراہیم ادھم رحمۃ اللہ علیہ بھی پیوند لگے پشم (صوف) کے کپڑے پہنتے تھے۔ اور ایک مرتبہ اسی حال میں حضرت امام ابوحنیفہؒ کے ہاں تشریف لائے۔ امام صاحب کے شاگردوں نے انھیں حقارت کی نظر سے دیکھا۔ امام ابوحنیفہؒ نے ان کا تعارف کراتے ہوئے فرمایا: یہ ہمارے سردار حضرت ابراہیم ادھم ہیں۔ شاگردوں نے اسے مذاق سمجھا اور آپس میں ایک دوسرے سے کہا کہ امام صاحب کبھی ہنسی مذاق کی بات تو نہیں کرتے، انھوں نے سرداری کا مرتبہ کیسے پالیا۔ امام صاحبؒ نے ان کو بتایا کہ انھوں نے یہ مرتبہ اس طرح پالیا کہ یہ ہمیشہ خدا کی بندگی کے کاموں میں مشغول رہتے ہیں اور ہم اپنی خدمت میں لگے رہتے ہیں۔

صوفیا کا یہ مسلک ان عملی مثالوں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مذکورہ بالا ارشادات کے علاوہ حضورؐ کے اس ارشاد پر بھی مبنی ہے کہ آپؐ نے فرمایا: ''مَنْ تَشَبَّهَ بِقَوْمٍ فَهُوَ مِنْهُمْ یعنی جو شخص کسی گروہ کی مشابہت اختیار کرتا ہے وہ اسی گروہ کا فرد شمار ہوتا ہے۔'' چونکہ زیادہ تر خدا کے برگزیدہ لوگ پھٹے حالوں اور چیتھڑوں میں ہی ملبوس رہے، اس لیے بندے کا ان کے سے حال میں رہنا حق سے قربت کا ذریعہ ہے۔ یہ لوگ کہتے ہیں کہ ہم اپنے ظاہر کو اہل اللہ کے موافق آراستہ کرتے ہیں اور جو کچھ لازم ہے اسے بجالانے کی کوشش کرتے ہیں تاکہ باطن بھی ان کے موافق ہو جائے۔ نیز یہ کہتے ہیں کہ اہل اللہ کا لباس زیب تن کرنے سے تمام مخلوقات ہماری محافظ بن جاتی ہے اور یہ اس طرح سے کہ اگر ہم یہ لباس پہن کر اہل اللہ کے مرتبے کے خلاف کوئی بات

کریں گے تو ہر طرف سے ہم پر زبانِ طعن دراز ہوگی اور ہر کوئی ہم کو ملامت کرے گا کہ یہ اہل اللہ کے نام کو بدنام کر رہے ہیں۔ اس طرح سے ہم اپنے آپ کو معصیت میں مبتلا کرتے ہوئے شرمائیں گے۔ ہمارے نزدیک گودڑی وفا کا پیراہن ہے۔ ہم گودڑی اور گودڑی والوں سے محبت کرتے ہیں اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: ''مَنْ اَحَبَّ قَوْمًا فَهُوَ مِنْهُمْ یعنی ہر شخص جس گروہ سے محبت رکھتا ہے حشر کے روز وہ اسی گروہ کے ساتھ ہوگا۔''

چنانچہ اس مسلک کے مشائخ خود بھی گودڑی پہنتے ہیں اور اپنے مریدوں کو بھی اسی لباس میں آراستہ کرتے ہیں تاکہ یہ ان کے اہل اللہ کے گروہ میں سے ہونے کی علامت ہو اور تمام مخلوقات ان کی محافظ بن جائے۔

گودڑی پہننے کی شرطیں:

اس بات کو نہیں بھولنا چاہیے کہ پیشہ ور صوفیوں کی بات تو دوسری ہے، لیکن اصل اہلِ طریقت میں سے جو گودڑی کا پہننا اور اپنے مریدوں کو اس کا پہنانا ضروری قرار دیتے ہیں، ان کے نزدیک گودڑی پہننا کفن پہننے کے ہم معنی ہے، اور اس کی شرائط بھی وہی ہیں جو کفن پہننے کی ہیں۔ مثلاً یہ کہ آدمی دنیا سے اسی طرح سے دست کش ہو کر گودڑی پہنے جس طرح دنیا سے دستکش ہو جانے کے بعد ہی آدمی کو کفن پہنایا جاتا ہے۔ وہ دنیا اور اس کی لذتوں سے بے نیاز (کنارہ کش نہیں) ہو جائے اور اس کے بعد اپنی تمام عمر خدا کی ملازمت کے لیے وقف کر دے۔ گویا یہ مجاہد فی سبیل اللہ ہونے کی ایسی علامت ہے کہ اب گودڑی پوش اپنی جان سمیت سب کچھ خدا کے لیے قربان کرنے کے لیے تیار کھڑا ہے۔ گودڑی پہنانے کا اصل طریقہ جو مشائخ نے جاری کیا وہ یہی ہے کہ جب مرید اس درجہ کو پہنچ جائے، اس وقت ہی پیر اس کو اس خلعت سے آراستہ کرے اور پھر مرید اس کا حق ادا کرنے کی پوری پوری کوشش کرے۔ چنانچہ ان مشائخ عظام رحمہم اللہ کا دستور یہ ہے کہ جب کوئی طالبِ عقبیٰ ان سے تعلق پیدا کرتا ہے تو وہ تین سال تک اسے ادب سکھاتے اور اس کی تربیت کرتے ہیں۔ اگر وہ اپنی طلب میں صادق اور عزم میں پختہ نکلا تو بہتر ورنہ اسے صاف طور پر فرما دیتے ہیں

کہ تجھے طریقت قبول نہیں کرتی۔ اوران تین برسوں میں ایک برس مخلوقات کی خدمت میں، ایک برس خدا کا حق بجالانے کی ملازمت میں، اور ایک برس اپنے دل کی حفاظت وپاسبانی میں لگایا جاتا ہے۔ مخلوقات کی خدمت کے لیے ضروری ہے کہ آدمی تمام مخلوقِ خدا کو بلاتمیز مخدوم اور اپنے آپ کو اس کا خادم سمجھے۔ ان سب کو اپنے سے بہتر اور سب کی خدمت کو اپنے اوپر واجب تصور کرے۔ ورنہ اپنے آپ کو دوسروں سے بہتر سمجھنا خود ایک آفت ہے جس کا مداوا ضروری ہے۔ خدا کی ملازمت اور خدمت آدمی اس وقت بجالاسکتا ہے کہ جب وہ اپنی تمام لذتوں کو خواہ وہ دنیا کی ہوں یا عقبیٰ کی، سب کو چھوڑ دے اور ہر طرف سے یکسو ہو کر خدا کی بندگی کے کام میں مشغول ہو جائے۔ دل کی محافظت اور پاسبانی اس وقت آدمی کر سکتا ہے جب کہ دل کو دوسرے تمام غموں اور ارمانوں سے فارغ کر کے صرف عقبیٰ کے غم اور ارمان کو اس میں آباد کرلے۔

جب یہ تینوں شرطیں پوری ہو جایں، تب مرید کو گودڑی پہنائی جاتی ہے اور تبھی پہنائی جانی چاہیے۔ کیونکہ جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا ہے، گودڑی پہننا کفن پہننے کے مترادف ہے۔

طریقت اور اخلاص فی الدّین کا مدار لباس نہیں ہے:

لیکن گودڑی پہننے اور پہنانے پر اصرار کے سلسلے میں پہلی توجہ طلب بات یہ ہے کہ تصوف وطریقت اور اخلاص فی الدین کسی خاص قسم کا لباس پہننے پر منحصر نہیں ہیں۔ ان کا مدار انسان کے عمل اور اس کے قلب کی کیفیت پر ہے۔ جو شخص طریقت سے آشنا ہے اس کی قبائے امیرانہ بھی قبائے فقیرانہ کی طرح ہوتی ہے، اور جو شخص طریقت سے بیگانہ ہے اس کی گودڑی بھی قیامت کے روز اس کے لیے نحوست کا نشان اور عقوبت وبدبختی کا فرمان ہوگی۔ پس اے گودڑی پوش! اگر تو یہ لباس (گودڑی) اس لیے پہنتا ہے کہ اللہ تعالیٰ تجھے پہچان لے تو وہ بغیر اس لباس کے بھی پہچان لیتا ہے۔ اور اگر اس لباس کو اس لیے اختیار کرتا ہے کہ مخلوقات تجھے اولیاء اللہ کے زمرے میں سمجھے تو دو صورتوں میں سے ایک بہر حال ہوگی۔ اگر تو فی الحقیقت اس زمرے میں داخل ہے تو اس کا اظہار ریاء ہوگا، اور اگر تو ان میں داخل نہیں ہے تو یہ نفاق ہوگا۔ اور جو شخص اپنے معاملات کو اپنے ظاہر

کے مطابق درست نہیں رکھتا، اس کا لباس (ظاہر) اس کے جھوٹے ہونے کی گواہی دیتا ہے۔ اور اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ اس کا لباس صفا کا نہیں فریب کا لباس ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:
''مَثَلُ الَّذِيْنَ حُمِّلُوا التَّوْرٰةَ ثُمَّ لَمْ يَحْمِلُوْهَا كَمَثَلِ الْحِمَارِ يَحْمِلُ اَسْفَارًا. (۶۲:۵)
یعنی ان لوگوں کی مثال جن کو تورات کے حامل بنایا گیا لیکن انھوں نے اس ذمہ داری کا حق ادا نہ کیا، اس گدھے کے مانند ہے جس پر کتابیں لدی ہوں۔'' اس سے صاف ظاہر ہے کہ ظاہر سے پہلے باطن کو درستی کی فکر کرنی چاہیے۔

دوسری بات یہ ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کے لیے کسی خاص وضع کے لباس کو مقرر نہیں فرمایا۔ آپؐ کی اور آپؐ کے صحابہؓ کی زندگیاں بھی اسی پر گواہ ہیں جو چیز سب میں مشترک ہے وہ یہ ہے کہ جو اور جیسا لباس میسر آیا اسے انھوں نے پہن لیا۔ البتہ جس بات کا اہتمام فرمایا اور تاکید بھی فرمائی وہ یہ کہ تمھارا لباس تقویٰ کا لباس ہو۔ یعنی یہ پوری طرح سے ساتر ہو، زینت میں حد سے بڑھا ہوا بھی نہ ہو اور آدمی کی عام حیثیت سے گرا ہوا بھی نہ ہو۔ غرور و تکبر اور ریاء کی شان لیے ہوئے نہ ہو۔ مرد کے لباس میں زنانہ پن نہ ہو اور عورت کے لباس میں مردانہ پن نہ ہو، اور نہ کسی دوسری قوم کی ایسی مشابہت اس میں پائی جائے جو ذہنی غلامی اور احساس کہتری سے پیدا ہوتی ہے۔ جہاں تک اپنے اوپر مصنوعی طور پر مفلسی کے آثار طاری کرنے اور اپنے ظاہر کو اپنی حیثیت سے فروتر بنا کر رکھنے کا تعلق ہے، اس چیز کو دین میں پسند نہیں کیا گیا ہے۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

اِنَّ اللّٰهَ اِذَا اَنْعَمَ نِعْمَةً عَلٰى عَبْدٍ اَحَبَّ اَنْ يَّظْهَرَ اَثَرُهَا عَلَيْهِ.

''اللہ جب کسی بندے کو نعمت دیتا ہے تو وہ چاہتا ہے کہ اس نعمت کا اثر اس بندے پر ظاہر ہو۔''

یعنی یہ کہ وہ اس نعمت سے لطف اندوز بھی ہو اور اس کے لیے اپنے منعم کا شکر گزار بھی ہو۔ یہی نہیں قرآن مجید میں تو ارشاد ہے:

قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ط قُلْ هِيَ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ. (۷:۳۲)

''اے نبیؐ! ان سے کہو کہ کس نے اللہ کی اُس زینت کو حرام کر دیا جسے اللہ نے اپنے بندوں کے لیے نکالا تھا اور کس نے خدا کی بخشی ہوئی پاک چیزیں ممنوع کر دیں؟ کہو، دنیا میں بھی ساری چیزیں دراصل ایمان لانے والوں کے لیے ہیں اور قیامت کے روز تو صرف انہی کے لیے ہوں گی۔''

صحیح اعتدال کی راہ:

چنانچہ میں علی بن عثمان جلابی اسی طریقہ پر عامل ہوں اور اسی کو پسند کرتا ہوں کہ لباس کے بارے میں کسی تکلف سے کام نہ لیا جائے۔ جیسا ملے پہن لیا جائے۔ اگر ایک وقت میں قبا ملی تو وہی پہن لی اور اگر گودڑی میسر آئی تو اس کو پہن لیا اور کچھ نہ ملا تو اسی طرح وقت گزار لیا۔ بلکہ بہتر صورت یہ ہے کہ کسی چیز کو بھی عادت نہ بنائے۔ کیونکہ جب کوئی چیز عادت بن جاتی ہے تو آدمی کو اس سے محبت ہو جاتی ہے اور یہ اس کی طبیعت میں داخل ہو کر حجاب بن جاتی ہے۔ اسی وجہ سے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''خَیْرُ الصِّیَامِ صَوْمُ اَخِیْ دَاوٗدَ عَلَیْہِ السَّلَامُ یعنی سب (نفلی) روزوں میں سے بہتر روزہ میرے بھائی داؤد علیہ السلام کا روزہ ہے۔ صحابہؓ نے عرض کیا کہ وہ کیسے؟ آپؐ نے فرمایا کہ وہ ایک روز روزہ رکھتے اور ایک روز ناغہ کرتے تاکہ نفس کو روزہ رکھنے یا نہ رکھنے کی عادت نہ ہو جائے اور اس عادت کے سبب وہ محجوب نہ ہو جائے۔

میرے شیخ ابوالفضل محمد بن حسن ختلی رحمۃ اللہ علیہ کا بھی یہی طریقہ تھا۔ آپؒ لباس میں صوفیوں کی رسوم سے کنارہ کش رہے۔ پس جو ملا اور میسر آیا پہن لیا۔ حضرت موید غزنوی رحمۃ اللہ علیہ کا بھی یہی طریقہ ہے۔ شیخ محمد بن حنیف رحمۃ اللہ علیہ جنھوں نے خود بیس سال ایک سخت ٹاٹ پہنا، ہر سال چار چلے کھینچے اور ہر چلہ میں علومِ حقیقت کی باریکیوں پر ایک کتاب تصنیف فرمائی، ان کے ہم عصر ایک عالم محمد بن زکریاؒ پارس میں رہتے تھے اور انھوں نے کبھی گودڑی نہیں پہنی تھی۔ شیخ محمد بن حنیفؒ سے لوگوں نے پوچھا کہ گودڑی پہننے کی شرط کیا ہے؟ آپؒ نے فرمایا، وہی جو محمد بن زکریا سفید پیراہن میں بجا لا رہے ہیں۔ یاد رکھو، ان کے لیے اس پیراہن کا پہننا اسی طرح سے

واجب ہے جس طرح سے میرے لیے یہ ٹاٹ۔ کیونکہ خداوند تعالیٰ نے اسے وہ لباس عطا فرمایا ہے اور مجھے یہ دیا ہے۔[1]

[1] معلوم ہوتا ہے کہ یہ لوگ پارس سے آئے تھے اور ان کی گفتگو سے شیخ محمد بن حنیف رحمۃ اللہ علیہ نے یہ بھانپ لیا کہ سوال کرنے والوں کا اصل منشاء کیا ہے اور وہ ان کے جواب سے کیا کام لینا چاہتے ہیں۔ ان لوگوں کے پیش نظر یہ تھا کہ شیخ بہر حال اپنے حسب حال گودڑی پہننے (یعنی اہل تصوف میں بالفعل رسمی شمولیت) کی ایسی شرائط بیان کریں گے جو کبھی نہیں تو بیشتر محمد بن زکریاؒ کے طریق زندگی کے برعکس ہوں گے، اور پھر وہ ان کے اس جواب کو اچھال اچھال کر محمد بن زکریاؒ کے خلاف فتنہ اٹھائیں گے، جیسا کہ ہر زمانے میں بعض پیشہ ور مذہبی سوداگر خیر واصلاح اور دین کے لیے مخلصانہ کام کرنے والوں کے خلاف کرتے رہے ہیں۔ یہ ایک ایسی لابدی شے ہے کہ اس ابتلاء سے نہ کوئی نبی مستثنیٰ رہا اور نہ کوئی دوسرا مخلص علمبردار خیر وصلاح۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے خود حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا کہ آج اگر شیاطین جن وانس مجتمع ہو کر تمھاری راہ روکنے کے لیے صف آراء ہو رہے ہیں تو یہ کوئی انوکھی بات نہیں کہ تمھیں ہی اس سے سابقہ پیش آیا ہو۔ یہ اس راہ کی رسم ہے۔ جب بھی اس راہ پر کوئی چلا ہے اسے انہی حالات سے گزرنا پڑا ہے۔ قرآن کے الفاظ ہیں:

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيَاطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا ط وَلَوْشَآءَ رَبُّكَ مَافَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُوْنَ ○ (الانعام:۱۱۲)

"ہم نے تو اسی طرح ہمیشہ شیطان انسانوں اور شیطان جنوں کو ہر نبی کا دشمن بنایا ہے اور وہ لوگوں کو مغالطوں اور دھوکہ فریب میں مبتلا کرنے کے لیے چکنی چپڑی باتیں ایک دوسرے کو سجھاتے رہے ہیں۔ اگر تمھارے رب کی مشیت یہ ہوتی کہ ایسا نہ ہو تو وہ کبھی ایسا نہ کر سکتے۔ پس تم (اپنا کام کیے جاؤ اور) انھیں ان کے حال پر چھوڑ دو کہ اپنی افتراپردازیاں کرتے رہیں۔"

طریقِ ملامت کے بارے میں

اہلِ ملامت کا استدلال:

مشائخ طریقت میں سے ایک گروہ نے اصلاح اور تربیت نفس کے لیے ملامت کا طریقہ اختیار کیا ہے۔ اس کا مطلب شریعت کی خلاف ورزی کیے بغیر ظاہر میں ایسی روش اختیار کرنا ہے کہ لوگ ان کو ملامت کریں اور ان کے درپے آزار ہوں۔ یہ حضرات کہتے ہیں کہ اس جہان میں اہلِ محبت اور خاصانِ حق ملامت کے لیے مخصوص ہیں۔ کسی کے ساتھ برائی کیے بغیر لوگوں کی ملامت کا تختہ مشق بننا آدمی کے مقبول بارگاہ ہونے کی علامت ہے۔ اپنے اس مسلک کے لیے یہ حضرات یہ دلیل لاتے ہیں کہ دیکھو، حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جو اہل حق کے مقتداء اور پیشوا ہیں، جب تک اُنؐ پر وحی نازل نہ ہوئی وہ مخلوقات میں نیک نام مشہور رہے۔ لوگ انھیںؐ صادق اور امین اور بزرگ سمجھتے رہے۔ لیکن جب آپؐ حق جل وعلا کی دوستی اور اس کی طرف سے خلعتِ محبانہ سے سرفراز ہوئے تو انہی لوگوں نے آپ کو کاہن اور مجنون اور جھوٹا کہنا شروع کردیا اور طرح طرح سے آپؐ پر زبانِ طعن وملامت دراز کرنے لگے۔ نیز وہ کہتے ہیں کہ مومنوں کی صفات میں ایک صفت قرآن مجید نے یہ بھی بیان فرمائی ہے کہ ''وَلَا يَخَافُونَ لَوْمَةَ لَائِمٍ ط ذَالِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَّشَاءُ (۵۴:۵) یعنی خاصانِ خدا ملامت کرنے والوں کی ملامت سے نہیں ڈرتے اور یہ صفت اللہ کے فضل کے بغیر پیدا نہیں ہوتی۔'' اس لیے ہم نے ملامت کو قربِ الٰہی کے ذریعہ کے طور پر اختیار کیا ہے۔

اس گروہ کا دعویٰ یہ ہے کہ خداوند تعالیٰ کا دستور یہ ہے کہ جو کوئی اس کو یاد کرے گا اور دوسروں کو چھوڑ کر اسی سے لَو لگائے گا تمام جہان اس کو ملامت کرنے والا بن جائے گا۔ یہ حضرات کہتے ہیں کہ یہ صورت اللہ پاک کی غیرت اور خاص مہربانی کا نتیجہ ہے کہ اس طرح سے وہ اپنے دوستوں کو غیروں کی نظروں سے محفوظ رکھتا ہے۔ بلکہ ان کی حفاظت کا یہاں تک انتظام فرماتا ہے کہ یہ

لوگ اپنی خوبی کو خود بھی نہیں دیکھ سکتے تاکہ کہیں مغرور ہو کر عُجب اور تکبر کی بیماری میں مبتلا نہ ہو جائیں۔ اس غرض کے لیے اللہ تعالیٰ نے خلق کی ملامت کے ساتھ آدمی کے اپنے اندر بھی نفس لوامہ رکھ دیا ہے تاکہ یہ بھی طالبانِ حق کو برابر ملامت کرتا رہے۔ اگر وہ بدی کریں تو اس بدی کے ارتکاب پر انھیں ملامت کرے۔ اور اگر نیکی اور بھلائی کا کام کریں تو اس کے نقائص اور کمزور پہلوؤں اور اس کے کم ہونے پر انھیں ملامت کرتا رہے۔ یہ انتظام اللہ تعالیٰ نے اس لیے فرمایا ہے کہ اس راہ میں عُجب اور غرور سے بڑھ کر اور سخت تر کوئی حجاب نہیں ہے۔ اور عُجب اور غرور کا سب سے مؤثر علاج ملامت ہے، کیونکہ آدمی کے اندر غرور دو وجوہ سے پیدا ہوتا ہے۔ ایک اس سے کہ اس کا کوئی کام مخلوقات کو پسند آ جائے اور وہ اس کے لیے اس کی مدح اور ستائش کرنے لگے۔ اور دوسرے اس سے کہ اسے خود اپنا کام بھلا معلوم ہونے لگے اور وہ خود اپنے آپ کو اس کی وجہ سے قابلِ تعریف اور کوئی بڑی شے سمجھنے لگے اور اس کے نتیجے میں اپنے دل میں مغرور ہو جائے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ کا اپنے دوستوں پر یہ کرم ہے کہ وہ غرور میں مبتلا ہونے کے یہ دونوں دروازے ان پر بند فرما دیتا ہے۔ چنانچہ جس کو اللہ عزوجل پسند فرما لیتا ہے اس کو خلق پسند نہیں کرتی، اور جو اپنے آپ کو خود پسند کر لیتا ہے اس کو اللہ عزوجل پسند نہیں فرماتا۔ ابلیس نے اپنے آپ کو پسند کیا اور کہا ''اَنَا خَیۡرٌ مِّنۡہُ (۱۲:۷) میں آدم سے بہتر ہوں۔'' اور وہ خدا کے ہاں لعنت کے بوجھ میں دب گیا اور آدم علیہ السلام کو نہ فرشتوں نے پسند کیا نہ ابلیس نے، اور نہ انھوں نے خود ہی اپنے آپ کو پسند کیا، تو اللہ تعالیٰ نے ان کو پسند فرما لیا۔ فرشتوں نے ان کے بارے میں ناپسندیدگی کا اظہار کرتے ہوئے کہا: ''اَتَجۡعَلُ فِیۡهَا مَنۡ یُّفۡسِدُ فِیۡهَا وَیَسۡفِکُ الدِّمَآءَ (۳۰:۲) یعنی کیا تو زمین میں اسے خلیفہ بنائے گا جو اس میں فساد پھیلائے گا اور خونریزیاں کرے گا۔'' ابلیس نے کہا: ''اَنَا خَیۡرٌ مِّنۡہُ، خَلَقۡتَنِیۡ مِنۡ نَّارٍ وَّ خَلَقۡتَہٗ مِنۡ طِیۡنٍ (۱۲:۷) یعنی میں آدم سے بہتر ہوں، تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا ہے اور اُسے مٹی سے''۔ اور آدم علیہ السلام نے اپنے بارے میں کہا: ''رَبَّنَا ظَلَمۡنَاۤ اَنۡفُسَنَا، وَاِنۡ لَّمۡ تَغۡفِرۡ لَنَا وَتَرۡحَمۡنَا لَنَکُوۡنَنَّ مِنَ الۡخٰسِرِیۡنَ (۲۳:۷) یعنی اے ہمارے رب! ہم نے اپنے اوپر ستم ڈھایا، اب اگر تو نے ہم سے درگزر نہ فرمایا اور رحم نہ کیا تو یقیناً ہم تباہ ہو جائیں گے۔'' نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت آدمؑ اور آپ کی ذرّیت خلعتِ خلافت سے سرفراز ہوئی۔

مخلوقات کی طرف سے ملامت کا ظاہری سبب یہ ہوتا ہے کہ عام لوگ اپنے اندر کی برائی کی وجہ سے اللہ کے دوستوں کو نہیں پہچانتے۔ چنانچہ احادیث میں ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبرئیل علیہ السلام سے اور انھوں نے اللہ عزّ وجل سے یہ الفاظ سنے کہ: ''اَوْلِیَائِیْ تَحْتَ قَبَائِیْ لَایَعْرِفُهُمْ غَیْرِیْ اِلَّا اَوْلِیَائِیْ یعنی میرے دوست میری قبا کے نیچے ہیں۔ انھیں میرے اور میرے دوستوں کے سوا کوئی نہیں پہچانتا۔''

ملامت کی شرط:

مگر مشائخ رحمہم اللہ اس بات کو واضح فرماتے ہیں کہ ملامت کی شرط یہ ہے کہ مخلوقات کو اپنے سے متنفر اور ملامت پر آمادہ ایسے طریق سے کرے کہ شرع شریف کو اس سے کوئی نقصان نہ پہنچے۔ اس کے لیے کسی کبیرہ گناہ کا ارتکاب تو درکنار کسی صغیرہ گناہ کا ارتکاب بھی جائز نہیں ہے۔ حدودِ شریعت کی پابندی ہر حال میں لازم ہے۔ حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق روایت ہے کہ ایک دفعہ حجاز سے واپس تشریف لا رہے تھے کہ سارے شہر میں آپ کی تشریف آوری کی خوشی میں شادیانے بجنے لگے اور سب اہلِ شہر آپ کے استقبال کے لیے جمع ہو گئے۔ بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ کو اندیشہ ہوا کہ اس قبولِ عام اور رجوعِ خلق سے اُن کا دل خدا سے ہٹ کر ان کی طرف متوجہ ہو جائے گا اور وہ خدا کی یاد سے محروم رہیں گے۔ چنانچہ جب آپ بازار میں پہنچے تو اپنی آستین سے ایک روٹی نکالی اور سب کے سامنے اس کو کھانا شروع کر دیا۔ یہ رمضان کا مہینہ تھا۔ تمام لوگ برگشتہ ہو کر چلے گئے اور ایک مرید جو ساتھ آیا تھا وہی رہ گیا۔ لیکن آپ کا یہ فعل شرع شریف کے خلاف نہیں تھا، کیونکہ آپ سفر میں تھے۔

لیکن ہم نے تو ایسا زمانہ پایا ہے کہ اب اس کی بھی ضرورت نہیں ہے کہ ملامت کے واسطے آدمی کو کسی ظاہری برے فعل کے ارتکاب کی ضرورت پڑے۔ آج کل جو شخص ملامت کا خواہاں ہو اس کے لیے اتنا کافی ہے کہ دو رکعت نماز نفل لمبی کر کے پڑھے یا پورے دین کو لازم پکڑے اور پوری زندگی میں اس کو اختیار اور اس پر عمل کرنے پر اصرار کرے ہر طرف سے ملامت اور فتوے لگنے شروع ہو جائیں گے۔

صحیح مسلک:

نیز میں علی بن عثمان جلابی کہتا ہوں کہ ملامت کی خواہش اور طلب درست نہیں ہے۔ اس کی طلب عین ریا ہے اور ریا عین نفاق ہے۔ جس طرح سے ریا کار آدمی مخلوقات میں مقبولیت حاصل کرنے کے لیے بہ تکلف ایک راہ پر چلتا ہے، اسی طرح سے ملامتی بھی تکلف سے ملامت کی راہ کو اختیار کرتا ہے تاکہ مخلوق اسے رَد کرے۔ ظاہر ہے کہ دونوں آدمی خدا کے بجائے مخلوق کی طرف متوجہ ہیں۔ سچا درویش وہ ہے جسے غیر اللہ سے کوئی دلچسپی اور کوئی سروکار نہ رہے۔ اسے صرف خدا کی رضا مطلوب ہو۔ اس لیے درویش کی کوئی چیز خدا کی رضا کے سوا اور کسی شے کی پابند نہیں ہوتی۔ وہ یکسو ہو کر خدا کی راہ پر چلتا ہے، اپنے معاملات کی بھی خوب حفاظت کرتا ہے اور کسی دینی کام کو ہاتھ سے نہیں چھوڑتا۔ اس سارے کام میں اسے اس کی کوئی پرواہ نہیں ہوتی کہ مخلوقات اسے پسند کرتی ہے یا ناپسند، اور کون اسے داد دیتا ہے اور کون ملامت کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ارشاد: ''وَلَا یَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَائِمٍ'' کا یہی مطلب ہے۔ اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کوئی کام لوگوں سے ملامت حاصل کرنے کے لیے نہیں کیا۔ آپؐ ہمیشہ خدا کی مرضی اور اسکے حکم کو پورا کرنے کی سعی فرماتے تھے۔

اصل حقیقت یہ ہے کہ ایک گروہ خود خلقت کی طرف مشغول ہوتا ہے اور دل میں گمان کر لیتا ہے کہ مخلوق اس کی طرف مشغول ہے۔ تو اپنے آپ کو دیکھنا چھوڑ دے، تجھے کوئی نہیں دیکھے گا۔ آفت کہیں باہر نہیں ہے، خود تیرے اندر ہے، اس سے نجات حاصل کر اور مخلوق سے بے پرواہ ہو کر خدا کی راہ پر چل۔ لوگ تیرے بارے میں جو کہتے ہیں ان کو کہنے دے۔ حضرت شیخ ابو طاہر حراتی رحمۃ اللہ علیہ ایک روز گدھے پر سوار بازار سے گزر رہے تھے اور آپ کا ایک مرید گدھے کی باگ پکڑے آگے آگے چل رہا تھا کہ ایک شخص نے آوازہ کسا: ''دیکھو، پیر زندیق آ گیا''۔ مرید کو سخت غصہ آیا اور وہ اس شخص کو مارنے کے لیے لپکا اور اُدھر سے اس شخص کے ساتھی بھی اٹھ کھڑے ہوئے۔ شیخ نے مرید سے کہا کہ اگر تو خاموشی اور صبر اختیار کرے تو تجھے ایک ایسی بات بتاؤں گا

جس سے تیری یہ ساری تکلیف دُور ہو جائے گی۔ چنانچہ مرید خاموش ہو گیا۔ گھر پہنچے تو آپ نے مرید سے فرمایا کہ وہ صندوق اٹھالاؤ۔ جب وہ اُٹھالایا تو آپ نے اس میں سے بہت سے خطوط نکالے اور مرید کے سامنے رکھ دیے اور فرمایا کہ ان کو دیکھو۔ یہ سب لوگوں ہی کی طرف سے آئے ہیں۔ ان میں سے کسی نے مجھے شیخ الاسلام کر کے خطاب کیا ہے۔ کسی نے شیخ ذکی لکھا ہے، کسی نے زاھد، کسی نے شیخ الحرمین اور کسی نے کچھ اور کسی نے کچھ القاب لکھا ہے۔ حالانکہ میں ان میں سے کسی لقب کا بھی مستحق نہیں ہوں۔ ہر شخص اپنے اعتقاد اور رائے کے مطابق میرا لقب تجویز کرتا ہے۔ اگر اس بے چارے نے بھی اپنے اعتقاد کے مطابق میرا ایک لقب رکھ دیا تو اس سے جھگڑا کرنے کی کیا حاجت ہے۔

خدا تعالیٰ کی راہ پر پامردی سے چلتے ہوئے اگر آدمی بلا طلب ملامت کے محل میں پہنچ جائے اور اُسے ابتلاء جان کر اس میں بھی خدا کی رضا کا پابند رہے تو اس سے بعض مرتبہ ایسے عقدے وا ہوتے ہیں جو کسی دوسری طرح سے نہیں کھلتے۔ میں جو علی بن عثمان جلابی ہوں۔ مجھے ایک دفعہ ایک مشکل پیش آئی۔ میں نے اس کے حل کے لیے بہت مجاہدے کیے مگر کوئی حل سامنے نہ آیا۔ اس سے پہلے ایک عقدہ کے حل کے لیے میں نے حضرت شیخ ابو یزید رحمۃ اللہ علیہ کی قبر کی مجاوری کی تھی اور وہاں وہ عقدہ حل ہو گیا تھا۔ اس حالیہ الجھن کے لیے برابر تین مہینے ان کی قبر پر مجاور بنا رہا۔ ہر روز تین مرتبہ غسل کرتا اور تیس مرتبہ روزانہ وضو کرتا، مگر میری مشکل حل نہ ہوئی۔ بالآخر میں نے خراسان جانے کا ارادہ کیا۔ سفر کے دوران راستے میں ایک روز رات گزارنے کے لیے ایک خانقاہ میں ٹھیرا۔ وہاں ایک صوفیوں کی جماعت موجود تھی۔ میری حالت یہ تھی کہ مجھ پر اُس وقت موٹے اور کھردے ٹاٹ کی ایک گودڑی تھی اور ہاتھ میں ایک عصا اور کوزہ تھا۔ ان کے علاوہ اور کوئی سامان میرے پاس نہیں تھا۔ ان صوفیوں میں سے کوئی میرا واقف نہیں تھا۔ انھوں نے مجھے حقارت کی نظر سے دیکھا اور اپنی رسم کے موافق ایک دوسرے سے کہا کہ یہ ہم میں سے نہیں ہے۔ اور یہ بات ان کی صحیح تھی کہ میں ان میں سے نہیں تھا۔ میں تو مجبوراً رات گزارنے کے لیے وہاں ٹھیر گیا تھا۔ انھوں نے مجھے خانقاہ کے نچلے حصہ میں بٹھا دیا اور ایک روکھی خشک روٹی میرے آگے

رکھ کر خود اوپر بالا خانہ میں جا بیٹھے۔ اوپر خود جو کھانے وہ کھا رہے تھے ان کی خوشبو مجھے آ رہی تھی۔ اور جو طنز وہ مجھ سے کر رہے تھے اُسے بھی میں سن رہا تھا۔ کھانے کے بعد وہ خربوزے لے کر بیٹھ گئے اور کھا کھا کر چھلکے مجھ پر پھینکتے رہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ اس وقت ان کی خوشی میری توہین ہی پر موقوف ہے۔ میں نے دل میں کہا: خدایا! اگر میں نے تیرے دوستوں کا لباس نہ پہنا ہوا ہوتا تو میں بھی ضرور ان سے بیزاری کا اظہار کرتا۔ لیکن چونکہ میں اس وقت یہ سب خدا کی رضا کے لیے برداشت کر رہا تھا۔ اس لیے جس قدر وہ زیادہ طعن و مذاق کرتے میں اپنے دل میں خوش ہوتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس طعن و توہین برداشت کرنے کے دوران ہی میں میرا وہ عقدہ وا ہو گیا جس کے لیے میں اتنے عرصے سے پریشان تھا اور یہ سفر کر رہا تھا۔

حضرت عثمانؓ کا ایک واقعہ:

نیز اگر کوئی بزرگ خود اپنے نفس اور دوسرے لوگوں کی اصلاح و تربیت کے لیے کوئی ایسا کام کرے جس میں کوئی عار نہ ہونی چاہیے مگر لوگ اسے توہین کا کام سمجھتے ہوں تو اس میں نہ صرف یہ کہ کوئی خرابی نہیں ہے بلکہ بعض حالات میں ایسا کرنا ضروری ہوتا ہے۔ مثلاً حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ خلافت میں ایک روز لوگ کیا دیکھتے ہیں کہ آپ اپنے کھجوروں کے باغ سے لکڑیوں کا ایک گٹھا اپنے سر پر اٹھائے تشریف لا رہے ہیں۔ یہ اس وقت کا واقعہ ہے جبکہ آپ امیر المؤمنین کے منصب پر فائز اور چار سو غلام آپ کی ذاتی مِلک میں تھے۔ انھوں نے عرض کیا کہ اے امیر المومنین! یہ آپ نے کیا کیا، ہم آخر کاہے کے لیے ہیں؟ آپ نے فرمایا: ''اُرِیْدُاَنْ اُجَرِبَ نَفْسِیْ'' یعنی میں نے چاہا کہ ذرا اپنے نفس کو آزما کے دیکھوں (کہ مخلوق میں جو میرا رُتبہ ہے اُس نے اسے موٹا تو نہیں کر دیا)۔ اور ظاہر بات ہے کہ آپ کے اس عمل سے عام لوگوں کے سامنے یہ بات آپ سے آپ واضح ہو گئی کہ دنیا کا کوئی بھی جائز اور حلال کام کسی انسان کے مرتبے سے فروتر نہیں ہے۔ انسان اور انسانیت کے مرتبے سے اگر کوئی شے فروتر ہے تو وہ یہ کہ وہ معصیت اور خدا کی نافرمانی کے کسی کام کا ارتکاب کرے۔

صحابۂ کرامؓ میں اہلِ طریقت کے پیشوا

خلفائے راشدین رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین

(۱) حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ

صحابہ کرامؓ میں صوفیاء کے پیشوائے اعظم امیر المؤمنین حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں۔ آپ اسلام کے گلِ سرسبد، اہل تجرید[1] کے امام اور اہلِ تفرید[2] کے شہنشاہ ہیں۔ مشائخ رحمہم اللہ نے آپ کو صاحبان مشاہدہ میں مقدم رکھا ہے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو ان کی طبیعت کی سختی اور کارکنی کے سبب صاحبانِ مجاہدہ میں مقدم رکھا ہے۔ حضرت ابوبکرؓ کے صاحبِ مشاہدہ ہونے کی ایک دلیل تو یہ ہے کہ آپؓ کی روایات اور حکایات بہت تھوڑی ہیں۔ کلام کی کمی ان کے صاحبِ مشاہدہ ہونے کی علامت ہے۔ کیونکہ مشاہدہ میں کلام کم ہوتا ہے۔ آپؓ کے صاحب مشاہدہ ہونے کی دوسری دلیل یہ ہے کہ آپؓ رات کو اپنی نماز میں قرآن مجید آہستہ پڑھتے اور حضرت عمرؓ بلند آواز سے پڑھتے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ سے جب پوچھا کہ اے ابوبکرؓ! تم آہستہ کیوں پڑھتے ہو؟ تو انھوں نے جواب دیا: ''اَسۡمَعُ مَنۡ اُنَاجِیۡهِ یعنی میں اُس خدا کو سناتا ہوں جو سرگوشی بھی سنتا ہے، جو مجھ سے دُور اور غائب نہیں ہے۔'' جب حضورؐ نے حضرت عمرؓ سے پوچھا کہ اے عمرؓ! تم قرآن مجید کو بلند آواز سے کیوں پڑھتے ہو؟ تو انھوں نے جواب دیا: ''اُوۡقِظُ الۡوَسۡنَانَ اَیِ النَّائِمَ وَاُطۡرِدُ الشَّیۡطَانَ یعنی میں سونے والوں کو جگاتا ہوں اور شیطان کو بھگاتا

[1] اہل تجرید سے مراد وہ لوگ ہیں جو معمولی آلائشوں سے بھی اجتناب کے لیے کوشاں رہیں۔

[2] اہل تفرید سے مراد وہ لوگ ہیں جو نہایت باریک بینی کے ساتھ غلط کو صحیح سے الگ چھانٹ دیتے ہوں۔ چنانچہ منکرین زکوٰۃ کے مسئلے میں صرف حضرت ابوبکرؓ تھے جنھوں نے صحیح اور غلط کے درمیان حد فاصل کو ٹھیک ٹھیک متعین کیا ورنہ دوسرے سب اہل الرائے صحابہؓ جو جمع تھے حیران تھے کہ آخر ان لوگوں کے خلاف تلوار کیسے اٹھائی جائے جو کلمہ گو ہیں اور نماز ادا کرتے ہیں۔ اسی طرح حضورؐ کے انتقال کے موقع پر یہ حضرت ابوبکرؓ ہی تھے جنھوں نے رسولؐ کے صحیح مقام اور حیثیت کو دوٹوک انداز میں واضح کیا۔ ورنہ اس صدمہ سے اجلّہ صحابہؓ تک حواس کھو بیٹھے تھے۔

ہوں۔" حضرت ابوبکرؓ کا جواب ان کے صاحبِ مشاہدہ ہونے کا نشان ہے اور حضرت عمرؓ کا جواب ان کے صاحبِ مجاہدہ ہونے کا نشان ہے۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے مقام و مرتبہ کا اندازہ اس سے بھی کیا جا سکتا ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے بارے میں حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے فرمایا: "هَلْ اَنْتَ اِلَّا حَسَنَةٌ مِّنْ حَسَنَاتِ اَبِیْ بَکْرٍ یعنی اے عمر! تو ابوبکر کی تمام نیکیوں میں سے ایک نیکی کے مرتبہ پر ہے۔"

مؤطا امام مالک رحمۃ اللہ علیہ میں "سیرۃ ابی بکر الصدیق رضی اللہ عنہ وفضائلہٗ" کے باب میں حسب ذیل روایات آئی ہیں:

۱۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

فمن کان من اهل الصلوٰة دُعِیَ من بابا الصلوٰة ومن کان من اهل الجهاد دُعِیَ من باب الجهاد ومن کان من اهل الصّدقة دُعِیَ من باب الصّدقة ومن کان من اهل الصیام دُعِیَ من باب الریان. فقال ابوبکر الصّدیق یارسول الله! ما علٰی من یُدعٰی من هٰذه الابواب من ضرورةٍ، فهل یُدعٰی اَحَدٌ من هٰذه الابواب کلّها؟ قال نعم وارجوتکون منهم.

"جو شخص نماز کے اہتمام و ادائیگی میں نمایاں مقام رکھنے والوں میں سے ہوگا اسے (جنت کے) باب الصلوٰۃ سے پکارا جائے گا اور جو جہاد کرنے والوں میں نمایاں مقام رکھنے والوں میں سے ہوگا اسے بابِ جہاد سے پکارا جائے گا۔ اور جو صدقہ کرنے والوں میں نمایاں مقام رکھنے والوں میں سے ہوگا اسے بابِ صدقہ سے پکارا جائے گا۔ اور جو روزہ رکھنے والوں میں نمایاں مقام رکھنے والوں میں سے ہوگا اسے باب الرّیان سے پکارا جائے گا۔ یہ سن کر حضرت ابوبکر صدیقؓ نے عرض کیا: یارسول اللہ! جس کو ان دروازوں سے پکارا جائے اسے اور کیا چاہیے؟ کیا کوئی ایسا خوش قسمت بھی ہوگا جسے ان سب دروازوں سے پکارا جائے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں اور میں امید رکھتا ہوں کہ تم اُن میں شامل ہوگے۔"

۲۔حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں کہ:

رایت ثلثۃ اَقْمَارٍ سقطن فی حجرتی، فَقَصَصْتُ رؤیایَ علی ابی بکر الصّدیق. قالت فلمّا توفّی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم و دُفِنَ فی بیتھا قال لھا ابوبکر ھٰذ اَحعذ اَقْمَارِ کِ وھو خَیْرُھا.

''میں (عائشہؓ) نے خواب میں دیکھا کہ تین چاند ٹوٹ کر میرے حجرے میں آ گرے ہیں۔ میں نے اپنا یہ خواب حضرت ابوبکر صدیقؓ سے بیان کیا۔ وہ فرماتی ہیں کہ پھر جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انتقال ہوا اور انھیںؐ میرے حجرے میں دفن کیا گیا تو حضرت ابوبکرؓ نے مجھ سے کہا: لو یہ تیرے چاندوں میں سے ایک ہے اور یہ اُن سب میں بہتر ہے۔''

یادر ہے کہ دوسرے دو حضرات جو اس حجرے میں دفن ہوئے وہ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما ہیں۔

۳۔زید بن اسلم رضی اللہ عنہ اپنے والد کے حوالے سے بیان کرتے ہیں کہ:

انّ عمر بن الخطاب دخل علی ابی بکر الصّدیق و ھو یَجْبِذُ لِسانَہٗ ،فقال لہ عمر : مَہْ، غفر اللّٰہ لک، فقال ابوبکر : ھٰذا اَوْرَدَنِیَ الْمَوْرِدِ.

''ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ حضرت عمرؓ حضرت ابوبکرؓ کے ہاں گئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ حضرت ابوبکرؓ اپنی زبان کو پکڑ کر کھینچ رہے ہیں۔ یہ دیکھ کر حضرت عمرؓ نے کہا: ہیں، ہیں اللہ آپ کو معاف کرے، یہ کیا؟ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا: جس خرابی سے میں دوچار ہوا ہوں اسی کی وجہ سے ہوا ہوں۔''

۴: ابوالنضر رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ انھیں یہ بات پہنچی ہے کہ:

انّ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال لِشُھَدَاءِ اُحد: ھؤلاءِ اشھد علیھم، فقال ابوبکر الصّدیق: یارسول اللّٰہ! السنا باخوانھم؟ اسلمنا کما اسلموا وجاھدنا کما جاھدوا، فقال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم: بلٰی ولکن لا ادری ماتحدثون بعدی. قال فَبَکَیٰ ابوبکر ثمّ بکی، قال انّنا لکائنون بعدَکَ!

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگِ احد کے شہداء کے بارے میں فرمایا کہ میں ان کے حق میں گواہی دوں گا۔ اس پر حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا: یارسول اللہ! کیا ہم بھی ان کے ساتھی نہیں ہیں؟ انہی کی طرح ہم بھی اسلام لائے، ان کی طرح ہم نے بھی جہاد کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے جواب میں فرمایا: بے شک تم نے یہ کام کیے، لیکن کیا معلوم میرے بعد تم کیا گل کھلاؤ گے..... راوی بیان کرتا ہے کہ اس پر ابوبکرؓ پھوٹ پھوٹ کر روئے اور عرض کیا: کیا آپؐ کے بعد ہم زندہ رہیں گے؟ (یعنی ہمیں اپنی آنکھوں سے یہ صدمہ بھی دیکھنا ہوگا)''۔

۵۔ یحییٰ بن سعید رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ انھیں یہ بات پہنچی ہے کہ:

انّ ابابکر الصّدیق، قال لعائشة وهو مریض، فی کَمْ کُفِنَ رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلّم ؟ فقالت: فی ثلٰثة اثوابٍ بیض سَحُولیّة، فقال ابوبکر الصّدیق: خذوا هٰذا الثوب الثوبِ علیه قد اصابه مشک اور زعفران، فاغسلوه ثمّ کفنونی مع ثوبین اٰخرین، فقالت عائشة وما هٰذا؟ فقال ابوبکر الصّدیق: اَلْحَیُّ اَحْوَجُ الی الجدید من المیّتِ وانّما هٰذا لِلْمُهْلَةِ.

''حضرت ابوبکر صدیقؓ نے مرض کی حالت میں (جس میں آپ کا انتقال ہوا) حضرت عائشہ صدیقہؓ سے پوچھا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کتنے کپڑوں میں کفنایا گیا تھا؟ انھوں نے جواب دیا: کہ سَحُول کی تین سفید چادروں میں۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے فرمایا: (بیٹی!) ایک تو یہی چادر لے لینا...... جو اوڑھے ہوئے تھے اور اس پر زعفران یا گل سرخ کے داغ پڑے ہوئے تھے۔ اسے دھو لینا اور دو چادریں اور ملا کر مجھے کفنا دینا۔ حضرت عائشہؓ نے عرض کیا: یہ کیا ہے (اس قدر تو پرانی اور خراب ہے)۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے فرمایا: نئی چیزوں کے زندہ لوگ مردوں سے زیادہ ضرورت مند ہیں۔ کفن لہو اور پیپ ہی کے لیے تو ہے۔'' (مصفّٰی جلد ثانی، مطبوعہ کتب خانہ رحیمیہ دہلی، صفحہ ۲۹۸ تا ۳۰۰)

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے اقوال میں سے ایک قول یہ ہے:

دَارُنَا فَانِیَةٌ وَاَحْوَالُنَا عَارِیَةٌ وَاَنْفَاسُنَا مَعْدُوْدَةٌ وَکَسْلُنَا مَوْجُوْدَةٌ.

''یہ جاننے کے باوجود کہ ہمارا دنیا کا یہ گھر عارضی ہے اور یہاں کے تمام احوال واسباب ہمارے پاس عاریۃً ہیں یہاں تک کہ ہمارے سانس بھی گنتی کے ہیں، پھر بھی ہم غفلت میں پڑے ہیں۔''

مطلب یہ ہے کہ جو گھر بہر حال فنا ہو جانے والا ہے اس کی تعمیر و ترقی کو مقصدِ زندگی بنا کر آدمی کا جان کھپانا، جو احوال واسباب بہر حال ہمارے اپنے نہیں ہیں اُن پر بھروسہ کر بیٹھنا، اور جو مہلت سانسوں کی گنتی کے حساب سے مقرر اور کسی وقت بھی اچانک ختم ہو جانے والی ہے اس پر ریجھنا اور اس میں دل لگانا نادانی نہیں تو اور کیا ہے۔ پھر یہ دنیا اور اس کا سامان جو سب عارضی اور عاریت کی چیزیں ہیں ان کو اپنی ملک سمجھ کر ان میں مالک کے اذن اور اس کے منشاء کے خلاف تصرّف کرنے کی جسارت سے بڑھ کر بیوقوفی اور بد دیانتی کی بات کیا ہو سکتی ہے؟

حضرت ابوبکر صدیقؓ اپنی مناجات میں اللہ تعالیٰ سے عرض کیا کرتے تھے:

اَللّٰھُمَّ ابْسُطْ لِیَ الدُّنْیَا وَزَھِّدْنِیْ عَنْھَا.

''خدایا! دنیا کو میرے لیے فراخ فرما لیکن اس کے چکر میں پھنسنے اور اس میں مبتلا ہونے سے مجھے بچا[1]۔''

یعنی دنیا کا سامان اور اس کے ذرائع ووسائل تو مجھے عطا فرما تاکہ خوب دل کھول کر تیرے کام اور تیری راہ پر خرچ کروں اور تیرے شکر گزار بندوں میں شامل ہوں۔ لیکن اس کی اس طمع وحرص اور اس کی ایسی محبت سے بچا کہ اس کے چکر میں پھنس کر تجھ سے دُور ہو جاؤں۔ نیز یہ کہ تیری شکر گزاری کے ساتھ اہل فقر میں بھی شامل رہوں۔ اور میرا یہ فقر اضطرار اور مجبوری کا فقر نہ ہو بلکہ اختیاری اور خالصۃً تیری رضا کے لیے ہو۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ فقر اور درویشی کے کس درجہ پر فائز تھے وہ آپ کے اس خطبہ سے ظاہر ہوتا ہے جو آپ نے بیعت خلافت کے بعد خلیفہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت سے سب سے پہلے ارشاد فرمایا۔ آپؓ نے فرمایا:

[1] توراۃ میں ''امثال'' میں ہے: خدایا! میں نے تجھ سے دو باتوں کی درخواست کی ہے ان کو مجھ سے دریغ نہ فرما۔ بطالت اور دروغ گوئی کو مجھ سے دُور کر دے، اور مجھ کو نہ کنگال کر اور نہ دولت مند۔ میری ضرورت کے مطابق مجھے روزی دے، ایسا نہ ہو کہ میں سیر ہو کر تیرا انکار کروں اور کہوں، خدا کون ہے۔ یا مبادا محتاج ہو کر چوری کروں اور اپنے خدا کے نام کی تکفیر کروں۔

وَاللّٰهِ مَا كُنْتُ حَرِيْصًا عَلَى الْإِمَارَةِ يَوْمًا وَّلَا لَيْلَةً قَطُّ وَلَا كُنْتُ فِيْهَا رَاغِبًا وَلَا سَئَلْتُهَا اللّٰهَ قَطُّ فِيْ سِرٍّ وَّعَلَانِيَةٍ وَمَالِيْ فِي الْإِمَارَةِ مِنْ رَاحَةٍ.

''قسم ہے خدا کی میں نے کبھی ایک دن یا رات بھی امارت کی خواہش نہیں کی، نہ ہی میں اس کے لیے اپنے اندر کوئی رغبت رکھتا تھا اور نہ ہی میں نے کبھی خفیہ یا علانیہ خداوند تعالیٰ سے اسے مانگا اور نہ ہی امارت میں میرے لیے کوئی سامانِ راحت ہے۔''

پھر آپؓ نے فرمایا:

اَطِيْعُوْنِيْ مَا اَطَعْتُ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَإِنْ عَصَيْتُ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَلَا طَاعَةَ لِيْ عَلَيْكُمْ.

''یعنی میری اطاعت کرو جب تک میں اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرتا رہوں۔ لیکن اگر میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی نافرمانی کروں تو میری کوئی اطاعت تم پر نہیں ہے۔''

غیر اللہ سے آپؓ کا دل کس درجہ خالی اور خدا کے ساتھ اس کی وابستگی کا کیا عالم تھا یہ اس واقعہ سے ظاہر ہے جو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے وقت پیش آیا اور جسے اوپر تصوف سے متعلق باب میں ''اہل صوفی کے اوصاف'' کے تحت بیان کیا جا چکا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندے کو کمالِ صدق عطا فرماتا ہے تو اس کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ وہ ہمیشہ اپنے لیے خدا کے حکم کا منتظر رہتا ہے اور جو حالت اور جو صورت اللہ اس کے لیے پیدا کر دیتا ہے اسی پر وہ راضی ہو جاتا ہے۔ اگر فقیر ہونے کا حکم آوے تو فقیر ہو جاتا ہے اور امیر ہونے کا حکم ہو جائے تو امیر ہو جاتا ہے۔ وہ حکمِ الٰہی کے سامنے سرتاپا تسلیم و انقیاد ہوتا ہے۔ یہی صورت حضرت ابوبکر صدیقؓ کی تھی۔ نہ صرف یہ کہ آپ خدا اور اس کے رسولؐ کے احکام کے لیے سراپا تسلیم و انقیاد تھے بلکہ آپ نے مسلمانوں کو ہدایت فرمائی کہ اگر ان سے اس کے خلاف کوئی چیز ظاہر ہو تو وہ آپ کی اطاعت کے مکلف نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ آپؓ شریعت اور حقیقت دونوں میں مسلمہ امام و مقتدا ہیں۔

(۲) حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ

گودڑی پہننے اور دین پر سختی سے عمل کرنے میں صوفیاء کے مقتداء خلیفہ ثانی امیر المؤمنین حضرت عمر ابن خطاب رضی اللہ عنہ ہیں۔ دینی فراست ودانش، باریک بینی اور خدا کی محبت میں استغراق آپ کے ساتھ مخصوص ہیں۔ آپ کے بارے میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اَلحَقُّ یَنطِقُ عَلٰی لِسَانِ عُمَرَ یعنی عمر کی زبان سے حق بات ہی نکلتی ہے۔'' نیز آنحضرتؐ نے فرمایا: ''قَدْ کَانَ فِی الْاُمَمِ مُحَدِّثُوْنَ فَاِنْ یَکُ مِنْھُمْ فِیْ اُمَّتِیْ فَعُمَرُ یعنی پہلی امتوں میں محدث ہوتے رہے ہیں۔ اگر میری امت میں کوئی محدث (دین کے رموز سے آگاہی رکھنے والا اور اس بارے میں اتھارٹی) ہوگا تو وہ عمرؓ ہے۔''

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مرتبہ ومقام کا اندازہ اس امر سے بھی کیا جا سکتا ہے کہ جس روز آپ اسلام لائے ہیں، اسی روز حضرت جبرئیل علیہ السلام نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپؐ کو مبارکباد دیتے ہوئے یہ اطلاع دی: ''قَدِ اسْتَبْشَرَ یَامُحَمَّدُ اَھْلُ السَّمَاءِ بِاِسْلَامِ عُمَرَ. یعنی اے محمدؐ! عمر کے اسلام لانے پر تمام اہل آسمان خوشی منا رہے ہیں۔''

مؤطا امام مالک رحمۃ اللہ علیہ میں سیرۃ عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے باب میں حسب ذیل روایات آئی ہیں:

۱۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ:

رَأَیْتُ عمر بن الخطاب وَھُوَ یومئذٍ امیر المؤمنین وَقَدْ رَقَّعَ بین کتفیہ برقعٍ ثلٰثٍ لَبَّدَ بَعضُھا فوق بعض.

''میں نے حضرت عمرؓ بن خطاب کو جن دنوں آپ امیر المؤمنین تھے دیکھا کہ آپ کے دونوں کندھوں کے درمیان کرتے میں اوپر تلے تین پیوند لگے ہوئے تھے۔''

۲۔ انہی حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ کی دوسری روایت یہ ہے کہ:

رَأَیْتُ عمر بن الخطاب وَھُوَ یَومئذٍ امیر المؤمنین یطرح لہ صاع من

تَمرٍ فياكله حتّٰى ياكل حشفهَا.

''میں حضرت عمر بن خطاب کو جن دنوں آپ امیر المومنین کے منصب پر فائز تھے دیکھا کہ کچھ کھجوریں آپ کے سامنے پڑی تھیں اور آپ ان کو کھا رہے تھے، یہاں تک کہ سوکھی اور خراب بھی انھوں نے کھالیں۔''

۳۔ یہی انس بن مالکؓ بیان کرتے ہیں:

خَرَجْتُ معه حتی دخل حائطا وَسمعتة وهو وبيني وبينهٗ جدارٌ وهو فی جوف الحائط عمر بن الخطاب امير المؤمنين، بخ بخ يا ابن الخطاب لتتقيّن اللّٰه او ليُعَذِبنّک.

''(ایک روز) میں حضرت عمرؓ امیر المؤمنین کے ساتھ نکلا۔ یہاں تک کہ آپ ایک احاطہ میں داخل ہوگئے۔ میرے اور ان کے درمیان صرف دیوار حائل تھی۔ میں نے سنا کہ آپ اپنے آپ کو کہہ رہے تھے: خطاب کے بیٹے! تیرے لیے لازم ہے کہ تقویٰ کی راہ پر چلے ورنہ خدا تعالیٰ تجھے ضرور عذاب دے گا۔''

۴۔ زید بن اسلم رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیان کرتے ہیں کہ:

شرب عمر بن الخطاب لبنًا فَاَعْجَبَهٗ، فَسَأَلَ الّذی سقاهُ، مِن اينَ هٰذا اللّبَن؟ فَاَخْبَرَهٗ اَنَّهٗ وَرَدَ عَلٰى ماءٍ، قد سمّاهُ، فاذا نَعَمٌ من نَعَمِ الصَّدَقَةِ وهم يسقون فَحَلَبُوْا اِلَيَّ من البانها فجعلتهٗ فِی سقائی، فهو هٰذا، فَاَدْخَلَ عمر بن الخطاب يده فاستقاه.

''حضرت عمرؓ بن الخطاب نے ایک روز دودھ پیا اور یہ آپ کو بہت پسند آیا۔ جس شخص نے آپ کو یہ دودھ پلایا تھا اس سے آپ نے پوچھا: یہ دودھ تم نے کہاں سے لیا؟ اس نے آپ کو بتایا کہ میں راستے میں ایک پانی والی جگہ اترا۔ اُس نے اس جگہ کا نام بھی لیا۔ وہاں سرکاری اونٹوں میں سے کچھ اونٹ پانی پینے کے لیے آئے تو انھوں نے اُن کا دُودھ نکال کر مجھے دیا جسے میں نے اپنی مشک میں ڈال لیا۔ یہ وہی دودھ ہے۔ یہ سُن کر حضرت عمرؓ نے منہ میں انگلی ڈالی اور اُسے قے

کردیا۔''

واضح رہے کہ صدقہ کے (یعنی سرکاری) اونٹوں کا دودھ اس مسافر کے لیے بالکل جائز تھا اور اس کا حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اس کا ہدیہ کرنا بھی بالکل درست تھا۔ اس میں کوئی شرعی یا اخلاقی قباحت نہیں تھی۔ لیکن حضرت عمرؓ کا یہ کمال احتیاط تھا کہ مبادا لوگ ان کے اس فعل کو کھینچ تان کر سرکاری مال سے بالواسطہ استفادہ کے جواز کی کوئی صورت پیدا کرلیں۔ اس سے آپؓ کی دینی وسیاسی اور نفسیاتی فراست، خدا کی محبت میں آپ کا استغراق اور باریک بینی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

۵۔ زید بن اسلم رضی اللہ عنہ اپنے والد کے حوالہ سے بیان کرتے ہیں کہ:

خرج عبداللّٰه و عبیداللّٰه ابنا عمر بن الخطاب فی جیش الی العراق، فلمّا قفلا مرّا علٰی ابی موسٰی الاشعری وهو امیر البصرة، فرحّب بهماوَسهّل، ثُمّ قال لَوْ اَقْدِرُ لکما علٰی امرٍ اَنْفَعُکُمَا بِهٖ لَفَعَلْتُ، ثم قال بلٰی هنا مالٌ من مال اللّٰه اُریداَنْ ابعث بهٖ الٰی امیر المؤمنین ویکون لکما الربح، فقال وَدِدْنَا، ففعل و کتب الی عمر بن الخطاب ان یَاخُذَ مِنهُمَا المال، فلمّا قد ما بَاعَا فَاَرْبَحَا ، فلمّا دفعا ذالک الی عمر بن الخطاب قَال اَکُلَّ الْجَیْشِ اسلف مثل اسلفکما؟ قال: لَا، فقال عمر بن الخطاب: ابنا امیر المؤمنین، فاسلفکما، ادّیالمال وربحه، فَاَمَّا عبداللّٰه فَسَکَتَ، و امّا عبیداللّٰه فقال: ما ینبغی یا امیر المؤمنین هذا، لونقص المال اوهلک لَضَمِنَّاهُ، فقال رجل من جلساء عمر یا امیر المؤمنین لَوْجعلته قرامنًا، فقال عمر قد جعلته قراضًا، فقال عمر قد جعلته قراضًا فَاَخَذَ عمر راس المال ونصف ربحة وَاخذ عبداللّٰه وعبیداللّٰه نصف ربح المال.

''حضرت عمر بن خطابؓ کے بیٹے عبداللہ اور عبیداللہ ایک لشکر کے ساتھ عراق گئے اور وہاں سے واپسی پر وہ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ جوان دنوں بصرہ کے گورنر تھے ان کے پاس گئے تو وہ ان کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے اور ان کی آؤ بھگت کی۔ پھر ان سے کہا: اگر تمھیں نفع پہنچانے والا کوئی کام

میرے اختیار میں ہوتا تو ضرور کرتا۔ اس کے بعد آپؓ نے کہا: ہاں، یہاں بیت المال کا کچھ روپیہ ہے جسے مجھے امیر المؤمنین کے پاس بھیجنا ہے۔ اس سے تمھارے لیے نفع کی صورت ہو سکتی ہے۔ انھوں نے کہا کہ اگر ایسا ہو جائے تو بہت اچھا ہے۔ چنانچہ ابو موسیٰ اشعری نے وہ رقم ان کو دے دی اور عمرؓ بن خطاب کو لکھ دیا کہ وہ یہ رقم ان سے وصول کر لیں۔ چنانچہ عبداللہ اور عبیداللہ نے اس رقم سے وہاں سے کچھ مال خرید لیا، اور جب واپس پہنچے تو اسے بیچ دیا اور اس سے ان کو نفع ہوا۔ پھر جب انھوں نے وہ بیت المال کی رقم حضرت عمرؓ کے سامنے پیش کی، تو انھوںؓ نے ان سے پوچھا کہ کیا سارے لشکر کو اسی طرح رقم دی گئی تھی؟ ان لوگوں نے جواب دیا کہ نہیں۔ اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا: تم امیر المؤمنین کے بیٹے جو تھے اس لیے تم دونوں پر یہ عنایت ہوئی، لاؤ سارا مال اور اس کا نفع۔ عبداللہ تو یہ سن کر خاموش رہے لیکن عبیداللہ نے عرض کیا: یا امیر المؤمنین یہ مناسب نہیں ہے۔ اگر مال نقصان یا برباد ہو جاتا تو ہم تو اس کے ضامن اور ادائیگی کے ذمہ دار تھے۔ مگر حضرت عمرؓ نے فرمایا: (نہیں) سب لاؤ۔ عبداللہ پھر خاموش رہے اور عبیداللہ نے اپنی وہی بات دہرائی۔ اس پر حضرت عمرؓ کے پاس بیٹھے ہوئے لوگوں میں سے ایک نے کہا: یا امیر المؤمنین! میرے خیال میں شراکت کا معاملہ فرما لیجئے۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے شراکت کی صورت کو مان لیا اور پوری رقم اور آدھا نفع وصول کر لیا۔ اور آدھا نفع عبداللہ اور عبیداللہ نے لے لیا۔''

اس سے بھی صاف ظاہر ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کس درجہ محتاط، صاحب فراست اور باریک بین تھے۔

۶۔ یحییٰ بن سعید رضی اللہ عنہ قحط سالی کے زمانے کا یہ واقعہ بیان کرتے ہیں کہ:

ان عمر الخطاب كان ياكل خبزًا بِسَمْنٍ فدعا رجلاً من اهل البادية فجعل يأكُلُ ويتبع باللقمة وَضرَ الصَّحفَة، فقال لهٗ عمر كانّک مُقفِرٌ، فقال: والله ما اَكَلْتُ سَمْنًا وَلا رائتُ اكلا به منذ كذا و كذا، فقال عمر: لا اٰكُلُ السّمن حتّى يحى الناس من اوّل مايُحْيَون.

''حضرت عمرؓ بیٹھے روغن سے روٹی کھا رہے تھے اور دیہات سے آئے ہوئے لوگوں میں

سے ایک شخص کو (جو نظر پڑا) آپ نے آواز دے کر اپنے ساتھ کھانے پر بٹھالیا۔ وہ شخص رکابی میں ثری کے پیچھے اپنے لقمہ کو پھراتا۔ یہ دیکھ کر حضرت عمرؓ نے اس سے کہا: معلوم ہوتا ہے کہ تم بھی خشک سالی سے متاثر لوگوں میں سے ہو۔ اس نے عرض کیا: خدا کی قسم اتنی مدت سے (اس نے کچھ مدت بتائی) نہ میں نے گھی کھایا ہے اور نہ کسی کو کھاتے دیکھا ہے۔ یہ سن کر حضرت عمرؓ نے کہا: جب تک لوگوں کو بارش سے پھر وہی خوش حالی نہ حاصل ہو جائے جو انہیں پہلے حاصل تھی، میں بھی گھی نہیں کھاؤں گا۔''

۷۔ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی مؤطا میں حضرت عمرؓ کے حسب ذیل دو اقوال بھی درج فرماتے ہیں:

(۱) اَنَّ عمر بن الخطاب کان یقول: اللّٰھُمَّ اِنِی اَسالک شھادۃ فی سبیلک وفاۃً بِبَلَدِ رَسُوْلِکَ.

''حضرت عمرؓ بن خطاب دعا کیا کرتے تھے کہ خدایا! میں تجھ سے تیری راہ میں قربان ہو جانے کی سعادت مانگتا ہوں اور تیرے رسول کے شہر میں موت کی درخواست کرتا ہوں۔''

(۲) انَ عمر بن الخطاب کان یقول کرم المؤمن تقوٰہُ و دینُہ حسبُہ ومروّتہ خُلُقُہٗ وَالْجُرْاَۃُ وَالْجُبْنُ غَرَایِزُ یضعھا اللّٰہ حیث یشاء، فَالْجبانُ یفرُّعن ابیہ وامّہ وَالْجرِیُ یقاتل عَمَّنْ لا یؤبُ بہٖ الیٰ رحلہ، والقتل حتفٌ مِن الحتوف والشھید من احتسبَ نفسہ علی اللّٰہ.

''حضرت عمرؓ فرمایا کرتے تھے: مومن کی بڑائی اس کے تقویٰ میں ہے۔ اس کے لیے فخر کی چیز اس کا مطمع دین ہونا ہے اور اس کی بہادری اس کا ہر حالت میں پابندِ اخلاق ہونا ہے۔ باقی رہا کسی شخص کا جرأت مند رو دلیر یا بزدل (دل کا مضبوط یا کمزور) ہونا تو یہ چیزیں آدمی کی طبیعت پر منحصر ہیں، اللہ جہاں چاہتا ہے ان کو رکھ دیتا ہے۔ البتہ بزدل آدمی اپنی ماں اور باپ کو بھی خطرے میں چھوڑ کر بھاگ جاتا ہے اور جری آدمی ایک بالکل اجنبی (جس کے گھر کا بھی اسے پتہ نہیں ہوتا اس) کے لیے بھی لڑ جاتا ہے۔ رہا قتل تو موت کی مختلف صورتوں میں سے ایک صورت

یہ بھی ہے۔ مگر شہید وہ ہے جو صرف خدا سے اجر کی توقع پر اپنے آپ کو بری اور ناپسندیدہ باتوں سے روکے''۔

آپ کی دینی فراست اور آپ کی دانش اور جزرسی دیکھیے کس طرح علم وفلسفہ کا سارا نچوڑ چند لفظوں میں نکال کر رکھ دیا ہے۔ (مصفیٰ شاہ ولی اللہؒ جلد ثانی مطبوعہ کتب خانہ رحیمیہ دہلی)۔

حضرت عمرؓ کے رموز ونکات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ: ''اَلْعُزْلَةُ رَاحَةٌ مِنْ خُلَطَاءِ السُّوْءِ، بری صحبت کے مقابلہ میں گوشہ نشینی میں بڑی راحت ہے۔'' لیکن آپ کی مراد اس سے یہ نہیں ہے کہ دنیا جہان کو چھوڑ کر آدمی کہیں الگ جا بیٹھے۔ گوشہ نشینی کی دو قسمیں ہیں۔ ایک گوشہ نشینی تو یہ ہے کہ آدمی اپنے ہم جنسوں سے تعلق منقطع کر کے اور خلقت سے منہ موڑ کر کسی علیحدہ جگہ میں جا بیٹھے۔ اور اس کی دوسری قسم یہ ہے کہ ان کے اندر رہتے ہوئے اور ان سے معاملات کرتے ہوئے دل کا تعلق ان کے بجائے خداوند تعالیٰ سے رکھے۔ اس صورت میں وہ مخلوقات میں رہتے ہوئے بھی مخلوق سے علیحدہ اور گوشہ نشین ہوتا ہے۔ یہ مقام بہت بلند ہے اور اس میں حضرت عمرؓ سب سے بڑھ کر تھے۔ بظاہر آپ امارت اور خلافت کا سارا کام کرتے تھے مگر آپ کا دل اور آپ کا باطن ان سب کاموں سے علیحدہ خدا کی طرف لگا رہتا تھا۔ اسی لیے آپ نے عزلت (گوشہ نشینی) کو راحت فرمایا۔ ورنہ دنیا سے الگ ہو کر تو آپ ایک دن بھی کہیں گوشہ نشین نہیں ہوئے تھے۔

اہل صفا وحقیقت مخلوق سے جس قدر تعلق رکھتے ہیں اُسے خداوند تعالیٰ کی طرف سے بلا اور آزمائش سمجھتے ہیں لیکن اس تعلق میں وہ خدا سے کبھی غافل نہیں ہوتے۔ چنانچہ حضرت عمرؓ نے فرمایا: ''دَارٌ اُسِسَتْ عَلَی الْبَلْوٰی فَلَا بَلْوٰی مُحَالٌ یعنی جس گھر کی بنیاد ہی آزمائش پر رکھی گئی ہے اس میں آزمائش اور بلا سے چھٹکارا ممکن نہیں۔'' آپ کا یہ ارشاد اہل حق وصفا کے لیے مشعلِ راہ ہے۔ اس امتحان گاہ میں فراغت اور راحت وآرام کی کوئی جگہ نہیں۔ جیسا کہ حدیث قدسی میں ہے: میں نے آرام کو جنت میں رکھ دیا ہے، لوگ اُسے دنیا میں تلاش کرتے ہیں، بھلا وہ اس کو یہاں کیسے پائیں گے؟'' اس لیے جس کو آرام اور راحت کی تلاش ہو وہ اس دار البلاء وامتحان میں

خدا کی رضا کی راہ کو اختیار کرے اور اس پر جما رہے۔اس امتحان گاہ سے باہر نکلتے ہی اسے وہ آرام اور راحت حاصل ہوں گے جن کا آغاز تو ہے لیکن اختتام اور حد کوئی نہیں۔

(۳) حضرت عثمان ذوالنورین رضی اللہ تعالیٰ عنہ

امیر المؤمنین حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ شرم وحیا اور تسلیم ورضا میں صوفیاء کے امام ہیں۔حضرت عثمانؓ تسلیم ورضا کے کس مقام پر فائز تھے اس کا اندازہ عبداللہؓ بن رباح اور ابوقتادہؓ کی اس چشم دید شہادت سے کیا جا سکتا ہے کہ ''حرب الدار'' کے روز ہم اس وقت حضرت عثمانؓ کے پاس موجود تھے جب کہ آپؓ کے خلاف ہنگامہ برپا کرنے والے آپؓ کے دروازے پر اکٹھے ہوئے۔آپؓ کے غلاموں نے مقابلہ کے لیے ہتھیار اٹھائے لیکن حضرت عثمانؓ نے ان کو منع فرما دیا اور انھیں اس سے باز رکھنے کے لیے ان سے کہا کہ تم میں سے جو اس سے باز رہیں گے ان کو میں فی سبیل اللہ آزاد کر دوں گا۔ان حضرات کا بیان ہے کہ جب ہنگامہ نے بہت خطرناک صورت اختیار کر لی تو ہم اپنی جان بچانے کے لیے وہاں سے اٹھ آئے۔راستہ میں ہمیں علیؓ کا بیٹا حسنؓ ملا جو کہ حضرت عثمانؓ کے پاس جا رہا تھا۔ہم یہ دیکھنے کے لیے کہ یہ کس غرض سے حضرت عثمانؓ کے پاس جا رہے ہیں حسنؓ کے ساتھ ہو گئے۔حضرت حسنؓ نے سلام اور صورت حال پر اظہار افسوس کے بعد عرض کیا کہ اے امیر المؤمنین! میں آپ کے فرمان کے بغیر تلوار نہیں اٹھا سکتا۔آپ امامِ برحق ہیں، آپ مجھے حکم دیجیے تا کہ میں اس بلا کو آپ سے دفع کروں۔ان کی اس گزارش کے جواب میں حضرت عثمان رضی اللہ نے فرمایا: ''**یَاابنَ اَخِیْ اِرْجِعْ وَاجلِسْ فِیْ بَیْتِکَ حَتّٰی یَاتِیَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ فَلَا حَاجَةَ لَنَا فِیْ اِهْرَاقِ الدِّمَاءِ.** یعنی بھتیجے! واپس چلے جاؤ اور اپنے گھر میں بیٹھو یہاں تک کہ اللہ کا حکم پورا ہو جائے۔ہمیں خون بہانے کی ضرورت نہیں۔''

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا یہ طرزِ عمل حضرت ابراہیم خلیل اللہ کے اس طرزِ عمل کے بالکل مماثل اور اس کا ہم پلّہ ہے جو اُن سے آتش نمرود کی آزمائش کے وقت ظہور میں آیا۔نمرود نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کا خاتمہ کرنے کے لیے آگ جلائی۔جب آگ پوری طرح سے بھڑک

اٹھی تو آپ کو اس میں پھینکنے کے لیے گوپیے میں رکھا اور گوپیے کو چلا دیا۔ اس لمحے حضرت جبرئیل علیہ السلام تشریف لائے اور حضرت خلیلؑ سے عرض کیا: ''هَلْ لَکَ اِلَیَّ مِنْ حَاجَةٍ؟ یعنی میرے لائق کوئی خدمت ہو تو ارشاد فرمائیے۔'' حضرت خلیل اللہؑ نے فرمایا: ''اَمَّا اِلَیْکَ فَلَا حاجت تو ہے مگر تجھ سے کوئی نہیں''۔ حضرت جبرئیلؑ نے بے قرار ہو کر عرض کیا کہ اچھا جو مدد درکار ہے وہ خدا ہی سے مانگیے۔ حضرت خلیل علیہ السلام نے فرمایا: ''حَسْبِیْ مِنْ سُوَالِیْ عِلْمُهٗ بِحَالِیْ اس کی درگاہ میں سوال کی کیا ضرورت ہے وہ میرے حال کو خوب جانتا ہے۔'' یہاں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی حالت وہی تھی جو حضرت خلیل علیہ السلام کی گوپیے میں تھی۔ حضرت حسنؓ اسی غرض سے آپ کے پاس آئے جس کے لیے حضرت جبرئیل علیہ السلام حضرت خلیلؑ کے پاس آئے تھے۔ اس پیش کش کا جواب دونوں حضرات کی طرف سے بالکل ایک سا تھا۔ فرق یہ تھا کہ حضرت خلیلؑ کو تو اس بلا سے نجات مل گئی لیکن حضرت عثمانؓ اس بلا کی نذر ہو گئے۔

یہاں اس امر کو ذہن نشین کر لینا ضروری ہے کہ نجات کا تعلق بقاء کے ساتھ ہے فنا کے ساتھ نہیں ہے اور ہلاکت کا تعلق فنا کے ساتھ ہے بقا کے ساتھ نہیں۔ نجات اور کامیابی اس کی ہے جس نے اس دنیا کی فانی اور محدود زندگی اور متاع کے عوض آخرت کی دوامی زندگی اور غیر محدود متاع کو چھوڑ کر دنیا کی عارضی زندگی اور نہایت قلیل متاع کو پانے کی کوشش کی۔

خدا کی راہ میں جان و مال کا ایثار کرنے میں، تسلیم و رضا میں اور عبادت کے اخلاص میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کا مقام بہت بلند ہے۔ اور ان سب باتوں میں آپؓ شریعت اور حقیقت میں امام و مقتداء ہیں۔

(۴) حضرت علی المرتضیٰ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

امیر المؤمنین حضرت علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کی راہِ طریقت میں بڑی شان اور ان کا مرتبہ بہت بڑا ہے۔ علم اور فہم دین میں آپ کا مرتبہ بہت ہی بلند ہے اور اصولِ حقیقت کے بیان اور وضاحت میں آپؓ بے نظیر ہیں۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے آپؓ کے بارے میں فرمایا: ''اَنَا مَدِیْنَةُ الْعِلْمِ وَعَلِیٌّ بَابُهَا یعنی میں علم کا شہر ہوں اور علیؓ اس کا دروازہ ہے۔'' آپؓ کے

ایثار وقربانی کا یہ عالم تھا کہ جس روز کفار مکہ نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کا منصوبہ بنا رکھا تھا، آپ اس رات حضورؐ کی جگہ انؐ کے بستر پر سوئے تا کہ حضورؐ مکہ سے نکل جائیں اور کفار کو بستر خالی دیکھ کر تجسس نہ ہو۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کے رُو برو فخر فرمایا۔

حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''شَیْخُنَا فِی الْاُصُوْلِ وَالْبَلَاءِ عَلِیُّ الْمُرْتَضٰی کَرَّمَ اللّٰهُ وَجْهَهٗ. ابتلاؤں کے مقابلہ اور علم طریقت میں ہمارے پیشوا علیؓ مرتضیٰ ہیں۔'' ایک مرتبہ کسی شخص نے آپؓ سے عرض کیا: اے امیر المومنین! آپ مجھے کوئی نصیحت فرمائیں۔ حضرت علی مرتضیٰؓ نے فرمایا: ''لَاتَجْعَلَنَّ اَکْبَرَ شُغْلِکَ بِاَهْلِکَ وَوَلَدِکَ، فَاِنْ یَّکُنْ اَهْلُکَ وَوَلَدُکَ مِنْ اَوْلِیَاءِ اللّٰهِ تَعَالٰی فَاِنَّ اللّٰهَ تَعَالٰی لَا یَضِیْعُ اَوْلِیَائَهٗ وَاِنْ کَانُوْا اَعْدَاءَ اللّٰهِ فَمَا هَمُّکَ وَشُغْلُکَ لِاَعْدَاءِ اللّٰهِ سُبْحَانَهٗ. یعنی اپنے اہل وعیال سے انہماک تیرا سب سے بڑا مشغلہ نہ بن جائے۔ یاد رکھ کہ اگر تیرے اہل وعیال خدا کے دوست ہیں تو اللہ اپنے دوستوں کو کبھی ضائع نہیں فرمائے گا، اور اگر وہ خدا کے دشمن ہیں تو اللہ پاک کے دشمنوں سے تجھے کیا سروکار؟'' آپؓ کے اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کو چاہیے کہ حق تعالیٰ کے ماسوا کسی اور چیز سے اپنے دل کا ایسا تعلق نہ رکھے جو اللہ سے اس کے تعلق کی راہ میں حائل ہو بلکہ دوسرا ہر تعلق اس کے تابع ہو۔ جو حکم خدا کا ہو اسے بلا چون وچرا اور بلا تامل پورا کرے، اور جس حال میں بھی خداوند تعالیٰ اسے مبتلا فرمائے اس پر راضی ہو۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو دیکھیے کہ بیابان میں جب کہ وہ انتہائی بے یار ومددگاری اور مسافرت کی حالت میں آگ کی ایک چنگاری کے لیے پریشان پھر رہے تھے، اللہ تعالیٰ نے اچانک ایک نہایت خطرناک[1] اور جان لیوا کام سپرد کر کے حکم دے دیا کہ: ''اِذْهَبْ اِلٰی فِرْعَوْنَ اِنَّهٗ طَغٰی o فَقُلْ هَلْ لَّکَ اِلٰٓی اَنْ تَزَکّٰی o (۷۹: ۱۷۔۱۸) جاؤ فرعون کے پاس وہ باغی ہو گیا ہے۔ اور اس سے پوچھو کہ تیری نیت درست ہونے کی ہے؟'' اور موسیٰ علیہ السلام ایک لاٹھی لے کر تعمیلِ ارشاد کے لیے چل دیے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حکم ہوا کہ ہاجرہؓ اور اسمٰعیلؑ کو جب کہ وہ ابھی ایک دودھ پیتے بچے تھے،

[1] یاد رہے کہ فرعون کے دربار سے موسیٰ علیہ السلام کے قتل کا فیصلہ صادر ہو چکا تھا اور اسی وجہ سے وہ آٹھ دس سال پہلے وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے تھے اور اب اسی فرعون کے پاس جانے اور اسے یہ پیغام پہنچانے کا حکم دیا جا رہا تھا۔

بے آب وگیاہ ریگستان میں چھوڑ آؤ، اور آپ نے بلا تامل اور بلا تردد ان کو اٹھایا اور لق و دق ریگستان میں خدا کے سپرد کر کے رخصت ہو گئے۔

ایک اور موقعہ پر ایک شخص نے آپؑ سے سوال کیا کہ سب کسبوں سے پاکیزہ کسب کون سا ہے؟ حضرت علی نے فرمایا: ''غِنَاءُ الْقَلْبِ بِاللّٰہِ یعنی تیرا دل اللہ کو اس طرح پالے کہ اس کے سوا ہر چیز سے بے پروا ہو جائے۔'' آپؑ کے نکات بے شمار ہیں۔ اہل طریقت کے لیے لازم ہے کہ عبارتوں کی حقیقتوں اور اشارات کی باریکیوں اور دنیا اور آخرت کی حقیقت کو سمجھنے میں ان کی اقتداء کریں۔

اہلِ بیت میں اہلِ طریقت کے پیشوا

(۱) حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما:

حضرت حسن رضی اللہ عنہ بھی اپنے والد بزرگوار کی طرح سے حقائق اور علم طریقت میں نہایت بلند مرتبہ کے مالک ہیں۔ اس کا کچھ اندازہ اس امر سے کیا جاسکتا ہے کہ جب قدریوں نے غلبہ حاصل کیا اور معتزلہ کا مذہب بہت پھیل گیا تو حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے کمال علم وفضل کے باوجود حضرت حسنؓ کی طرف حسب ذیل خط لکھا:

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلسَّلَامُ عَلَيْكَ يَاابْنَ رَسُوْلِ اللّٰهِ وَقُرَّةَ عَيْنِهٖ وَرَحْمَةُ اللّٰهِ وَبَرَكَاتُهٗ، اَمَّا بَعْدُ: فَاِنَّكُمْ مَعَاشِرُ بَنِىْ هَاشِمَ كَالْفُلْكِ الْجَارِيَةِ فِىْ بَحْرٍ لُّجِّيٍّ وَمَصَابِيْحُ الدُّجٰى وَاَعَلَامُ الْهُدٰى وَالْاَئِمَّةُ الْقَادَةُ الَّذِيْنَ مَنْ تَبِعَهُمْ نَجٰى كَسَفِيْنَةِ نُوْحِ الْمَشْحُوْنَةِ الَّتِىْ يَؤُلُ اِلَيْهَا الْمُؤْمِنُوْنَ وَيَنْجُوْا فِيْهَا الْمُتَمَسِّكُوْنَ فَمَا قَوْلُكَ يَاابْنَ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عِنْدَ حَيْرَتِنَا فِى الْقَدْرِ وَاخْتِلَافِنَا فِى الْاِسْتِطَاعَةِ لِتُعْلِمَنَا بِمَا تَاَكَّدَ عَلَيْهِ رَاْيُكَ فَاِنَّكُمْ ذُرِّيَّةٌ بَعْضُهَا مِنْ بَعْضٍ بِعَلْمِ اللّٰهِ عَلِمْتُمْ وَهُوَ الشَّاهِدُ عَلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ شُهَدَآءُ اللّٰهِ عَلَى النَّاسِ. وَالسَّلَامُ.

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

''خدا کا سلام ہو تم پر اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے نور نظر اور ان کی آنکھوں کی ٹھنڈک اور خدا کی رحمتیں اور برکتیں ہوں آپ پر۔ گزارش ہے کہ آپ بنی ہاشم کے لوگ ان کشتیوں کی مانند ہو جو نہایت گہرے سمندر میں چل رہی ہوں اور آپ لوگ وہ درخشاں ستارے، رُشد

وہدایت کے وہ نشان اور وہ امام وقائد ہیں جن کی جو شخص فرمانبرداری اور پیروی کرے گا وہ اسی طرح سے نجات پائے گا جیسے حضرت نوحؑ کی کشتی میں سوار ہونے والے مومنین نے نجات پائی تھی۔ پس اے ابنِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ ہماری اس پریشانی میں جو قدر اور استطاعت (جبر وقدر) کے مسئلہ کو سمجھنے کے بارے میں ہمیں باقی ہو رہی ہیں' کیا فرماتے ہیں؟ (آپ اس بارے میں وضاحت فرمائیں) تاکہ ہم جانیں کہ اس معاملے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ آپ جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد ہیں۔ آپ لوگوں نے اللہ کے علم سے علم پایا ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ لوگوں پر نگہبان اور گواہ ہے اور آپ لوگ باقی مخلوقات پر نگہبان اور گواہ ہیں۔''

حضرت حسن بصریؒ کے اس خط کا حضرت حسنؓ نے حسب ذیل جواب دیا:

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَمَّا بَعْدُ: فَقَدِ انْتَهٰى اِلَيَّ كِتَابُكَ عِنْدَ حَيْرَتِكَ وَحَيْرَةِ مَنْ زَعَمْتَ مِنْ اُمَّتِنَا وَالَّذِىْ عَلَيْهِ رَاْيِىْ اِنَّ مَنْ لَّمْ يُؤْمِنْ بِالْقَدْرِ خَيْرِهٖ وَشَرِّهٖ مِنَ اللّٰهِ تَعَالٰى فَقَدْ كَفَرَ. وَمَنْ حَمَلَ الْمَعَاصِىَ عَلَى اللّٰهِ فَقَدْ فَجَرَ. اِنَّ اللّٰهَ لَا يُطَاعُ بِاِكْرَاهٍ وَّلَا يُعْصٰى بِغَلَبَةٍ وَّلَا يُهْمِلُ الْعِبَادُ فِىْ مُلْكِهٖ. لٰكِنَّهُ الْمَالِكُ لِمَا يَمْلِكُهُمْ وَالْقَادِرُ عَلٰى مَا عَلَيْهِ قَدْرُهُمْ. فَاِنِ ائْتَمَرُوْا بِالطَّاعَةِ لَمْ يَكُنْ لَّهُمْ اِخْتِيَارًا وَّلَا لَهُمْ عَنْهَا مُثَبِّطًا وَاِنْ اَتَوْا بِالْمَعْصِيَةِ وَشَاءَ اَنْ يَّمُنَّ عَلَيْهِمْ فَيَحُوْلَ بَيْنَهُمْ وَبَيْنَهَا، فِعْلٌ وَاِنْ لَّمْ يَفْعَلْ، فَلَيْسَ هُوَ حَمَلَهُمْ عَلَيْهَا اِجْبَارًا وَّلَا اَلْزَمَهُمْ اِكْرَاهًا اِيَّاهَا بِاِحْتِجَاجِهٖ عَلَيْهِمْ اِنْ عَرَفَهُمْ وَمَكَّنَهُمْ وَجَعَلَ لَهُمُ السَّبِيْلَ خُذُوْا مَا دَعُوْهُمْ اِلَيْهِ وَاتْرُكُوْا مَانَهٰهُمْ عَنْهُ وَلِلّٰهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ. وَالسَّلَامُ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

کے بعد واضح ہو کہ آپ کا خط مجھے موصول ہوا جس میں آپ نے اپنی اور امت کے دوسرے لوگوں کی پریشانی کا اظہار کیا ہے۔ اس مسئلہ میں میری رائے یہ ہے کہ جو شخص اچھی اور بری تقدیر کے خدا کی طرف سے مقدر ہونے کو نہیں مانتا ہے وہ کافر ہے اور جو اپنے ارتکاب گناہ کا

ذمہ دار خدا کو ٹھیراتا ہے وہ صریحاً بدکار آدمی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ نہ کسی کو اطاعت پر مجبور کرتا ہے اور نہ گناہ پر، اور نہ اس نے بندوں کو اپنی سلطنت میں شتر بے مہار بنا کر چھوڑ دیا ہے۔ بندوں کی تمام مملوکات کا اصل مالک اور جن چیزوں پر وہ قدرت رکھتے ہیں ان پر اصل قدرت رکھنے والا وہی (اللہ) ہے۔ اگر بندوں کو اطاعت پر مجبور کر دیا جاتا تو ان کے لیے کوئی اختیار باقی نہ رہتا اور ان کے لیے اطاعت کے سوا کوئی چارہ نہ ہوتا۔ اور اگر وہ گناہ کرنے لگتے اور اس کی مشیت ان پر کرم کرنا چاہتی یعنی انھیں ایسا کرنے سے زبردستی روک دیا جاتا، تو وہ ان کے اور اس گناہ کے درمیان حائل ہو جاتا۔ مگر اس صورت میں ان کا فعل اور عدم فعل برابر ہو جاتے۔ پس اللہ تعالیٰ نے بندوں کو نہ معصیت اور گناہ پر مجبور کیا ہے اور نہ اطاعت کے لیے......اس نے ان کو علم و معرفت اور قوت دے کر ان کے لیے راستہ کھلا چھوڑ دیا ہے پس تم وہ بات اختیار کرو جس کی طرف اللہ نے بلایا ہے اور اس کو چھوڑ دو جس سے اس نے منع فرمایا ہے۔ یاد رکھو تم اللہ سے بحث و حجت میں بازی نہیں لے جا سکتے۔ بحث و حجت میں وہی غالب رہے گا۔''

ایک دوسری حکایت جس سے حضرت حسنؓ کے تحمل اور بردباری کا اندازہ کیا جا سکتا ہے یہ ہے کہ ایک روز آپ کوفہ میں اپنے مکان کے باہر تشریف فرما تھے کہ جنگل سے ایک اعرابی آیا اور اس نے آتے ہی آپ کو ماں باپ کی گالیاں دینی شروع کر دیں۔ آپ نے اس کے جواب میں اس سے پوچھا: اے اعرابی! کیا تجھے بھوک لگی ہے یا پیاس یا تجھے کوئی اور تکلیف ہے؟ اس کے باوجود وہ اعرابی آپ کو یہی کہے جا رہا تھا کہ تیری ماں ایسی تھی اور باپ ایسا تھا۔ حضرت حسنؓ نے غلام کو حکم دیا کہ گھر میں روپیوں کا جو تھیلا رکھا ہے وہ لا کر اس کو دے دو۔ اور یہ دینے کے ساتھ فرمایا: برادر! مجھے معاف کیجیے، گھر میں اس کے سوا کوئی روپیہ نہیں ورنہ میں تجھ سے دریغ نہ کرتا۔ اعرابی نے یہ سنا تو بے اختیار ہو کر بول اٹھا: اَشْهَدُ اَنَّکَ ابْنُ رَسُوْلِ اللّٰهِ یعنی خدا کی قسم! آپ فی الواقع رسول اللہ کی اولاد ہیں۔

(۲) حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ:

آپؓ اہل بلاء کے قبلہ اور سردار ہیں۔ تمام اہل طریقت ان کے حال کی دُرستی پر متفق ہیں۔ اس لیے کہ جب تک حق ظاہر رہا آپ اس کے پیرو اور متبع رہے اور جب حق گم ہوا تو آپ نے تلوار نکال لی اور جب تک اقامت حق کے لیے جان و مال اور اعزا سب کچھ قربان کر دیا چین نہ لیا۔ آپ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس قدر محبت تھی کہ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ ایک روز میں حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا تو کیا دیکھتا ہوں کہ آپؐ نے حضرت حسینؓ کو اپنی پشت پر بٹھایا ہوا ہے اور ایک دھاگہ اپنے منہ میں لے کر حسینؓ کے ہاتھ میں پکڑا دیا ہے اور حسینؓ آپؐ کو چلاتے ہیں اور آپ (اونٹ کی مانند) گھٹنوں پر چلتے ہیں۔ میں (حضرت عمرؓ) نے دیکھ کر کہا: ''نِعْمَ الْجَمَلُ جَمَلُکَ یَااَبَا عَبْدِاللّٰهِ! کیا ہی خوب ہے تیرا اونٹ اے حسین۔'' حضورؐ نے فرمایا: ''نِعْمَ الرَّاکِبُ هُوَ یَاعُمَرُ، اے عمر! سوار بھی بہت اچھا ہے۔''

طریق حق کے سلسلے میں حضرت حسینؓ کا کلام بہت ہے۔ آپ کا ارشاد ہے: اَشْفَقُ الْاِخْوَانِ عَلَیْکَ دِیْنُکَ یعنی بھائیوں سے بڑھ کر تیرا دین تجھ پر شفقت کرنے والا ہے۔ ظاہر ہے کہ بھائی وہ ہوتے ہیں جو انسان کی ہمیشہ خیر خواہی کریں، ہمیشہ اسے صحیح راہ دکھائیں اور کبھی اسے غلط اور نقصان کی راہ نہ دکھائیں۔ اس سلسلے میں کوئی بھائی ''دین'' کی برابری نہیں کر سکتا، اور عقلمند اور شریف وہ ہوتا ہے جو اپنے شفقت کرنے والے کو اپنا شفیق جانے، اس کے حکم کی پیروی کرے اور اس کی فرمانبرداری سے باہر قدم نہ رکھے۔

حکایات میں ہے کہ ایک روز ایک شخص آپ کے پاس آیا اور اس نے عرض کیا: اے ابن رسول صلی اللہ علیہ وسلم! میں ایک حاجت مند آدمی ہوں اور میرے چھوٹے چھوٹے بچے ہیں۔ آج رات کی خوراک آپ سے چاہتا ہوں۔ حضرت حسین رضی اللہ عنہ جو غالباً خود اسی حالت میں مبتلا تھے، اس لیے آپ نے فرمایا: بیٹھ جاؤ، میرا رزق چلا آ رہا ہے، آ جائے تو آپ کو دیتا ہوں۔ کچھ دیر

بعد ایک ہزار سرخ دینار کی پانچ تھیلیاں امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کی طرف سے ایک شخص لایا اور اس نے امیر معاویہؓ کا سلام دیتے ہوئے عرض کیا کہ وہ عذر رخواہی کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ سر دست اس سے کام چلائیں پھر اور بھیج دیں گے۔ حضرت حسینؓ نے وہ پانچوں تھیلیاں اس حاجت مند کو دے دیں اور ساتھ ہی معذرت کرتے ہوئے فرمایا: بھائی ہم اہل بلا (سخت آزمائش میں مبتلا) ہیں۔ ہم نے دنیا کی تمام خوشیاں ترک کر دی ہیں اور اپنی مرادیں اور ضروریات کم کر لیں ہیں۔ مجھے افسوس ہے کہ میں نے آپ کو اتنی دیر انتظار کی زحمت دی اور اس سے زیادہ کچھ نہ دے سکا۔

(۳) حضرت ابوالحسن علی زین العابدینؓ بن حسینؓ بن علیؓ بن ابی طالب

المعروف علی اصغر رضی اللہ عنہ

آپ مظلومین کے سردار اور اپنے زمانے کے سب لوگوں سے زیادہ عبادت کرنے والے تھے۔ کشفِ حقائق اور باریکیوں کے بیان کرنے میں آپ کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ آپ سے کسی نے پوچھا کہ دنیا اور آخرت میں سب سے زیادہ نیک بخت کون ہے؟ آپ نے فرمایا: ''مَنْ اِذَا رَضِیَ لَمْ یَحْمِلْهُ رِضَاهُ عَلَی الْبَاطِلِ وَ اِذَا سَخِطَ لَمْ یُخْرِجْهُ سَخَطُهُ مِنَ الْحَقِّ یعنی وہ شخص جو رضا کی حالت میں باطل پر راضی نہ ہو (بالفاظ دیگر جو خوشی اور خوش حالی میں مست ہو کر باطل کی راہ نہ اختیار کر لے) اور غصے کی حالت میں ہو تو حق و انصاف کی حدود سے باہر نہ نکل جائے۔''

جب کربلا میں حضرت امام حسینؓ کو اپنے فرزندوں اور احباب سمیت شہید کر دیا گیا، تو حضرت علی زین العابدینؓ (جنھیں حضرت حسینؓ علی اصغر کہا کرتے تھے) کے سوا کوئی نہیں بچا تھا جو عورتوں کی حفاظت کرنے والا ہو۔ یہ بھی بیمار تھے۔ جب ان کو ننگے اونٹوں پر چڑھا کر یزید کے روبرو لایا گیا تو وہاں کسی نے آپ سے کہا: ''کَیْفَ اَصْبَحْتَ یَا عَلِیُّ وَیَا اَهْلَ بَیْتِ

الرَّحْمَةِ؟ اے علی اور رحمت والے گھر کے رہنے والو! کہو کس حال میں ہو؟ تو آپ نے جواب دیا:
''اَصْبَحْنَا مِنْ قَوْمِنَا بِمَنْزِلَةِ قَوْمِ مُوْسٰى مِنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يُذَبِّحُوْنَ اَبْنَائَهُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَاءَ هُمْ فَلَا نَدْرِيْ صَبَاحَنَا مِنْ مَسَاءِ نَا مِنْ حَقِيْقَةِ بَلَاءِ نَا. ہماری حالت اپنی قوم کے ہاتھوں ویسی ہی ہے جو موسیٰ کی قوم کی قوم فرعوں کے ہاتھوں ہوئی تھی کہ وہ ان کے فرزندوں کو ذبح کر ڈالتے تھے اور ان کی عورتوں کو بردہ بنا لیتے تھے۔ اس مصیبت و آزمائش میں ہمیں صبح و شام کا ہوش نہیں ہے۔ بہر حال ہم اس کی نعمتوں کے لیے اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں اور ان آزمائشوں اور مصیبتوں پر صبر کرتے ہیں''۔

حکایات میں بیان کیا گیا ہے کہ ہشام بن عبدالملک بن مروان اپنی خلافت کے زمانے میں ایک سال حج کے لیے آیا اور خانہ کعبہ کے طواف کے بعد حجرِ اسود کو بوسہ دینے کے لیے اس کی طرف بڑھا لیکن ہجوم کی وجہ سے حجرِ اسود تک نہ پہنچ سکا۔ جب وہ منبر پر کھڑا ہوا تو امام زین العابدین رضی اللہ عنہ تشریف لائے۔ آپ اجلے کپڑوں میں ملبوس اور عطر کی خوشبو سے مہک رہے تھے اور آپ کا چہرہ مبارک چمک رہا تھا۔ طواف کے بعد جب آپ حجرِ اسود کی طرف بڑھے تو تمام لوگ پیچھے ہٹ گئے اور جب تک آپ حجر اسود کے بوسے سے فارغ ہو کر خود پیچھے نہیں ہٹ گئے، باقی لوگ پیچھے ہٹے رہے۔ ہشام کے ساتھ جو لوگ شام سے آئے ہوئے تھے انھیں یہ دیکھ کر حیرت ہوئی اور ان میں سے ایک نے ہشام سے پوچھا کہ یہ نوجوان کون ہے؟ لوگوں نے آپ کی تو کوئی پرواہ نہیں کی حالانکہ آپ امیر المومنین ہیں، اور اس کی اس قدر تعظیم کر رہے ہیں۔ ہشام نے اپنی سبکی پر پردہ ڈالنے کے لیے ازراہِ تجاہل عارفانہ جواب دیا کہ: میں تو اسے نہیں پہچانتا کہ یہ کون ہے؟ فَرَزْدَق جوان کا درباری شاعر اور قصیدہ گو تھا، اس کی غیرتِ ایمانی جو پڑی سو رہی تھی ہشام کے منہ سے یہ اہانت آمیز کلمات سن کر فوراً جوش میں آ گئی اور اس نے کہا کہ اگر آپ کو نہیں معلوم کہ یہ کون ہے تو لو غور سے سنو میں تمھیں بتا تا ہوں کہ یہ کون ہے؟ اور اس کے بعد فی البدیہہ حسب ذیل اشعار امام زین العابدینؒ کے تعارف میں کہے:

هٰذَا الَّذِیْ تَعْرِفُ الْبَطْحَاءُ وَطْاَتَهٗ
وَالْبَیْتُ یَعْرِفُهٗ وَالْحِلُّ وَالْحَرَمُ

''یہ وہ ہے جس کے قدموں کے نشان تک وادی بطحا، یہ گھر اور حرم اور حرم سے باہر کے علاقے سب پہچانتے ہیں۔''

هٰذَا ابْنُ خَیْرِ عِبَادِ اللّٰهِ کُلِّهِمْ
هٰذَا التَّقِیُّ النَّقِیُّ الطَّاهِرُ الْعَلَمُ

''یہ خدا کے بندوں میں سے بہترین بندے کا فرزند ہے۔ یہ سب سے پرہیزگار، سب سے پاکیزہ صفت اور سب سے زیادہ بے داغ نشان والا ہے۔''

هٰذَا ابْنُ فَاطِمَةَ الزَّهْرَآءِ اِنْ کُنْتَ جَاهِلَهٗ
بِجَدِّهٖ اَنْبِیَاءُ اللّٰهِ قَدْ خُتِمُوْا

''اگر تو اسے نہیں جانتا تو سن یہ فاطمۃ الزہراؑ کا نورِ نظر ہے۔ یہ وہ ہے جس کے جدِّ امجدؐ پر خدا کے انبیاء کا سلسلہ ختم ہوا۔''

یُبِیْنُ نُوْرُ الدُّجٰی عَنْ نُوْرِ طَلْعَتِهٖ
کَالشَّمْسِ یَنْجَابُ عَنْ اَشْرَاقِهَا الظُّلَمُ

''یہ وہ ہے جس کی پیشانی کے نور سے ظلمت اسی طرح بھاگتی ہے جیسے سورج کے طلوع ہونے سے تمام اندھیرے چھٹ جاتے ہیں۔''

یُغْضِیْ حَیَاءً وَیُغْضٰی مِنْ مَهَابَتِهٖ
فَمَا یُکَلَّمُ اِلَّا حِیْنَ یَبْتَسِمُ

''یہ وہ ہے جو حیا کی وجہ سے آنکھ ہمیشہ نیچی رکھتا ہے اور لوگ اس کی ہیبت کی وجہ سے اس کے روبرو آنکھ اونچی نہیں کر سکتے اور بات کرتا ہے تو منہ سے پھول جھڑتے ہیں۔''

اِذَا رَاَتْهُ قُرَیْشٌ قَالَ قَائِلُهَا
اِلٰی مَکَارِمِ هٰذَا یَنْتَهِی الْکَرَمُ

''یہ وہ ہے جسے قریش (مکہ معظمہ کے لوگ) جب دیکھتے ہیں تو ہر ایک بول اٹھتا ہے کہ بخشش وعطا اور خصائل حمیدہ اس پر ختم ہیں۔''

يَنْمِىْ اِلٰى ذُرْوَةِ الْعِزِ الَّتِىْ قَصُرَتْ
عَنْ نَيْلِهَا عَرَبُ الْاِسْلَامِ وَالْعَجَمُ

''یہ عزت وشوکت کی ان چوٹیوں پر چڑھا ہے جن پر عرب وعجم کے مسلمانوں میں سے کوئی دوسرا نہیں چڑھ سکا ہے۔''

مَنْ جَدُّهُ دَانَ فَضْلُ الْاَنْبِيَاءِ لَهُ
وَفَضْلُ اُمَّتِهٖ دَانَتْ لَهُ الْاُمَمُ

''یہ وہ ہے جس کے جدِ امجدؐ تمام انبیاء کے سردار اور جسؐ کی امت تمام امتوں سے افضل ہے اور تو بھی انہی کی امت ہے۔''

يَكَادُ يُمْسِكُهُ عِرْفَانَ رَاحَتِهٖ
رُكْنُ الْحَطِيْمِ اِذَا مَا جَاءَ يَسْتَلِمُ

''یہ وہ ہے کہ بعید نہیں کہ جب وہ حجرِ اسود کو بوسہ دینے کے لیے آگے بڑھے تو حجرِ اسود بھی اس کی خوشبو کو پہچان کر اس کا ہاتھ تھام لے۔''

فِىْ كَفِّهٖ خَيْزُرَانٌ رِيْحُهُ عَبِقٌ
فِىْ كَفِّهٖ اَرْوَعُ فِىْ عِرْنِيْنِهٖ شَمَمُ

''اس کے ہاتھ میں بید مشک کی چھڑی ہے اور اس کی خوشبو خوب پھیل رہی ہے۔ اس کی ناک بلند ہے اور اس کے ہاتھوں ظاہر ہونے والے کارنامے جرأت وجمال میں حیرت انگیز ہیں۔''

سَهْلُ الْخُلِيْقَةِ لَا يَخْفٰى بِوَادِرِهٖ
يُزِيْنُهُ اِثْنَانِ حُسْنُ الْخُلْقِ وَالشِّمَةُ

''وہ بہت نرم خو ہے اور اس کی خوبیاں کسی سے پوشیدہ نہیں ہیں۔ وہ حسنِ خلق اور بلندی

کردار کی دونوں خوبیوں سے مزین ہے۔''

مُشْتَقَّةٌ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ نَبْعَتُهُ
طَابَتْ عَنَاصِرُهُ وَالْخِيَمُ وَالشِّيَمُ

''اس کی تمام عادات اور اس کے خصائل وعناصر جو سب کے سب اس نے رسولِ خدا سے پائے ہیں بہت ہی عمدہ ہیں۔''

فَلَيْسَ قَوْلُكَ؟ مَنْ هٰذَا بِضَائِرِهِ
اَلْعَرَبُ تَعْرِفُ مَنْ اَنْكَرْتَ وَالْعَجَمُ

''اس لیے تیرا یہ کہنا کہ (تو نہیں جانتا کہ) یہ کون ہے اسے کچھ نقصان نہیں دے سکتا جب کہ اسے عرب وعجم سب جانتے ہیں۔''

كِلْتَا يَدَيْهِ غِيَاثٌ عَمَّ نَفْعُهُمَا
تَسْتَوْكِفَانِ وَلَا يَعْرُوْهُمَا الْعَدَمُ

''اس کے دونوں ہاتھ ایسے ہیں جن کا فیض بارش کی طرح عام ہے ان کی بخشش ہر وقت جاری رہتی ہے حتی کہ سخت بدحالی میں بھی ختم نہیں ہوتی۔''

عَمَّ الْبَرِيَّةَ بِالْاِحْسَانِ فَانْقَشَعَتْ
عَنْهَا الْغَبَايَةُ وَالْاِمْلَاقُ وَالظُّلَمُ

''تمام مخلوقات پر ان کا احسان عام ہے اور ان کی بدولت جہالت وغفلت، تنگ دستی اور ظلم وزیادتی سب دُور ہو گئے۔''

لَا يَسْتَطِيْعُ جَوَادٌ بُعْدَ غَايَتِهِمْ
وَلَا يُدَانِيْهِمْ قَوْمٌ وَّاِنْ كَرُمُ

''کوئی بڑے سے بڑا سخی بھی ان کی برابری کی استطاعت نہیں رکھتا اور کوئی گروہ بھی خواہ وہ کتنا ہی بخشش کرنے والا ہو ان کے مرتبے کے قریب نہیں پھٹک سکتا۔''

هُمُ الْغُيُوْثُ اِذَا مَا اَزِمَةٌ اَزِمَتْ

وَالْاَسَدُ اَسَدُ الشَّرَیٰ وَالنَّاسُ مُحْتَدِمُ

''یہ وہ لوگ ہیں جو اُس وقت بھی بارش کی طرح برستے ہیں جب کہ قحط سالی کے آثار رُونما ہوتے ہیں اور جو اُس وقت بھی شیر بیشہ ہوتے ہیں جب کہ لوگ لڑائی کے میدان میں آگ جلانے والے ہوں۔''

مِنْ مَعْشَرٍ حُبُّهُمْ دِیْنٌ وَبُغْضُهُمْ

کُفْرٌ وَّقُرْبُهُمْ یَنْجِیْ وَمُعْتَصَمُ

''یہ ان لوگوں میں سے ہے جن کی محبت دین ہے اور جن سے بغض کفر ہے اور جن کا قرب نجات اور پناہ دینے والا ہے۔''

اِنْ عُدَّ اَهْلُ التُّقٰی کَانُوْا اَئِمَّتَهُمْ

وَقِیْلَ مَنْ خَیْرُ اَهْلِ الْاَرْضِ قِیْلَ هُمْ

''اگر اہل تقویٰ اور خداترس لوگوں کو جمع کیا جائے تو یہی ان کے امام ہوں گے۔ اور اگر یہ پوچھا جائے کہ دنیا میں افضل ترین لوگ کون ہیں تو بھی جواب ملے گا کہ یہی لوگ۔''

سِیَّانِ ذَالِکَ اِنْ اَثْرُوْا وَاِنْ عَدَمُوْا

لَایَنْقُضُ الْعُسْرُ بَسْطًا مِنْ اَکُفِّهِمْ

''ان کے لیے صاحب ثروت اور نادار ہونا دونوں برابر ہیں۔ ان کے ہاتھوں کی فراخی کو ان کی تنگ دستی بھی کم نہیں کر سکتی۔''

اَللّٰهُ فَضَّلَهُ کَرَمًا وَشَرَّفَهُ

جَرٰی بِذَالِکَ فِیْ لَوْحٍ لَهُ الْقَلَمُ

''اللہ تعالیٰ نے اس بزرگی اور شرف سے نواز ہے اور لوح و قلم میں یہ حکم جاری ہو چکا ہے۔''

مُقَدَّمٌ بَعْدَ ذِکْرِ اللّٰهِ ذِکْرُهُمْ

فِیْ کُلِّ بَدْءٍ وَمَخْتُوْمٌ بِهِ الْقَلَمُ

''ان کا ذکر اللہ کے ذکر کے بعد ہر جگہ مقدم ہے اور اس حکم کے بعد قلم نے لکھنا بند کر دیا ہے۔''

مَنْ یَعْرِفُ اللّٰہَ یَعْرِفُ اَوَّلِیَۃَ
وَالدِّیْنُ مِنْ بَیْتِ ھٰذَا نَالَہُ الْاُمَمُ

''جو شخص اللہ کو جانتا ہو اُسے اس شخص کو بدرجہ اولیٰ جاننا چاہیے کیونکہ اُس کا دین اسی شخص کے گھر سے امت تک پہنچا ہے۔''

اَیُّ الْقَبَائِلِ لَیْسَتْ فِیْ رَقَابِھِمْ
اِمَّا لِاَبَاءِ ھٰذَا اَوْلَہُ نِعَمُ

''وہ کون سے قبیلے ہیں جن کی گردنوں پر اس کے بزرگوں کی یا اس کی نعمتیں اور بخششیں لدی ہوئی نہیں ہیں۔''

حضرت زین العابدین رضی اللہ عنہ کے اس تعارف کے ساتھ فَرَزْدَق نے دوسرے اہل بیت میں سے بھی بعض کی شان بیان کی۔ ظاہر ہے کہ ہشام کے تو پسینے چھوٹ گئے۔ اس نے فوراً حکم دیا کہ اسے عسفان (مکہ اور مدینہ کے درمیان ایک جگہ) میں قید کر دیا جائے۔[1] حضرت زین العابدینؒ کو اس واقعہ کی اطلاع ملی تو آپ فَرَزْدَق کی اس جرأت ایمانی اور بے باکی سے خوش ہوئے اور اس ابتلاء میں اس کی مدد اور دلجمعی کے لیے بارہ ہزار درہم و دینار اس پیغام کے ساتھ بھجوائے کہ: اے ابوفراش! ہم معذور اور محتاج ہیں، اگر اس سے زیادہ مال ہمارے پاس ہوتا تو وہ بھی ہم تجھے دیتے۔ فَرَزْدَق نے وہ مال واپس کرتے ہوئے عرض کیا کہ میں نے یہ کام کسی دنیوی لالچ یا انعام واکرام کے لیے نہیں کیا، بلکہ میں بادشاہوں کے جھوٹے قصیدے اور ان کی جھوٹی مدح سرائیاں کر کر کے گناہوں کا پلڑا بہت بھاری کر چکا ہوں، میں نے اسی کے کسی حد تک کفارے کے طور پر یہ کام کیا ہے اور خدا ہی سے اجر کے لیے اس کے رسولؐ کے اہلِ بیت کی دوستی اور محبت کی طلب رکھتا ہوں۔ حضرت زین العابدینؒ کو یہ پیغام ملا تو آپ نے پھر یہ رقم اس کو اس پیغام کے ساتھ بھیجی کہ: اے ابوفراش! اگر تجھے ہم سے سچی محبت ہے تو جو چیز میں نے بھیجی ہے اس

[1] معلوم ہوتا ہے کہ یہ امتناعی نظر بندی کا طریقہ مسلمانوں میں شاید ہشام نے ہی جاری کیا۔ حالانکہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اسلامی عدل کا یہ اصول صاف طور پر بیان فرما دیا تھا کہ لَا یُوْسَرُ رَجُلٌ فِی الْاِسْلَامِ اِلَّا بِالْعَدْلِ یعنی اسلام میں کسی شخص کو عدل کے شرائط پورے کیے بغیر قید نہیں کیا جا سکتا۔ (مرتب)

کو قبول کر لے، کیونکہ ہم نے اس کو خدا ہی کے لیے اپنی مِلک سے نکال دیا ہے، اب ہم اس کو واپس نہیں لے سکتے۔ اس پر فَرَزْدَق نے وہ رقم رکھ لی۔

(۴) حضرت ابوجعفر محمد صادق بن علیؓ بن حسینؓ بن علیؓ بن ابی طالب:

المعروف امام باقر رضی اللہ عنہ

آپ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کے پوتے ہیں اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اولاد سے برگزیدہ لوگوں میں سے ہیں۔ علوم کی باریکیوں کو سمجھنے اور اللہ کی کتاب کے لطیف اشاروں کو بیان کرنے میں آپ خاص مرتبہ رکھتے ہیں۔ آپ کی کرامتیں روشن اور مشہور ہیں۔ بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ خلیفہ نے آپ کو مار ڈالنے کے ارادے سے طلب کیا۔ جب آپؓ اس کے سامنے دربار میں تشریف لائے تو بے حد تعظیم کی اور پھر تکلیف دہی کے لیے معذرت اور عذر خواہی کے بعد ہدیوں کے ساتھ بڑی عزت کے ساتھ رخصت کیا۔ آپ کے رخصت ہو جانے کے بعد درباریوں نے تعجب اور حیرت کے ساتھ خلیفہ سے پوچھا کہ آپ نے تو انہیں مار ڈالنے کے ارادے سے بلوایا تھا اور اس کے بعد یہ حسنِ سلوک ہمارے لیے حیرانی کا موجب ہے۔ خلیفہ نے کہا کہ جب وہ میرے قریب پہنچے تو میں نے اُن کے دائیں اور بائیں دو شیر دیکھے جو میری طرف اس طرح سے دیکھ رہے تھے کہ گویا کہہ رہے ہیں کہ اگر تم ان سے کوئی بدسلوکی کی تو ابھی تجھے پھاڑ کھائیں گے۔

کلامِ پاک میں فَمَنْ یَّکْفُرْ بِالطَّاغُوْتِ وَیُؤْمِنْ بِاللّٰهِ (۲/۲۵۶) کی تفسیر کرتے ہوئے آپ نے فرمایا: ''کُلُّ مَنْ شَغَلَکَ عَنْ مُطَالَعَةِ الْحَقِ فَهُوَ طَاغُوْتُکَ یعنی ہر وہ شے اور وہ شخص جو تجھے خدا سے ہٹا کر اپنے ساتھ مشغول کرے وہی تیرا طاغوت ہے۔'' پس اے طالب حق، تجھے دیکھنا چاہیے کہ کون شخص اور کون سے مشاغل تجھے خدا سے ہٹا کر اپنی طرف مشغول کرنے والے ہیں۔ جس کی بھی تیری زندگی میں یہ حیثیت ہو اس سے خلاصی حاصل کر۔

آپؓ کے ایک ملازم خاص روایت کرتے ہیں کہ رات کو جب نماز اور اَوراد سے فارغ ہو جاتے تو بلند آواز سے مناجات فرماتے اور اس میں کہتے: ''اے میرے معبود! اے میرے آقا!

رات آ گئی، دنیا کے تمام بادشاہوں کے تصرفات رک گئے، آسمان پر ستارے نکل آئے، تمام مخلوق سو گئی گویا کہ معدوم ہو گئی۔ لوگوں کی آوازیں خاموش اور آنکھیں بند ہو گئیں اور وہ مخلوق کے دروازوں کو چھوڑ کر بھاگ گئے۔ بنوامیہ بھی آرام کر رہے ہیں اور انھوں نے اپنی سب قیمتی چیزیں چھپالی ہیں اور ان سے اپنی حاجتیں وابستہ کرنے والے اپنی حاجتوں کو چھوڑ کر چلے گئے۔ مگر تو، اے میرے پروردگار! تو حیئ قیّوم اور علیم وخبیر ہے۔ نیند یا غنودگی کوئی شے تجھے لاحق نہیں ہوتی اور نہ ہی یہ تیرے لیے زیبا ہے۔ جو تجھے تیری ان صفات کے ساتھ نہیں پہچانتا وہ تیری کسی نعمت کے لائق نہیں۔ اے وہ ذات! جسے کوئی چیز کسی چیز سے منع نہیں کر سکتی، جس کے لیے رات اور دن یکساں ہیں، جس کے کام میں کوئی شے خلل نہیں ڈال سکتی۔ آپ کی رحمت کے دروازے ہمیشہ کھلے رہتے ہیں، اپنے پکارنے والوں اور اپنے ثناخوانوں پر آپ کے سارے خزانے فدا ہیں۔ اے میرے مالک! آپ وہ خدا ہیں کہ آپ پر کسی سوالی کے سوال کا رَدّ جائز نہیں اور مومنوں میں سے جو بندہ آپ کے دروازے پر سوال لے کر جائے گا۔ کبھی محروم نہیں لوٹے گا۔ زمین وآسمان سے جو کچھ مانگے اسے آپ کے ہاں سے ملے گا...... خدایا! جب میں موت اور قبر اور حساب کو یاد کرتا ہوں تو دل کو دنیا سے کیسے خوش رکھوں؟ اور جب موت کے فرشتہ کو یاد کرتا ہوں تو دنیا سے کیسے نفع حاصل کروں؟ میں ساری چیزیں آپ ہی سے مانگتا ہوں۔ آپ ہی کی ذات کو اپنا تنہا الٰہ سمجھتا ہوں۔ مرنے کے وقت مجھے ایسی خوشی عطا فرما کہ اس کی سب تکلیف دُور کر دے اور حساب کے وقت ایسی مسرت سے نواز کہ اس کی سب کوفت دُور ہو جائے۔''

وہ ملازم بیان کرتا ہے کہ آپ ہر روز اسی طرح دعا اور اس کے ساتھ گریہ زاری فرماتے۔ ایک روز میں نے عرض کیا کہ: اے میرے اور میرے ماں باپ کے سردار آپ کب تک اس طرح گریہ زاری کرتے رہیں گے۔ آپ نے فرمایا: میرے دوست! یعقوب علیہ السلام نے ایک فرزند گم کیا تھا اور انھوں نے اس کے غم میں گریہ زاری کرتے کرتے آنکھیں سفید کر لیں اور بینائی کھو دی۔ میں نے اپنے باپ حسینؓ کے ساتھ اٹھارہ اشخاص گم کیے ہیں۔ میں کیسے اپنے رب سے فریاد نہ کروں۔

(۵) حضرت ابو محمد جعفر بن محمد صادق بن علی بن حسین بن علی بن ابی طالب

رضوان اللہ علیہم

آپ مشائخ رحمہم اللہ میں اپنے اشارات کی خوبی اور رقت کلام کی وجہ سے مشہور ہیں۔ آپ کا ارشاد ہے: ''مَنْ عَرَفَ اللّٰہَ اَعْرَضَ عَمَّا سِوَاہُ جس شخص نے اللہ کو پہچان لیا وہ اس کے سوا ہر دوسرے سے بے نیاز ہو گیا۔'' کیونکہ جو شخص ایک خدا کی ذات سے ملا ہوا ہوتا ہے اس کے دل میں دوسری چیزوں کی قدر و منزلت نہیں ہوتی کہ وہ ان کی طرف التفات کرے۔

آپ کا یہ بھی ارشاد ہے کہ: ''لَاتَصِحُّ الْعِبَادَۃُ اِلَّا بِالتَّوْبَۃِ لِاَنَّ اللّٰہَ تَعَالٰی قَدَّمَ التَّوْبَۃَ عَلَی الْعِبَادَۃِ، قَالَ اللّٰہُ تَبَارَکَ وَتَعَالٰی: اَلتَّائِبُوْنَ الْعَابِدُوْنَ. یعنی توبہ کے بغیر عبادت درست نہیں ہوتی کیونکہ اللہ تعالیٰ نے توبہ کا ذکر عبادت پر مقدم رکھا ہے جیسا کہ اَلتَّائِبُوْنَ الْعَابِدُوْنَ سے ظاہر ہے۔'' پس عبادت سے پہلے ضروری ہے کہ انسان گناہوں سے تائب ہو اور ان سے اجتناب کرے۔ توبہ ابتدائی مقام ہے اور عبودیت انتہائی مقام ہے۔ ابتدائی مقام سے گزرے بغیر بندہ اگلے مقام میں کیسے داخل ہو سکے گا۔ پھر یہ بھی ظاہر و باہر بات ہے کہ جب تک آدمی کو اپنے گناہوں اور عیوب کی طرف توجہ نہ ہو اُسے توبہ کی طرف نہ توجہ ہو سکتی ہے اور نہ اس کی توفیق حاصل ہو سکتی ہے۔ اس لیے لازم ہے کہ آدمی اپنے عیوب اور گناہوں پر نظر کرے۔ چنانچہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اِذَا اَرَادَ اللّٰہُ بِعَبْدٍ خَیْرًا اَبْصَرَہٗ بِعُیُوْبِ نَفْسِہٖ یعنی جب اللہ کسی شخص کے ساتھ بھلائی کا ارادہ فرماتا ہے تو اسے اپنے عیوب کی طرف متوجہ فرما دیتا ہے۔'' چنانچہ حضرت جعفر صادق کے بارے میں روایت ہے کہ ایک روز اپنے غلاموں میں بیٹھے تھے۔ آپ نے فرمایا کہ آؤ ہم سب مل کر ایک دوسرے سے عہد کریں کہ قیامت کے دن جو بھی بخشا جائے وہ دوسروں کی شفاعت کرے۔ غلاموں نے عرض کیا کہ اے ابنِ رسولؐ اللہ! آپ کو ہماری شفاعت کی کیا حاجت ہے، آپ کے جدِّ بزرگوار صلی اللہ علیہ وسلم تو تمام مخلوقات کے شفیع ہوں گے۔ آپ نے فرمایا کہ میں تو اپنے عملوں کی وجہ سے شرم کے مارے قیامت کے روز اپنے

جدِ امجد کے سامنے بھی نہ ہو سکوں گا۔

ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ حضرت داؤد طائی رحمۃ اللہ علیہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ سے عرض کیا کہ اے رسول اللہ کے فرزند! مجھے کوئی نصیحت فرمایئے تاکہ میرے دل کی سیاہی جاتی رہے۔ آپ نے فرمایا: اے اباسلیمان! آپ تو اپنے زمانے کے یکتا زاہد ہیں۔ آپ کو مجھ سے نصیحت حاصل کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ داؤد طائی نے کہا: اے پیغمبرؐ خدا کے فرزند! آپ لوگوں کو تمام مخلوق پر فضیلت حاصل ہے، آپ کا ہمیں نصیحت کرنا ضروری ہے۔ اس کے جواب میں انھوں نے فرمایا: اے اباسلیمان! میں اس بات سے ڈرتا ہوں کہ میرے جدِ بزرگوار صلی اللہ علیہ وسلم مجھے اس پر نہ پکڑیں کہ تو نے میری پوری پیروی کیوں نہیں کی تھی؟ خدا کے ہاں حسب و نسب سے کوئی کام درست نہیں ہوتا۔ سارا انحصار معاملات کے دُرست ہونے پر ہے۔ یہ سن کر داؤد طائیؒ رونے لگے اور اسی دوران میں کہا: خدایا! جس کا خمیر نبوت کے پانی سے گوندھا گیا، جس کی طبیعت کی ترکیب حجت و برہان کے اصول سے تیار ہوئی، جس کا نانا رسولِ پاکؐ ہے، جس کی ماں بتولؓ ہے، جب وہ حیران و پریشان ہے تو داؤد طائی کون ہے کہ کسی گنتی شمار میں آ سکے۔

اصحابِ صُفّہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم

خلفاء راشدینؓ اور اہل بیتؓ کے بعد اہل طریقت کے امام ومقتدا اصحاب صفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم ہیں۔ اہل صفہ حضور نبی کریمؐ کے خاص اصحاب تھے۔ یہ حضرات دنیا کے تمام کام کاج اور دلچسپیاں چھوڑ کر مسجد نبویؐ میں رہ پڑے تھے۔ اور انھوں نے تن من سے اپنے آپ کو حضورؐ کے سپرد کر رکھا تھا کہ جب اور جو خدمت چاہیں ان سے لیں۔ ان کا کام رات دن خدا کی بندگی وعبادت میں لگے رہنا تھا۔ ان کے فضائل پر قرآن مجید کا یہ ارشاد شاہد ہے: ''لَاتَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ (۶ / ۵۲) یعنی جو لوگ دن رات اپنے رب کو پکارتے ہیں اور اس کی رضا کے طالب ہیں انھیں اپنے قرب سے دُور نہ کرو۔'' یہ ارشاد انہی حضرات کے بارے میں ہے۔ مزید برآں حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ: ''وَقَفَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عَلٰى اَصْحَابِ الصُّفَّةِ فَرَاٰى فَقْرَهُمْ وَجُهْدَهُمْ وَطِيْبَ قُلُوْبِهِمْ. فَقَالَ: اَبْشِرُوْا يَا اَصْحَابَ الصُّفَّةِ فَمَنْ بَقِيَ مِنْ اُمَّتِيْ عَلَى النَّعْتِ الَّذِيْ اَنْتُمْ عَلَيْهِ رَاضِيًا بِمَا فِيْهِ فَاِنَّهُمْ رُفَقَآءِ يْ فِي الْجَنَّةِ، یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اصحابِ صُفّہ پر گزر ہوا اور آپؐ نے دیکھا کہ وہ فقر ومجاہدے کے باوجود خوش دل ہیں۔ آپؐ نے ان سے فرمایا: اے اصحابِ صُفّہ! تمھارے لیے اور میری امت کے ان سب لوگوں کے لیے جو تمھارے بعد اس صفت پر جس پر تم راضی ہو قائم رہیں، خوشخبری ہے کہ وہ جنت میں میرے ساتھ ہوں گے۔''

اصحابِ صُفّہ ...... اور اُن کے نمایاں اوصاف حسب ذیل ہیں:

۱۔ محمد مختار بلال بن رباح رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ خدا کی درگاہ کا برگزیدہ منادی۔

۲۔ ابوعبداللہ سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ خدا کا دوست اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے احوال کا محرم۔

۳۔ ابوعبیدہ عامر عبیداللہ بن جراح رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ مہاجرین وانصار کا سردار اور خداوند کریم کی رضا کا دلدادہ۔

۴۔ ابوالیقظان عمار بن یاسر رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ اصحاب اور ارباب زینت کا برگزیدہ۔

۵۔ ابومسعود عبداللہ بن مسعود ہزلی رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ علم کا خزانہ اور علوم کا گنجینہ۔

۶۔ عتبہ بن مسعود برادر عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ پاک نفس اور درگاہ ربّ العزت سے مضبوط تعلق رکھنے والا۔

۷۔ مقداد بن اسود رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ تنہائی کے راستہ کا سالک اور عیب وذلت سے منہ پھیرنے والا۔ (عیب وذلت سے مراد خداوند تعالیٰ کی ناپسندیدہ اور اس کی نافرمانی کی راہ ہے)۔

۸۔ خباب بن اَرَت رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ تقویٰ کے بلند ترین مقام کی دعوت دینے والا اور بلوٰی اور بلا کے ساتھ راضی رہنے والا۔ یاد رہے کہ کفار آپ کو دہکتے کوئلوں پر لٹاتے تھے مگر آپ نے توحید کو نہ چھوڑا۔

۹۔ صہیب بن سنان رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ ہر حال میں خدا کی رضا کو اپنا منتہائے مقصود رکھنے والا اور بارگاہِ خداوندی کے لیے فنا کی طلب کرنے والا۔

۱۰۔ عتبہ بن غزوان رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ سعادت کا موتی اور قناعت کی راہ کا بہادر۔

۱۱۔ زید بن الخطاب برادر حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہما۔ تمام جہان اور مخلوقات سے منہ موڑ کر ایک خدا کا ہو رہنے والا۔

۱۲۔ ابوکبشہؓ مولیٰ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ مشاہدات کی جستجو میں مجاہدوں کا مالک۔

۱۳۔ ابوالمرثد کنانہ حصین عدوی رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ عزیز اور تائب اور کل مخلوقات سے حق تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے والا۔

۱۴۔ سالم مولیٰ حذیفہ یمانی رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ تواضع کے راستہ کی تعمیر اور حجتِ قطعیہ کے راستے کا طے کرنے والا۔

۱۵۔ عکاشہ بن حصین رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ خدا کے عذاب کا سخت خوف کرنے والا اور خدا کی

مخالفت کے راستہ سے بھاگنے والا۔

۱۶۔ مسعود بن ربیع قاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ مہاجرین وانصار کی زینت اور بنی وقار کا سردار۔

۱۷۔ ابوذر جندب بن جنادہ غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ زہد میں عیسیٰؑ اور شوق میں موسیٰؑ صفت۔

۱۸۔ عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما۔ انفاسِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم (آپؐ کے اقوال وارشادات) کا نگہبان اور تمام بھلائیوں میں لائق۔

۱۹۔ صفوان بن بیضا رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ متابعت میں سیدھا اور استقامت میں قائم رہنے والا۔

۲۰۔ ابودرداعویم بن عامر رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ ارادے کا مالک اور تہمت سے خالی۔

۲۱۔ ابولبابہ بن عبدالمنذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ ہر حال میں پُرامید رہنے والا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا برگزیدہ۔

۲۲۔ عبداللہ بن بدر جُہنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ شرافت کے دریا کا کیمیا اور توکل کی سیپی کا موتی۔

ان کے علاوہ اور حضرات بھی ان میں شامل تھے۔ مگر صاحب کشف المحجوب نے طوالت کے ڈر سے ان کا تذکرہ نہیں کیا ہے۔ اور مسطح بن ثابت بن عباد کے بارے میں لکھتے ہیں کہ شیخ ابو عبدالرحمٰن محمد بن حسین سلمیؒ جو کہ طریقت کو فروغ دینے والے اور مشائخ کے کلام کو دوسروں تک پہنچانے والے ہیں، انھوں نے ایک تاریخ اصحابِ صفہؓ کے مناقب اور فضائل اور ناموں اور کیفیتوں کے متعلق لکھی ہے۔ اس میں انھوں نے مسطح بن ثابت کا نام بھی درج کیا ہے۔ مگر میں ان کو دل سے دوست نہیں رکھتا کہ واقعہ افک ابتدا اسی شخص کی طرف سے ہوئی تھی۔

نیز حسب ذیل حضرات بھی اصحابِ صفہ میں شامل تھے۔ مگر کبھی کبھی کچھ سامان بھی رکھتے تھے۔ لیکن اصحابِ صفہؓ سب کے سب ایک ہی درجہ میں تھے۔ اس لیے ان کے اسمائے گرامی بھی درج کیے جاتے ہیں:

۲۳۔ ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔

۲۴۔ ثوبان رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔

۲۵۔ معاذ بن حارث رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔

۲۶۔ خلاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔

۲۷۔ ثابت بن ودیعت رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔

۲۸۔ ابوعیسیٰ اَدیم بن مساعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔

۲۹۔ سالم بن عمر بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔

۳۰۔ ابواللیث کعب بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔

۳۱۔ ذہب بن معقل رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔

۳۲۔ عبداللہ بن انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔

۳۳۔ حجاج بن عمر اسلمی رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔

یہ بات اپنی جگہ طے شدہ ہے کہ صحابہؓ کا زمانہ سب زمانوں سے ہر لحاظ سے اچھا تھا۔ وہ اپنے زمانے میں اور ہر زمانے میں سب مخلوقات سے بہتر اور افضل تھے۔ ان کے بعد ان سے ملحق اور متصل زمانے کے لوگوں کا درجہ ہے اور ان کے بعد ان سے ملحق اور متصل لوگوں کا، جیسا کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

خَیرُ الْقُرُوْنِ قَرْنِیْ ثُمَّ الَّذِیْنَ یَلُوْنَهُمْ ثُمَّ الَّذِیْنَ یَلُوْنَهُمْ...... الخ

یعنی آپؐ نے فرمایا: کہ سب زمانوں سے بہتر میرا زمانہ ہے، پھر اس سے متصل جو زمانہ ہے وہ۔ پھر اُس سے جو متصل ہے وہ.......... الخ۔ یعنی سب سے بہتر حضورؐ اور صحابہؓ کا دَور، اس کے بعد تابعین کا دَور، اور اس کے بعد تبع تابعین کا دَور الی الآخر۔

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِیْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِیْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ، (۹/۱۰۰) یعنی وہ مہاجر و انصار جو سب سے پہلے ایمان لائے اور وہ بھی جو بعد میں راست بازی کے ساتھ ان کے پیچھے چلے، اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے۔'' پس یہ وہ لوگ ہیں جن کو اللہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نمونے کے لوگ قرار دیا ہے۔ اس لیے ہر معاملے میں اُن کے ائمہ رشد و ہدایت ہونے میں کوئی کلام نہیں ہے۔

تابعین رحمہم اللہ تعالیٰ میں اہل طریقت کے پیشوا

(۱) حضرت اویس قرنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ:

حضرت اویس قرنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں موجود تھے۔ مگر ان کی حضورؐ سے ملاقات نہیں ہوئی۔ اس کی ایک وجہ تو یہ تھی کہ آپ کی والدہ ضعیفہ تھیں۔ ان کو چھوڑ کر نکل نہیں سکتے تھے اور دوسرے آپ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے غائبانہ ہی اس درجہ عشق تھا کہ جب انھوں نے سنا کہ جنگ اُحد میں حضورؐ کا دانت شہید ہو گیا ہے تو آپ نے ایک ایک کر کے اپنے سارے دانت توڑ ڈالے۔ کیونکہ یہ معلوم نہیں تھا کہ محبوبؐ کا کون سا دانت ٹوٹا ہے۔ اس وجہ سے ڈرتے تھے کہ غلبہ شوق سے حضورؐ کے دیدار کی تاب بھی لا سکیں گے یا نہیں۔

حضور ﷺ کو بھی حضرت اویس سے غائبانہ محبت تھی اور آپؐ نے صحابہ رضی اللہ عنہم سے فرمایا تھا کہ قرن میں اویس نام کا ایک شخص ہے جسے قیامت کے روز قبیلہ ربیعہ اور مضر کی بھیڑوں کے بالوں کی تعداد کے برابر میری امت کے لوگوں کی شفاعت کا حق ہوگا اور اس کے بعد روئے مبارک حضرت عمر اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کی طرف کر کے فرمایا کہ تم دونوں اس کو دیکھو گے۔ وہ ایک میانہ قد لمبے لمبے بالوں والا آدمی ہے جس کے بائیں پہلو میں درہم کے برابر سفید داغ ہے مگر وہ برص نہیں ہے اور اس کے ہاتھ اور ہتھیلیوں پر بھی ویسا ہی نشان ہے۔ جب تم اسے ملو تو میرا سلام دینا اور اس سے کہنا کہ میری امت کے حق میں دُعا کرے۔

حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جب حضرت عمرؓ اپنے زمانہ خلافت میں حضرت علیؓ کے ساتھ مکہ معظمہ آئے تو اپنے خطبہ میں فرمایا: یَااَھْلَ نَجْدٍ قُوْمُوْا، اے اہل نجد! کھڑے ہو جاؤ اور جب وہ کھڑے ہوئے تو ان سے پوچھا، تمھارے اندر کوئی قرن کا آدمی ہے؟ جب قرن کے لوگ آگے آئے تو اُن سے آپ نے اویس کے بارے میں پوچھا۔ اُنھوں نے بتایا کہ اویس نامی

ایک دیوانہ ہے جو جنگل میں رہتا ہے۔ وہ آبادیوں میں نہیں آتا، نہ لوگوں سے ملتا جلتا ہے۔ غم اور خوشی کو بھی نہیں جانتا، بلکہ جب لوگ ہنستے ہیں وہ روتا ہے اور جب وہ روتے ہیں تو وہ ہنستا ہے۔ جب حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ وہ اس سے ملنا چاہتے ہیں تو ان لوگوں نے کہا کہ وہ جنگل میں ان کے اونٹوں کے پاس ہی رہتا ہے۔ چنانچہ حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ حضرت اویس کے پاس گئے وہ نماز میں مصروف تھے۔ فارغ ہوئے تو ان بزرگوں کو سلام کیا اور اپنے ہاتھ اور پہلو کے نشان ان کو دکھائے تا کہ وہ حضورؐ کی بیان کردہ علامات سے انھیں پہچان لیں۔ اُنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سلام اور پیغام دیا، اور کچھ دیر اُن کے پاس بیٹھے رہے۔ ظاہر ہے کہ اس دَوران میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کی دعوت ہی کے سلسلے میں باتیں ہوتی رہیں۔ اس گفتگو میں حضرات امیرین[1] رضی اللہ عنہما نے حضرت اویس کو بتایا کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اِنَّمَا الْاَعْمَالُ بِالنِّیَاتِ. وَاِنَّمَا لِامْرِئٍ مَّا نَوٰی. فَمَنْ کَانَتْ هِجْرَتُهٗ اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ فَهِجْرَتُهٗ اِلَى اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَمَنْ کَانَتْ هِجْرَتُهٗ اِلٰی دُنْیَا یُصِیْبُهَا اَوِامْرَاَةٍ یَتَزَوَّجُهَا فَهِجْرَتُهٗ اِلٰی مَا هَاجَرَ اِلَیْهِ. (مشکوٰۃ شریف، حدیث نمبر ۱) یعنی اعمال کا انحصار نیتوں پر ہے اور ہر شخص کے لیے وہی کچھ ہے جس کی اس نے نیت کی۔ پس جس شخص نے اللہ اور رسولؐ کی طرف ہجرت کی تو اس کی ہجرت اللہ اور رسولؐ کی طرف شمار ہوگی اور جس نے کسی دنیوی غرض کے لیے ہجرت کی کہ اسے وہ غرض حاصل ہو جائے یا جس نے کسی عورت کی خاطر ہجرت کی کہ اس سے اس کا نکاح ہو جائے تو اس کی ہجرت اسی چیز کی طرف ہے جس کے لیے اس نے ہجرت کی۔'' گویا خدا کے ہاں آدمی کو اجر اسی چیز کا ملے گا جو اس نے خالصۃً اس کے لیے کی ہوگی۔ ظاہر ہے کہ جو کام اُس نے خدا کے لیے کیا نہیں اس کا اجر بھی اسے خدا سے مانگنے کا کوئی حق نہیں۔

ضروری باتیں ہو گئیں تو حضرت اویس رضی اللہ عنہ نے فرمایا: آپ حضرات کو تکلیف ہوئی۔ اب واپس جاؤ، قیامت قریب آ گئی ہے۔ اُس وقت ہمیں وہ دیدار ہوگا جو کبھی منقطع نہیں ہوگا۔ اب میں قیامت کے راستہ کا توشہ تیار کرنے میں مشغول ہوتا ہوں۔

[1] حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ مراد ہیں۔

اس واقعہ سے اہل قرن کو معلوم ہوا کہ ان کے اونٹوں کے قریب رہنے والا یہ دیوانہ کون ہے۔ چنانچہ وہ آپ کی بہت عزت اور قدر و منزلت کرنے لگے۔ اس کے بعد آپ اس جگہ کو چھوڑ کر کوفہ کی طرف چلے گئے۔ اور کسی کو معلوم نہیں کہ کہاں گئے۔ صرف ایک مرتبہ ہرم بن حیانؓ نے آپ کو دریائے فرات کے کنارے پر دیکھا۔ یا پھر وہ اس وقت دیکھے گئے جبکہ جنگ صفین میں آپ حضرت علیؓ کی طرف سے میدانِ جہاد میں نکلے اور لڑتے ہوئے شہید ہو گئے۔ گویا آپ کی پوری زندگی عَاشَ حَمِيْدًا وَمَاتَ شَهِيْدًا (یعنی زندگی حمیدہ گزاری اور شہادت کی موت پائی) کا صحیح نمونہ تھی۔

آپ کا قول ہے: اَلسَّلَامَةُ فِي الْوَحْدَةِ یعنی سلامتی وحدت میں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان کے لیے سلامتی کی راہ یہ ہے کہ اس کی زندگی کے کسی گوشہ میں غیر اللہ کا کوئی دخل باقی نہ رہے، پوری زندگی ایک وحدت ہو۔

(۲) حضرت ہرم بن حیان رضی اللہ تعالیٰ عنہ:

حضرت ہرم بن حیان رضی اللہ تعالیٰ عنہ بزرگانِ طریقت میں صفا کا مخزن اور وفا کا پیکر سمجھے جاتے ہیں۔ آپ نے صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم کی صحبت اختیار کی اور حضرت اویس قرنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بھی زیارت کی۔ آپ حضرت اویسؓ کی زیات کے لیے پہلے قرن گئے، لیکن وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ وہ کوفہ کی طرف کہیں چلے گئے ہیں۔ مایوس ہو کر واپس مکہ معظمہ آ گئے۔ یہاں سے پتہ چلا کہ حضرت اویس کوفہ میں ہیں۔ آپ کوفہ تشریف لے گئے لیکن وہاں سے پتہ نہ چلا کہ حضرت اویس کہاں ہیں۔ عرصہ دراز تک ان کے انتظار اور تلاش میں کوفہ میں مقیم رہے۔ پھر وہاں سے بصرہ کو روانہ ہوئے تو راستہ میں دریائے فرات کے کنارے اچانک حضرت اویسؓ مل گئے۔ وہ گودڑی پہنے ہوئے وضو کر رہے تھے۔ وضو سے فارغ ہو کر دریا کے کنارے سے نیچے اترے تو آپ نے اپنی ریش مبارک میں کنگھی کرنی شروع کر دی۔ ہرم بن حیان نے آگے بڑھ کر سلام عرض کیا۔ آپ نے جواب میں فرمایا: اے ابنِ حیان! وعلیک السلام۔ ہرمؓ بن حیان نے

متعجب ہوکر پوچھا کہ آپ نے کیسے مجھے پہچان لیا کہ میں ہرم بن حبان ہوں۔ حضرت اویسؒ نے فرمایا: عَرَفَتْ رُوْحِیْ رُوْحَکَ یعنی میری روح نے تمھاری روح کو پہچان لیا۔[1]

حضرت ہرمؒ بن حبان کہتے ہیں کہ حضرت اویس نے مجھ سے حضرت عمرؓ اور حضرت علیؓ سے زیادہ باتیں کیں۔ اور ان دونوں کی بیان کردہ حدیث (اَلْاَعْمَالُ بِالنِّیَاتِ......الی الآخر) پوری بیان کرنے کے بعد مجھ سے فرمایا: عَلَیْکَ بِقَلْبِکَ یعنی تجھ سے مواخذہ اُس کے مطابق ہوگا جو تیرے دل میں ہے۔ اس لیے اپنے دل کو ہمیشہ حق کے تابع اور خالص رکھ۔ دل اور نیت کا اخلاص ہی ہے جو انسان کو شیطان سے محفوظ رکھ سکتا ہے۔ کیونکہ دل اور نیت کو خالص رکھنے والے بندوں کے بارے میں اس نے اوّل روز ہی اپنی ناکامی کا اعلان کر دیا تھا۔ اس نے کہا:

لَاُغْوِیَنَّھُمْ اَجْمَعِیْنَ اِلَّا عِبَادَکَ مِنْھُمُ الْمُخْلَصِیْنَ (۱۵:۳۹-۴۰، ۳۸:۸۲)۔

''بنی آدم میں سے تیرے مخلص بندوں کے سوا ان سب کو بہکا دوں گا۔''

''مُخْلِصِیْنَ'' میں دو قرأتیں ہیں۔ ایک لام پر زبر کے ساتھ (مُخْلَصِیْنَ) اور دوسری لام کے نیچے زیر کے ساتھ (مُخْلِصِیْنَ)۔ اگر بصیغۂ فاعل یعنی زیر کے ساتھ تلاوت کیا جائے تو اس سے مراد باقی الصفت لوگ ہوں گے۔ یعنی وہ لوگ جو کوشش، مجاہدے اور تکلف کے ساتھ اپنے دل کو امر الٰہی کے موافق کر لیتے ہیں۔ اور اگر بصیغۂ مفعول یعنی زبر کے ساتھ تلاوت کیا جائے تو اس سے مراد فانی الصفت لوگ ہوں گے۔ یعنی وہ لوگ جن کا دل گویا اب اخلاص کا مسکن بن گیا ہے اور ان کا بدن بھی دل کے موافق ہو گیا ہے۔ اور اللہ نے اُن کو اپنے لیے خالص کر لیا ہے۔ پس مُخْلِصْ ہونا ابتدائی اور مجاہدے کا درجہ ہے اور مُخْلَصْ انتہائی اور خداوند تعالیٰ کے ہاں برگزیدہ ہو جانے کا درجہ ہے۔

[1] اس سے ہو بہو ملتا ہوا ایک واقعہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی اور مولانا عبید اللہ سندھی مرحوم کا بھی ہے۔ ایک دفعہ مولانا مودودیؒ صاحب نے بیان فرمایا کہ ابھی میں نیا نیا لاہور آیا تھا (آپ ۳۸-۱۹۳۷ء میں حیدرآباد (دکن) سے لاہور منتقل ہوئے) کہ مجھے معلوم ہوا کہ مولانا عبید اللہ سندھی لاہور آرہے ہیں۔ اس سے پہلے میری ان سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی تھی اور نہ ہم نے ایک دوسرے کو کبھی دیکھا تھا۔ میں نے یہ خیال کیا کہ شہر کے سٹیشن پر بہت ہجوم ہوگا اس لیے میں لاہور چھاؤنی کے سٹیشن پر پہنچ گیا اور جب گاڑی رُکی تو اُن کا کمرہ دیکھ کر اندر چلا گیا اور میں نے اُن سے سلام عرض کیا۔ مولانا سندھی مرحوم نے جواب دیا: وعلیکم السلام مودودی صاحب! میں نے حیران ہوکر پوچھا کہ آپ نے مجھے کیسے پہچان لیا؟ انھوں نے فرمایا کہ تمھاری تحریروں سے۔ (مرتب)

حضرت ہرم بن حبان فرماتے ہیں کہ: عَلَيْكَ بِقَلْبِكَ کی تلقین کے بعد حضرت اویس نے مجھے رخصت کر دیا اور خود قیامت کے لیے تیاری میں مشغول ہو گئے۔

(۳) حضرت ابوعلی حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ:

حضرات تابعین رحمہم اللہ تعالیٰ علیہم میں تیسرے بزرگ جو اہل طریقت کے امام اور پیشوا ہیں وہ حضرت ابوعلی حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ بعض لوگوں نے آپ کی کنیت ابومحمد اور ابوسعید بھی بیان کی ہے۔ اہل طریقت میں آپ کی قدر و منزلت بہت زیادہ ہے۔ علم معاملت میں آپ سے بہت اچھے اور لطیف اشارات منقول ہیں۔ حکایات میں بیان کیا گیا ہے کہ ایک مرتبہ ایک اعرابی آپ کے پاس آیا اور اس نے صبر کے بارے میں آپ سے سوال کیا۔ آپ نے فرمایا: کہ صبر کی دو قسمیں ہیں۔ ایک مصیبتوں اور آزمائشوں میں حق پر ثابت قدم رہنا ہے اور دوسرا جن باتوں سے اللہ تعالیٰ نے ہمیں منع فرمایا ہے ان سے رک جانا۔ اعرابی نے کہا: اَنْتَ زَاهِدٌ مَارَأَيْتُ زُهْدَ مِنْكَ یعنی تو بڑا پہنچا ہوا آدمی ہے میں نے تجھ سے بڑا کوئی زاہد نہیں دیکھا اور نہ ہی تجھ سے بڑا کوئی صابر دیکھا۔ آپ نے فرمایا: اے اعرابی! میرا یہ زُہد سب کا سب رغبت اور لالچ کا نتیجہ ہے اور میرا یہ صبر سب کا سب مصائب اور ابتلاؤں پر تکدُّر اور جزع وفزع کا نتیجہ ہے۔ اعرابی نے عرض کیا کہ: برائے کرم اپنی اس بات کو صاف الفاظ میں بیان فرمائیے، آپ نے میرا اعتقاد متزلزل کر دیا۔ آپ نے فرمایا: بھائی! میرا زُھد (دُنیوی لذتوں کے پیچھے بھاگنے سے اجتناب) آخرت کی نعمتوں کے لالچ اور ان کی رغبت پرمبنی ہے اور میرا صبر (مصائب دنیا پر تکدُّر اور جزع وفزع کا اظہار نہ کرنا) اس خوف وتکدُّر کا نتیجہ ہے جو مجھے دوزخ کی آگ اور آخرت میں پیش آنے والے مصائب سے پیدا ہو رہا ہے۔

پس آدمی کے زُھد اور صبر دونوں صرف خدا کی رضا اور اسکی خوشنودی کے لیے اور اسی کے خوف سے ہونے چاہئیں۔ اخلاص کی درستی نام ہی اس چیز کا ہے کہ آدمی کے قول وفعل کے محرک صرف خدا کی رضا اور اس کا خوف ہو اور سب سے وہ بے نیاز ہو جائے۔

حضرت حسن بصریؒ نیک صحبت اختیار کرنے اور برے لوگوں کی صحبت سے اجتناب کرنے پر بہت زور دیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ اگر آدمی خود نیک اور واقعی نیکی کا طلب گار ہو تو وہ نیکوں کی صحبت ضرور پالے گا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ''وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا (۲۱:۳) یعنی جو لوگ ہماری راہ میں کوشش کرتے ہیں اُن کو ہم اپنا رستہ ضرور دکھا دیتے ہیں۔'' اور برے لوگوں کی صحبت کے سلسلے میں فرماتے ہیں: ''اِنَّ صُحْبَةَ الْاَشْرَارِ تُوْرِثُ سُوْءَ الظَّنِّ بِالْاَخْيَارِ. یعنی برے لوگوں کی صحبت نیک لوگوں سے بدگمان کر دیتی ہے۔''

حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ کے اس قول کی وضاحت کرتے ہوئے حضرت علی ہجویریؒ اہل دین وطریقت کے اشرار اور پیشہ ور لوگوں کی صحبت سے اجتناب پر خاص طور پر زور دیتے ہوئے فرماتے ہیں کہ: ایک عام آدمی کو جب اہل دین وطریقت کے لبادے میں خیانت، جھوٹ، غیبت، لغو حرکات وہزلیات اور شہوانی افعال سے سابقہ پیش آتا ہے تو وہ دین اور طریقت ہی کو ایک ڈھونگ اور اپنی دنیوی اغراض وخواہشات کے لیے عام لوگوں کو پھانسنے کا ایک خوشنما حربہ خیال کرنے لگتا ہے اور یہ سمجھنے لگتا ہے کہ دین اور طریقت کا نام لینے والے سبھی لوگ اسی طرح کے ہیں۔ یہ صورت دین اور خود اُس کے لیے بہت خطرناک ہے۔ لیکن آدمی کو یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ اگر اس کے اپنے اندر نیکی کا جوہر اور اس کی سچی طلب ہوگی تو وہ ایسے اہل دین وطریقت کو پالے گا جن کے تمام کام حق کی فرمانبرداری کے ہیں۔ جن کی زبان پر حق کا کلام، جن کا دل حق کا مسکن، کان حق کی سماعت کا محل، آنکھیں مشاہدہ حق کے جمال کا مقام اور جن کا سر صرف درگاہِ حق میں سجدہ ریز ہوتا ہے۔ آدمی کی فطرت ایسی ہے کہ وہ انہی لوگوں کی صحبت میں آرام پاتا ہے جو اس کے ہم جنس ہوں اور کُلُّ امْرِئٍ يُصِيْبُ اِلٰى مَنْ يُجَالِسُ یعنی ہر شخص اپنے ہم جنس کو پالیتا ہے۔

(۴) حضرت سعید ابن المسیّب رحمۃ اللہ علیہ

حضرت سعید ابن المسیّب رحمۃ اللہ علیہ کا علماء اور فقہاء میں بہت بڑا درجہ ہے۔ تفسیر، حدیث، فقہ، شعر، توحید اور حقائق وغیرہ علوم میں آپ کا بڑا مرتبہ ہے۔ نہایت پاک باز اور پاک

باطن آدمی تھے۔ لیکن بظاہر بہت ہوشیار (صاحب کشف المحجوب نے 'عیّار' کا لفظ استعمال فرمایا ہے) نظر آتے تھے۔ اور مشائخ میں یہ بات محمود اور قابل تعریف ہے کہ آدمی اپنے ظاہر سے باطن میں بہتر ہو۔

حضرت سعید بن مسیبؒ کے ارشادات میں سے ایک قول یہ ہے کہ: اِرْضَ بِالْیَسِیْرِ مِنَ الدُّنْیَا مَعَ سَلَامَةِ دِیْنِکَ کَمَا رَضِیَ قَوْمٌ بِکَثِیْرِھَا مَعَ ذَھَابِ دِیْنِھِمْ، یعنی تو اُس تھوڑی دنیا پر جو تجھے دین کی سلامتی کے ساتھ حاصل ہو اسی طرح سے راضی رہ جس طرح کہ بعض (بدنصیب) لوگ اپنا دین دے کر بہت سی دنیا حاصل کر لینے پر خوش ہیں۔ یاد رکھ کہ وہ فقر جو دین کی سلامتی کے ساتھ ہو وہ اس غنا سے بدرجہا بہتر ہے جو غفلت کے ساتھ اور دین کو ہاتھ سے دے کر حاصل ہو۔ وہ فقیر جس کا دین سلامت ہے جب اپنے دل کی طرف دیکھتا ہے تو اسے تفکرات سے آزاد پاتا ہے اور جب اپنے ہاتھ کی طرف دیکھتا ہے تو اسے قناعت والا اور باوقار پاتا ہے اور دین کو پسِ پشت ڈال کر اور اسے ہاتھ سے دے کر بہت سی دُنیا سمیٹنے والا 'غنی' جب اپنے دل کی طرف دیکھتا ہے تو اس میں (اس بہت مال کو) اتنا تھوڑا پاتا ہے کہ اور پریشان ہو جاتا ہے۔

آپ کے بارے میں یہ بھی روایت ہے کہ آپ مکہ معظمہ میں تھے کہ آپ کے پاس ایک شخص آیا اور اس نے عرض کیا کہ مجھے ایسا حلال بتایئے کہ جس میں حرام کا کوئی شائبہ نہ ہو اور اس حرام سے خبردار فرمایئے جس میں حلال نہ ہو۔ آپؒ نے فرمایا: ذِکْرُ اللّٰہِ حَلَالٌ لَیْسَ فِیْہِ حَرَامٌ وَذِکْرُ غَیْرِہٖ حَرَامٌ لَیْسَ فِیْہِ حَلَالٌ. یعنی اللہ کا ذکر وہ حلال ہے جس میں حرام کا کوئی شائبہ نہیں اور غیر اللہ کا ذکر ایسا حرام ہے کہ اس میں کچھ حلال نہیں۔ پس خدا کی یاد اور اس کے کام میں لگے رہو۔ اس کے سوا دوسروں کی یاد اور ان کے کاموں سے دست کش ہو جاؤ۔

☆☆☆☆☆

تبع تابعین رحمۃ اللہ تعالیٰ میں اہل طریقت کے پیشوا

(۱) حضرت حبیب العجمی رحمۃ اللہ علیہ:

آپ شریعت میں مضبوط، طریقت میں شجاع اور ایک عالی ہمت بزرگ تھے۔ آپ نے ابتداءً توبہ حضرت حسن بصریؒ کے ہاتھ پر کی۔ علم اور معاملات کی کچھ تعلیم بھی ان سے حاصل کی۔ ابتداءً عمر میں ہر قسم کی ریاکاری اور فساد میں لگے رہتے تھے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے سچی توبہ کی توفیق عطا فرمائی۔ زبان عجمی تھی۔ عربی زبان پر دسترس حاصل نہ تھی۔ بلکہ قرآن مجید بھی ٹھیک طرح سے نہیں پڑھ سکتے تھے۔ چنانچہ ایک روز حضرت حسن بصریؒ شام کے وقت آپ کے ہاں تشریف لائے۔ آپ اقامت کہہ کر مغرب کی نماز پڑھ رہے تھے۔ مگر حضرت حسن بصریؒ نے آپ کی اسی کمزوری کی وجہ سے کہ آپ قرآن مجید عربی زبان میں پوری صحت کے ساتھ نہ پڑھ سکتے تھے آپ کی اقتداء نہ کی اور اپنی نماز الگ پڑھی۔ رات کو جب حضرت حسن بصریؒ سوئے تو اپنے آپ کو اللہ عزوجل کے حضور پایا۔ آپ نے اللہ تعالیٰ سے پوچھا: بارخدایا، آپ کی رضا کس چیز میں ہیں؟ حکم ہوا کہ: اے حسن بصری! ہماری رضا تو نے پالی تھی مگر اس کی تو نے قدر نہ کی۔ حضرت حسن بصریؒ نے عرض کیا: خدایا! وہ کیا تھی؟ حکم ہوا کہ میری رضا یہ تھی کہ تو صحتِ نیت کے ساتھ بلا تامل حبیب عجمی کے پیچھے نماز کے لیے کھڑا ہو جاتا۔ (یہ واقعہ اُن لوگوں کی آنکھیں کھولنے کے لیے کافی ہونا چاہیے جو ذرا ذرا سی باتوں اور محض فقہی اختلافات کی بنا پر نمازیں اور مسجدیں الگ کر لیتے ہیں)۔

جب حضرت حسن بصریؒ حجاج کے ظلم سے بھاگے تو حضرت حبیب عجمیؒ کی عبادت گاہ میں آ کر چھپ گئے، وہ ظالم بھی ان کے پیچھے آ پہنچا اور حبیب عجمیؒ سے دریافت کیا کہ کیا تم نے حسن بصریؒ کو دیکھا ہے؟ آپ نے جواب دیا: ہاں، اندر میرے معبد میں چھپا ہوا ہے۔ حجاج اندر گیا مگر حضرت حسن بصریؒ کو کہیں نہ پا سکا اور باہر آ کر حضرت حبیب عجمیؒ سے کہنے لگا: تو نے جھوٹ کیوں

بولا ہے؟ حسن بصریؒ اندر نہیں ہے۔ آپ نے فرمایا: میں خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ میں نے جھوٹ نہیں کہا وہ اندر ہی ہیں۔ اسی طرح وہ تین مرتبہ اندر گیا اور ہر طرف حضرت حسن بصریؒ کو تلاش کیا مگر آپ اسے کہیں نظر نہ آئے۔ آخر تھک ہار کر وہ واپس چلا گیا۔ اس کے بعد حضرت حسن بصریؒ باہر آئے اور آپ نے فرمایا: اے حبیب! میں نے جان لیا کہ اللہ تعالیٰ نے تیری برکت سے مجھے گرفتار ہونے سے بچا لیا۔ حضرت حبیب نے جواب دیا: نہیں میری برکت سے نہیں، بلکہ یہ میرے سچ بولنے کا ثمرہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے ہمیں بخشا ہے۔ اگر میں جھوٹ بولتا تو ہم دونوں کو وہ رسوا کرتا۔

آپ سے کسی نے پوچھا کہ خدا کی رضا کس چیز میں ہے؟ آپ نے جواب دیا: فِـىْ قَلْبٍ لَيْـسَ فِيْهَـا غُبَـارُ نِفَاقٍ یعنی خدا کی رضا اس دل میں ہے کہ جس میں نفاق کا غبار نہیں۔ کیونکہ نفاق کا موافقت اور محبت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ جہاں نفاق ہے وہاں محبت نہیں اور جہاں محبت ہو وہاں نفاق نہیں۔

(۲) حضرت مالک ابن دینار رحمۃ اللہ علیہ:

آپ حضرت حسن بصریؒ کے دوست تھے۔ آپ کا باپ دینار غلام تھا اور آپ اس کی غلامی کے زمانے ہی میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی عمر میں لہو ولعب میں مشغول رہتے تھے۔ آپ کی توبہ کی داستان عجیب ہے۔ ایک رات لہو ولعب کے شوقین لوگوں کے ایک گروہ کے ساتھ گانے بجانے میں مشغول ہوئے۔ جب تھک کر سب سو گئے تو اسی ستار سے جس کو وہ بجا رہے تھے انھیں یہ آواز سنائی دی: يَـامَـالِكُ! مَـالَكَ اَنْ لَّاتَتُوْبَ. یعنی اے مالک! تجھے کیا ہو گیا ہے کہ تو توبہ نہیں کرتا۔ یہ اسی وقت اٹھ کھڑے ہوئے اور حضرت حسن بصریؒ کی خدمت میں حاضر ہو کر سچے دل سے توبہ کی۔

آپ کا ارشاد ہے کہ: اَحَبُّ الْاَعْمَالِ الْاِخْلَاصُ فِى الْاَعْمَالِ. یعنی سب اعمال میں پسندیدہ ترین عمل وہ ہے جس کی بنا اخلاص پر ہو۔ یہ اس لیے کہ عمل درحقیقت اخلاص ہی سے عمل بنتا

ہے۔ عمل کے لیے اخلاص کی حیثیت وہی ہے جو جسم کے لیے روح کی۔ جس طرح جسم بے روح بالکل نکما اور پھینک دینے کے قابل ہے اسی طرح عملِ بے اخلاص بالکل بے قدر ہے۔ عمل کے لیے ظاہر اور باطن دونوں یکساں ضروری ہیں۔ عمل کا ظاہر اطاعت اور اس کا باطن اخلاص ہے۔ اطاعت اور اخلاص دونوں کے جمع ہونے سے ہی دراصل عمل کی صورت بنتی ہے اور ایسا ہی عمل قدر و قیمت پاتا ہے۔ اگر کوئی شخص ہزار سال بھی نرے اخلاص کو دل میں لیے بیٹھا رہے اسے کچھ اثر نہ ہوگا۔ کیونکہ جب تک اس اخلاص کے ساتھ عملِ مقرون (ظاہری اطاعت) نہ ہو وہ اخلاصِ مطلوب نہیں ہوگا۔ اسی طرح اگر کوئی شخص ہزار سال تک عمل کرتا رہے جب تک اس عمل کے ساتھ اخلاص نہیں شامل ہوگا وہ عمل نہیں کہلائے گا اور نہ اسے فرمانبرداری کہا جائے گا۔

آپ کے متعلق روایت ہے کہ ایک دفعہ آپ کشتی میں سوار ہوئے۔ اسی کشتی میں ایک سوداگر کا ایک موتی کھو گیا۔ آپ کو اس کی کوئی خبر نہ تھی۔ مگر آپ کی فقیرانہ صورت دیکھ کر آپ پر یہ تہمت لگائی گئی کہ یہ آپ ہی نے چوری کیا ہے۔ آپ نے تھوڑی دیر ملتجیانہ نگاہوں سے آسمان کی طرف دیکھا کہ دریا سے بے شمار مچھلیاں اپنے اپنے مونہوں میں ایک ایک موتی لیے سطحِ آب پر نمودار ہو گئیں اور سب نے آپ کی طرف منہ کر دیا۔ آپ نے ایک کے منہ سے موتی لے کر تہمت لگانے والے کو دے دیا اور خود کشتی سے نکل کر دریا میں داخل ہو گئے اور چلتے ہوئے کنارے پر پہنچ گئے۔

(۳) حضرت ابوسلیم حبیب بن اسلم راعی رحمۃ اللہ علیہ:

آپ حضرت سلمان فارسیؓ کے مصاحب تھے۔ آپ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا: نِيَّةُ الْمُؤْمِنِ خَيْرٌ مِنْ عَمَلِهِ یعنی مومن کی نیت اس کے عمل سے بہتر ہے۔

آپ دریائے فرات کے کنارے پر بود و باش رکھتے تھے اور بکریاں چرایا کرتے تھے۔ آپ کا طریقہ گوشہ نشینی تھا۔

ایک مرتبہ ایک شخص نے دیکھا کہ آپ نماز پڑھ رہے ہیں اور ایک بھیڑیا آپ کی بکریوں کی حفاظت کر رہا ہے۔ جب آپ نماز سے فارغ ہوئے تو اس شخص نے آگے بڑھ کر سلام کیا۔ آپ نے فرمایا: بیٹے! کیسے آئے ہو؟ اس نے جواب دیا کہ حضور کی زیارت کے لیے آیا ہوں۔ آپ نے فرمایا: جزاک اللہ۔ راوی (یکے از مشائخ رحمہم اللہ) کہتا ہے کہ میں نے عرض کیا: اے شیخ! میں بھیڑیے کی بکریوں سے موافقت دیکھتا ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ جب ان بکریوں کا چرواہا خداوند کریم کے موافق ہے تو بھیڑیا (جو اس کی مخلوق ہے) اس کی بکریوں کے موافق کیوں نہ ہو۔ آپ نے اتنی بات کہی اور ایک لکڑی کا پیالہ پتھر کے نیچے رکھا۔ اس پتھر سے دو چشمے بہہ نکلے۔ ایک دودھ کا اور دوسرا شہد کا۔ اور آپ نے فرمایا: لو، پی لو۔ میں نے عرض کیا: اے شیخ! آپ نے یہ درجہ کس طرح پایا؟ آپ نے فرمایا: بس محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی فرمانبرداری سے۔ پھر فرمایا: اے بیٹے! جو خدا موسیٰ علیہ السلام کے لیے پتھر سے بارہ چشمے جاری کر سکتا ہے۔ حالانکہ موسیٰ علیہ اسلام محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے درجہ پر نہ تھے تو جو شخص اپنے آپ کو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے موافق بنا لے، اس کے لیے پتھر سے دودھ اور شہد نکال دینے میں کیا تعجب کی بات ہے۔ میں نے عرض کیا کہ مجھے کچھ نصیحت فرمایئے۔ آپ نے فرمایا: لَا تَجْعَلْ قَلْبَکَ صَنْدُوْقَ الْحِرْصِ وَبَطْنَکَ وِعَاءَ الْحَرَامِ. یعنی اپنے دل کو حرص کا صندوق نہ بناؤ اور پیٹ کو حرام کا برتن نہ بناؤ۔ اس لیے کہ انسان ان دو چیزوں ہی سے ہلاک ہوتا ہے۔

(۴) حضرت ابوحازم مدنی رحمۃ اللہ علیہ:

آپ فقر میں صادق قدم اور مجاہدے میں کامل تھے۔ عمرو بن عثمان مکی جو آپ کی صحبت میں رہے، روایت کرتے ہیں کہ آپ سے ایک شخص نے پوچھا: مَا مَالُکَ؟ قَالَ الرِّضَا عَنِ اللّٰہِ وَالْغِنٰی عَنِ النَّاسِ، یعنی آپ کا اثاثہ کیا ہے؟ آپ نے جواب میں ارشاد فرمایا: میرا اثاثہ خدا کی رضا اور مخلوق سے بے نیازی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو شخص خداوند تعالیٰ کے ساتھ راضی ہو جاتا ہے وہ مخلوقات سے مستغنی ہو جاتا ہے۔ وہ پھر خدا کی درگاہ کے سوا کسی اور درگاہ کو نہیں جانتا اور

خلوت وجلوت میں اس کے سوا کسی کو نہیں پکارتا۔

ایک شیخ بیان کرتے ہیں کہ میں حج کے لیے جا رہا تھا کہ آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ سو رہے تھے۔ میں نے تھوڑی دیر انتظار کیا کہ آپ بیدار ہوئے اور مجھ سے فرمایا کہ میں نے ابھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا۔ آپؐ نے میرے ذریعے تجھے پیغام دیا ہے کہ والدہ کا حق نگاہ میں رکھنا، حج کرنے سے بہتر ہے۔ چنانچہ میں واپس لوٹ آیا اور والدہ کی خدمت میں لگ گیا۔

(۵) حضرت محمد بن واسع رحمۃ اللہ علیہ:

آپ بہت سے تابعین کی صحبت سے فیض یافتہ تھے اور آپ کے زمانے میں آپ کا کوئی مثل نہ تھا۔ آپ کا ارشاد ہے: مَارَأَیْتُ شَیْئاً اِلَّا وَرَأَیْتُ اللّٰہَ فِیْہِ، یعنی میں نے کوئی چیز ایسی نہیں دیکھی جس میں میں نے خدا کو نہ دیکھا ہو۔ اس لیے کہ صاحبِ نظر وبصیرت شخص فعل پر نظر کرنے سے فاعل کا اور تصویر پر نظر کرنے سے مصور کا نظارہ کرسکتا ہے کہ وہ کس شان، کس علم وحکمت اور کن صفات کا مالک ہے۔

بعض لوگوں نے حضرت محمد واسعؒ کے اس قول سے اللہ تعالیٰ کے مظاہر کائنات میں حلول کرنے کا عقیدہ اخذ کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن ایسا عقیدہ صریحاً کفر ہے۔ اس کے اصل معنی وہی ہیں جو اوپر بیان کیے گئے ہیں۔

(۶) حضرت ابو حنیفہ نعمان[1] بن ثابت رحمۃ اللہ علیہ:

آپ اہل سنت والجماعت کے مقتداء اُن کے اماموں کے امام، فقہاء کا شرف اور علماء کی عزت ہیں۔ آپ اہل طریقت میں بڑی شان رکھتے ہیں۔ آپ کا دل مخلوق کے مرتبہ وریاست سے بالکل پاک تھا۔ ابتداء میں گوشہ نشینی کا قصد فرمایا۔ لیکن ایک رات آپ نے خواب میں دیکھا کہ حضور نبی کریمؐ کی ہڈیوں کو آپؐ کی لحد مبارک سے جمع کر رہے ہیں اور بعض ہڈیوں کو دوسری

[1] مولانا شبلی نعمانی مرحوم نے سیرت النعمان میں امام ابو حنیفہؒ کو حافظ ابن حجر عسقلانی اور ابن سعد کے حوالوں سے تابعی ثابت کیا ہے (مرتب)

کے مقابلہ میں پسند کر رہے ہیں۔ اس خواب سے آپ سخت پریشان ہوئے اور حضرت محمد بن سیرین رحمۃ اللہ علیہ کے ایک ساتھی سے اس کی تعبیر پوچھی۔ انھوں نے کہا کہ تم حضورؐ کی سنت کی حفاظت میں اس درجہ کو پہنچو گے کہ صحیح کو سقیم سے جدا کرو گے۔ اس کے بعد دوسرا خواب آپ نے یہ دیکھا کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم آپ سے فرما رہے ہیں: اے ابوحنیفہ! اللہ تعالیٰ نے تجھ کو میری سنت کو زندہ کرنے کے لیے پیدا کیا ہے۔ گوشہ نشینی کا قصد نہ کرو۔ مشائخ میں سے ابراہیم ادھم، فضیل بن عیاض، داؤد طائی اور بشر حافی رحمہم اللہ تعالیٰ آپ کے تلامذہ ہیں۔

مخلوق کے ہاں مرتبہ وریاست سے آپ کا دل کس درجہ پاک اور بلند و بالا تھا اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے کیا جا سکتا ہے: خلیفۂ وقت ابوجعفر منصور نے فیصلہ کیا کہ ابوحنیفہ، سفیان ثوری، شُریک اور صلہ بن اشیم میں سے کسی ایک کو قاضی مقرر کرنا چاہیے تا کہ ان کے اثر سے فائدہ اٹھایا جا سکے۔ چنانچہ ان چاروں کو بلوا بھیجا۔ راستے میں امام ابوحنیفہؒ نے اپنے تینوں ساتھیوں کا جائزہ لینے کے بعد کہا کہ: میں کسی نہ کسی حیلہ سے عہدہ قضا کو اپنے سے دفع کر لوں گا۔ تم میں سے سفیان بھاگ کر اپنی جان بچا لے، صلہ اپنے آپ کو دیوانہ بنا لے اور شُریک اس عہدے کو قبول کر لے۔ چنانچہ سفیان ثوریؒ بھاگ کر ایک کشتی میں جا چھپے جو دریا کے دوسری طرف جا رہی تھی اور کشتی والوں سے کہا کہ مجھے چھپا لو کچھ لوگ مجھے ذبح کرنا چاہتے ہیں۔ سفیانؒ کے یہ کہنے میں ان کا اشارہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کی طرف تھا کہ: مَنْ جُعِلَ قَاضِيًا فَقَدْ ذُبِحَ بِغَيْرِ سِكِّيْنٍ یعنی جو شخص قاضی بنایا گیا وہ بغیر چھری کے ذبح کیا گیا۔ چنانچہ ملاحوں نے سفیان ثوریؒ کو چھپا لیا اور باقی تینوں حضرات منصور کے روبرو پیش کر دیے گئے۔

سب سے پہلے منصور نے امام ابوحنیفہؒ کو عہدہ قضا قبول کرنے کے لیے کہا۔ آپ نے فرمایا: امیر! میں عربی نہیں ہوں، اس لیے عرب سردار میرے حاکم بننے پر راضی نہ ہوں گے۔ منصور نے جواب دیا کہ: اوّل تو یہ کام صرف عربوں سے متعلق نہیں ہے اور اس کام کا تعلق عرب و غیر عرب سب کے ساتھ ہے۔ اور دوسرے اس کام میں سب سے مقدم چیز علم ہے اور تم علم میں اس زمانہ کے علماء میں سب سے بڑھ کر ہو۔ امام ابوحنیفہؒ نے فرمایا کہ: میں اس کام کا اہل نہیں ہوں۔

اگر آپ مجھے ایک سچا آدمی سمجھتے ہیں تو آپ کو میری بات قبول کر کے ایک نااہل آدمی کو قضا کے عہدے پر مقرر نہیں کرنا چاہیے اور اگر میری یہ بات آپ کے نزدیک جھوٹ ہے تو ایک جھوٹا آدمی مسلمانوں کی قضا کے لائق نہیں اور خلیفہ کو ایک جھوٹے آدمی کو اپنا نائب بنا کر مسلمانوں کے جان ومال اس کے ہاتھ میں نہیں سونپنے چاہئیں۔ چنانچہ منصور نے لاجواب ہو کر اور آپ کو ایک بے ڈھب آدمی جان کر چھوڑ دیا۔

ان کے بعد صلہ بن اشیم پیش ہوئے۔ آپ نے منصور کا ہاتھ زور سے پکڑ کر کہا: کہو، کیا حال ہے؟ تیرے بال بچے اور مال مویشی اچھے ہیں؟ منصور نے کہا کہ: یہ تو کوئی دیوانہ ہے، اسے باہر نکال دو۔ اس کے بعد شُرَیک کی باری آئی اور انھیں قاضی بنا دیا گیا، اور اس کے بعد امام ابوحنیفہؒ نے شُرَیک سے کبھی کلام نہیں کیا۔

اس سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ امام صاحب کے نزدیک صحیح اور سلامتی کی راہ مرتبہ وریاست اور امراء وسلاطین سے دُوری میں ہے۔ مگر آج کل تمام علماء قضاء کے عہدہ کے خواستگار ہیں اور اسے اچھا سمجھتے ہیں۔ اس کی وجہ اس کے سوا اور کیا ہے کہ ان کے دل ہوائے باطل میں گرفتار ہیں اور حق کے راستے سے بھاگنے والے ہیں۔ انھوں نے امراء کے گھروں کو اپنا قبلۂ مقصود بنا رکھا ہے۔ جفا پیشہ لوگوں کے گھروں کو اپنا بیت المعمور قرار دے رکھا ہے اور جابروں کی خواب گاہوں (بچھونوں) کو قَابَ قَوْسَیْنِ اَوْ اَدْنٰی سمجھے ہوئے ہیں۔ جو باتیں ان کے سرپرستوں کی مرضی کے ناموافق ہوں، اُن سب کا انکار کر دیتے ہیں۔ اسی طرح کا علم وامامت کا ایک مدعی مجھے غزنی میں ملا اور اس نے مجھے کہا کہ گودڑی پہننی بدعت ہے۔ میں نے اس سے کہا کہ: حلال پیسوں سے حلال کپڑا خرید کر پہننا تو آپ کے نزدیک بدعت ہے لیکن حشیشی اور دبقی لباس جو خالص ریشم کا ہوتا ہے اس کے پہننے اور اسے ظالموں سے ان کی منت اور خوشامدیں کر کے لینے کے بارے میں کیا ارشاد ہے؟ جو چیز مردوں کے لیے صریحاً حرام ہے اسے حرام طریقے سے ان لوگوں سے لیتے ہو جن کی مِلک مطلق حرام ہے اور اُسے پہنتے ہو، اس میں کوئی حرمت وبدعت تمھیں نظر نہیں آتی۔ لیکن ایک فقیر کے حلال کپڑے اور حلال طریق سے بنی ہوئی گودڑی کا بدعت

ہوتا تمھیں نظر آ گیا۔ اگر طبیعت کی رعونت اور نفس کی ضلالت تم پر چھائی ہوئی نہ ہوتی تو تم کوئی پختہ بات کرتے۔

یحییٰ بن معاذ رحمۃ اللہ علیہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا اور میں نے آپؐ سے عرض کیا کہ: اَیْنَ اَطْلُبُکَ؟ قَالَ عِنْدَ عِلْمِ اَبِیْ حَنِیْفَۃَ، یعنی یا رسولؐ اللہ! میں آپ کو کہاں تلاش کروں؟ حضورؐ نے فرمایا: مجھے ابوحنیفہؒ کے علم میں تلاش کرو۔

میں علی بن عثمان جلابی ملک شام میں حضرت بلال مؤذن رضی اللہ عنہ کے روضہ پر سویا ہوا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو خواب میں مکہ معظمہ میں دیکھا اور کیا دیکھتا ہوں کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک بوڑھے کو ایک بچے کی مانند اپنی بغل میں دبائے ہوئے بنی شیبہ کے دروازے کے اندر تشریف لا رہے ہیں۔ میں نے فرطِ محبت میں دوڑ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاؤں کو بوسہ دیا اور اس تعجب میں تھا کہ یہ بوڑھا کون ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ: یہ تیرے امام ہیں اور تیری اپنی ولایت کے ہیں، یعنی امام ابوحنیفہ رضی اللہ عنہ ہیں۔ اس سے میں نے سمجھا کہ آپ کا فہم حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی میں بے خطا ہے۔ کیونکہ وہ حضورؐ کے پیچھے خود نہیں جا رہے تھے بلکہ حضورؐ انھیں خود اٹھائے لے جا رہے تھے۔ اس لیے وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی و متابعت میں باقی الصفت تھے کہ انھیں اس کام کے لیے برگزیدہ کر لیا گیا تھا۔

حضرت امام ابوحنیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ خود فرماتے ہیں کہ: جب نوفل بن حبان رضی اللہ عنہ کا انتقال ہوا تو میں نے خواب میں دیکھا کہ قیامت برپا ہے اور تمام مخلوق حساب گاہ میں کھڑی ہے۔ میں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپؐ حوضِ کوثر پر کھڑے ہیں۔ ایک بہت خوبصورت سفید بالوں والے بزرگ حضورؐ کے رخساروں پر منہ رکھے ہوئے ہیں اور نوفل بھی وہاں موجود ہیں۔ جب نوفلؓ نے مجھے دیکھا تو میرے پاس آیا اور مجھے سلام کہا۔ میں نے کہا کہ مجھے پانی پلاؤ۔ نوفلؓ نے کہا کہ میں حضورؐ سے اجازت لے لوں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انگلی سے اشارہ فرمایا کہ پانی پلا دو۔ نوفلؓ نے پانی کا پیالہ بھر کر مجھے پلایا اور میرے ساتھیوں کو بھی پلایا۔ سب نے

پی لیا مگر پیالہ کا پانی ویسے کا ویسا ہی رہا۔ اس میں سے کچھ بھی کم نہ ہوا۔ میں نے نوفلؒ سے پوچھا کہ حضورؐ کے دائیں طرف یہ جو بوڑھے بزرگ ان کے رخسار پر منہ رکھے ہوئے ہیں یہ کون ہیں؟ اس نے بتایا کہ یہ ابراہیم علیہ السلام ہیں اور آپؐ کے بائیں پہلو پر حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں۔ میں ایک ایک کے بارے میں پوچھتا جاتا اور نوفلؒ مجھے بتاتے جاتے۔ ساتھ ہی میں اپنی انگلیوں کی گرہوں پر شمار کرتا جاتا۔ سترہ آدمیوں کے بارے میں ابھی میں نے پوچھا تھا کہ آنکھ کھل گئی اور ٹھیک سترہ عدد ہاتھ کی انگلیوں پر گنے ہوئے تھے۔

داؤد طائی رحمۃ اللہ علیہ جب حصول علم سے فارغ ہو چکے تھے اور اپنے زمانے کے مقتدر علماء میں سے شمار ہوتے تھے تو امام ابوحنیفہؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ اب کیا کروں؟ امام ابوحنیفہؒ نے فرمایا: عَلَیْکَ بِالْعَمَلِ فَاِنَّ الْعِلْمَ بِلَا عَمَلٍ کَالْجَسَدِ بِلَا رُوْحٍ، یعنی اب تجھے اپنے علم پر عمل کرنا چاہیے اس لیے کہ جو علم بغیر عمل کے ہے اُس کی مثال اس بدن کی ہے جس میں رُوح نہ ہو۔

(۷) حضرت عبداللہ بن مبارک مروزی رحمۃ اللہ علیہ:

آپ زاہدوں کے سردار اور اوتاد کے پیشوا ہیں۔ شریعت و طریقت کے عالم اور وقت کے امام تھے۔ بزرگ مشائخ کے صحبت و تربیت یافتہ تھے۔ صاحبِ تصانیف و کرامات اور علم کے ہر فن میں ماہر تھے۔ آپ کی توبہ کا واقعہ عجیب اور عبرت انگیز ہے۔ آپ ایک حسین و جمیل کنیز کے عشق میں مبتلا تھے۔ ایک رات اپنے ایک دوست کو ساتھ لے کر اپنی معشوقہ کی دیوار کے نیچے جا کھڑے ہوئے۔ ادھر معشوقہ بھی چھت پر آ گئی اور ساری رات اسی طرح ایک دوسرے کو دیکھنے میں اس درجہ محو رہے کہ جب فجر کی اذان ہوئی تو سمجھے کہ عشاء کی اذان ہوئی ہے۔ جب بالکل دن چڑھ گیا تو سمجھے کہ ساری رات اسی نظارہ میں نکل گئی۔ اس سے اچانک آپ کو تنبیہہ ہوئی اور دل نے کہا: اے مبارک کے بیٹے! تجھے شرم نہیں آتی کہ نفسانی خواہش کے پیچھے ساری رات پاؤں پر کھڑے گزار دی، لیکن اگر امام نماز میں سورت ذرا لمبی کر دے تو تُو دیوانہ ہو جاتا ہے اور اس پر بھی مومن

ہونے کا دعویٰ کرتا ہے اور ولایت کا خواستگار ہے۔ اسی وقت سے خدا سے سچے دل کے ساتھ توبہ کی اور علم اور اس کی طلب میں مشغول ہو گئے اور زہد و دینداری کی زندگی اختیار کر لی۔ مروز کو چھوڑ کر بغداد چلے گئے اور عرصۂ دراز تک علماء و مشائخ کی صحبت میں رہے۔ چند روز مکہ معظمہ میں بھی رہے اور پھر مروز واپس آ کر تعلیم و اصلاح کے کام میں مصروف ہو گئے۔ مروز میں لوگ اہل حدیث اور اہل طریقت کے دو گروہوں میں تقسیم تھے۔ لیکن آپ کو دونوں اپنا بزرگ اور اپنا ہم خیال مانتے تھے اور آج تک آپ کو رَضِیُ الفَرِیقَین کے لقب سے پکارتے ہیں۔ آپ نے اپنے ہاں دو کمرے بنوائے۔ ایک اہل حدیث کے لیے اور دوسرا اہل طریقت کے لیے اور ان میں آج تک دونوں درس اصلی قاعدہ پر چل رہے ہیں۔ پھر آپ حجاز تشریف لے گئے اور وہاں مجاوری اختیار کی۔

ایک مرتبہ آپ کی والدہ نے آپ کو دیکھا کہ باغ میں پڑے سو رہے ہیں اور ایک سانپ منہ میں ریحان کی ٹہنی لیے آپ پر سے مکھیاں اڑا رہا ہے۔

آپ سے لوگوں نے پوچھا کہ عجائباتِ زمانہ سے آپ نے کیا دیکھا۔ آپ نے فرمایا کہ میں نے ایک راہب کو دیکھا کہ مجاہدہ اور خدا کی عبادت کر کر کے بہت کمزور اور اپنی کمر کو کمان کی مانند کیے ہوئے تھا۔ میں نے اس سے پوچھا: کَیفَ الطَّرِیقُ اِلَی اللّٰہِ؟ قَالَ لَو عَرَفتَ الطَّرِیقَ اِلَیہِ، فَقَالَ اَعبُدُ مَن لَّا اَعرِفُهٗ وَتَعصِی مَن تَعرِفُهٗ یعنی اللہ کی طرف راستہ کون سا ہے؟ اس نے جواب دیا کہ اگر تو اللہ کو پہچانتا ہے تو اس کی طرف جانے والے راستے کو ضرور جانتا ہے۔ اس کے بعد اُس نے کہا کہ مجھے دیکھو کہ میں ابھی اسے پوری طرح نہیں پہچانتا اور میں نے اس کی بندگی میں اپنا یہ حال کر لیا ہے اور تو اس کو جانتے ہوئے اس کی نافرمانی کرتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خداوند تعالیٰ کے وجود سے آدمی کا واقف ہونا اس کے لیے کافی ہونا چاہیے کہ وہ یہ جان لے کہ اس کی طرف جانے کا راستہ کون سا ہے۔ کیونکہ خداوند تعالیٰ کے وجود سے واقفیت کا بدیہی تقاضا یہ ہے کہ آدمی کے دل میں اس کا ڈر اور خوف پیدا ہو اور اس ڈر اور خوف کا اوّلین اور لازمی تقاضا یہ ہے کہ اس کی نافرمانی سے بچا جائے۔ پس جو شخص خدا کے وجود کا قائل ہو گا وہ اس کی نافرمانی سے بچنے کی کوشش ضرور کرے گا۔ اور جو خدا کی نافرمانی کی راہ پر چل رہا ہے وہ اگر کہتا ہے کہ وہ خدا کے وجود کا

قائل ہے تو جھوٹ کہتا ہے۔ حضرت عبداللہؒ فرماتے ہیں کہ مجھے راہب کے اس کلام سے نصیحت حاصل ہوئی اور اس کے بعد میں بہت سے ناکردنی کاموں سے بچ گیا جن کو پہلے کر جاتا تھا۔

حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کا قول ہے: اَلسُّکُوْنُ حَرَامٌ عَلٰی قُلُوْبِ اَوْلِیَآئِہٖ یعنی اللہ کے دوستوں کے دل کبھی سکون پذیر نہیں ہوتے وہ ہمیشہ بے قرار رہتے ہیں۔ اس کی وجہ ظاہر ہے، دل کو سکون یا تو مقصود کو پالینے سے حاصل ہوتا ہے یا اپنے مقصود سے بے خبر ہونے سے۔ خداوند تعالیٰ کے دوستوں کے لیے اپنے مقصود سے بے خبری کا کوئی سوال نہیں۔ ان کے لیے بے خبری تو درکنار غفلت بھی حرام ہے، اور جہاں تک مقصود کو پانے کا تعلق ہے وہ آخرت ہی میں حاصل ہوگا۔ دنیا کی زندگی میں تو انھیں کبھی یہ اطمینان بھی حاصل نہیں ہوتا کہ انھوں نے فی الواقع حق تعالیٰ کا حق ادا کر دیا ہے۔ جس سے ان کا مقصود انھیں یقیناً مل جائے گا۔ اس لیے اس زندگی میں ان کے دل دھڑکن سے کبھی آرام نہیں پکڑتے۔

(۸) حضرت ابوعلی فضیل بن عیاض رحمۃ اللہ علیہ:

اہل طریقت میں آپ کا بہت بڑا درجہ ہے۔ ابتدائے عمر میں آپ بڑے جرائم پیشہ آدمی تھے۔ مَرو اور ماورد کے درمیان ڈاکہ زنی اور لوٹ آپ کا مشغلہ تھا۔ لیکن اس ڈاکہ زنی اور لوٹ مار میں بھی خداترسی کی ایک شان موجود تھی۔ اپنے شکار قافلوں کی عورتوں سے بالکل الگ رہتے۔ اگر کسی کے پاس مال کم ہوتا تو اس سے تعرض نہ کرتے اور جسے لُوٹتے اس کے پاس اپنی دانست میں مناسب سرمایہ رہنے دیتے۔ ان کی توبہ اور ہدایت یابی کا قصہ دلچسپ اور عجیب ہے۔ ایک سوداگر مَرو سے ماورد جا رہا تھا۔ جب وہ مرو[1] سے روانہ ہونے لگا تو لوگوں نے اس سے کہا کہ اپنی حفاظت کے لیے سرکاری آدمیوں کا ایک دستہ ساتھ لے لو۔ راستے میں فُضیل ڈاکو لوگوں کو لوٹ لیتا ہے۔ اس نے کہا کہ محافظ دستہ کی ضرورت نہیں۔ میں نے سنا ہے کہ وہ ایک خداترس آدمی ہے۔ سوداگر نے کوئی محافظ دستہ ساتھ لینے کے بجائے یہ کیا کہ مَرو سے ایک قاری اپنے ساتھ لے لیا اور قافلہ

---

[1] مَرو خراسان کا ایک شہر ہے جو مامون الرشید کا دارالحکومت تھا۔ سلجوقیوں کے دورِ حکومت میں بھی الپ ارسلان اور سلطان سنجر کا دارالحکومت مَرو ہی تھا اور ان کے زمانے میں یہ علم و ادب کا سب سے بڑا مرکز تھا۔

کے سب سے اگلے اونٹ پراسے بٹھادیا اور اس کو حکم دیا کہ جب قافلہ جنگل میں داخل ہو تو وہ قرآن مجید کی تلاوت شروع کر دے۔ چنانچہ قاری نے ایسا ہی کیا۔ خداوند تعالیٰ کی قدرت کا کرشمہ دیکھیے کہ جب قافلہ اس مقام پر پہنچا جہاں فُضیل اس قافلے کو لوٹنے کے لیے گھات لگائے بیٹھا تھا تو قاری خوش الحانی کے ساتھ سورۂ الحدید کی درج ذیل آیات کی تلاوت کر رہا تھا۔ فضیل اس طرف متوجہ ہوا تو اس کے کان میں آواز پڑی:

اَلَمْ يَاْنِ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْ تَخْشَعَ قُلُوْبُهُمْ لِذِكْرِ اللّٰهِ وَمَا نَزَلَ مِنَ الْحَقِّ ۙ وَلَا يَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلُ فَطَالَ عَلَيْهِمُ الْاَمَدُ فَقَسَتْ قُلُوْبُهُمْ ؕ وَكَثِيْرٌ مِّنْهُمْ فٰسِقُوْنَ ۝ اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يُحْيِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا ؕ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝ (الحدید:۱۶۔۱۷)

''کیا ایمان کے دعوے داروں کے لیے ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ ان کے دل خدا کی یاد اور اس کے نازل کردہ حق کی طرف جھک جائیں؟ اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جائیں جن کو ان سے پہلے کتاب عطا کی گئی۔ اُن کا حال یہ ہو گیا کہ جب کتاب ملے کچھ مدت گزر گئی تو ان کے دل سخت ہو گئے اور آج بھی ان میں سے پیشتر نافرمانی کی راہ پر گامزن ہیں۔ جان لو کہ اللہ (بار بار تمھاری آنکھوں کے سامنے) زمین کو اس کے مردہ ہو جانے کے بعد زندگی بخشتا ہے۔ دیکھو، ہم نے اپنی تعلیمات کو تم پر بالکل واضح کر دیا ہے شاید کہ تم عقل سے کام لو۔''

فضیل کے دل و دماغ کو ان آیات سے ایک شدید جھٹکا محسوس ہوا جیسے کوئی گہری نیند سویا ہوا شخص دھماکے سے بیدار ہو۔ اتنے میں قاری ان آیات پر پہنچ گیا اور اُس نے اپنی پوری قوت سے کہا:

اِعْلَمُوْٓا اَنَّمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ وَّزِيْنَةٌ وَّتَفَاخُرٌۢ بَيْنَكُمْ وَتَكَاثُرٌ فِي الْاَمْوَالِ وَالْاَوْلَادِ ؕ كَمَثَلِ غَيْثٍ اَعْجَبَ الْكُفَّارَ نَبَاتُهٗ ثُمَّ يَهِيْجُ فَتَرٰىهُ مُصْفَرًّا ثُمَّ يَكُوْنُ حُطٰمًا ؕ وَفِي الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ۙ وَّمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٌ ؕ وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ۝ سَابِقُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا

كَعَرْضِ السَّمَآءِ وَالْأَرْضِ لا أُعِدَّتْ لِلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ط ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ط وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ٥ (الحدید:۲۰۔۲۱)

''جان لو کہ (آخرت کی حقیقی زندگی کے مقابلہ میں) دنیا کی یہ زندگی محض ایک کھیل و تماشا، ایک (عارضی) سامانِ زینت و آرائش، تمھارے آپس میں ڈینگیں مارنے اور مال و اولاد میں ایک دوسرے سے بڑھ جانے کی ہوس سے زائد کچھ نہیں ہے۔ اس کی مثال بارش کی ہے کہ اس میں لہلہاتی کھیتی کو دیکھ دیکھ کر کسان جھومتے ہیں۔ پھر (چند ہی روز میں) وہ زرد پڑ کر چورا چورا ہو جاتی ہے۔ (سُن لو، اس دنیا کے بعد) آخرت میں (ایک طرف نافرمانوں کے لیے) شدید عذات اور (دوسری طرف اطاعت گزاروں کے لیے) اللہ کی بخشش اور رضا ہو گی۔ اور یہ دنیا کی زندگی محض ایک بھلاوے کا سامان (فقط دھوکے کی ٹٹی) ہے۔ پس اپنے رب کی مغفرت اور اس جنت کی طرف لپکو، جس کی وسعت زمین و آسمان کی وسعت کے برابر ہے، اور جو اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لانے والوں کے لیے تیار کی گئی ہے۔ یہ ہے حقیقت میں اللہ کا فضل جسے جس کو چاہے عطا فرما دے، اور اللہ بڑا ہی فضل فرمانے والا ہے۔''

یہ سنتے ہی فضیل کی کایا پلٹ گئی اور خدا ترسی کا جوہر جو ہر دل میں چھپا ہوا تھا غالب آ گیا۔ چنانچہ ڈاکہ زنی اور لوٹ مار سے آپ نے سچی توبہ کی۔ جن جن لوگوں کے بارے میں معلوم تھا کہ ان کا مال لوٹا ہے ان سب کو خوش کیا اور ان کا مال ان کو واپس کیا۔ مکہ معظمہ پہنچ کر عرصہ تک بیت اللہ کے خادم رہے۔ بہت سے بزرگانِ دین کی صحبت میں رہے، جن میں امام ابوحنیفہؒ بھی شامل ہیں۔ آپ بہت سی حدیثوں کے راوی ہیں۔ تصوّف اور معرفت کے حقائق میں آپ کا کلام بلند مرتبہ ہے۔ آپ سے روایت ہے: ''مَنْ عَرَفَ اللّٰهَ حَقَّ مَعْرِفَتِهٖ عَبَدَهٗ بِكُلِّ طَاقَةٍ، یعنی جو شخص اللہ کو پہچان لیتا ہے جیسا کہ اللہ کو جاننے کا حق ہے وہ پھر اپنی پوری طاقت کے ساتھ اس کی بندگی کرتا ہے۔'' گویا ایک شخص کا اپنے رب کے بارے میں طرزِ عمل یہ بات بتا دیتا ہے کہ اس نے اپنے رب کو کہاں تک پہچانا ہے اور اس کا اس کے بارے میں کیا تصور ہے۔ جس قدر آدمی خدا کی معرفت اور اس سے دوستی میں بڑھتا چلا جائے گا وہ اس کی فرمانبرداری میں حریص ہوتا چلا جائے

گا۔ چنانچہ حضور نبی کریمؐ کے بارے میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے:

''ایک رات کا ذکر ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اٹھے اور حجرے سے باہر تشریف لے گئے۔ میں نے خیال کیا کہ آپؐ کسی دوسرے حجرے میں تشریف لے گئے ہیں۔ میں اٹھی اور آپؐ کے پاؤں کی آہٹ سے آپؐ کا پیچھا کرتی ہوئی آپؐ کے پیچھے چلی گئی یہاں تک کہ میں مسجد تک پہنچ گئی...... وہاں میں نے آپؐ کو نماز پڑھتے ہوئے پایا۔ آپؐ صبح کی نماز تک روتے رہے یہاں تک کہ بلالؓ آیا اور اس نے فجر کی اذان دی۔ جب آپؐ صبح کی نماز سے فارغ ہو کر واپس حجرہ میں آئے تو آپؐ کے دونوں پاؤں سوجے ہوئے تھے۔ پاؤں کے دونوں انگوٹھے پھٹے ہوئے تھے اور ان سے زرد پانی بہہ رہا تھا۔ میں نے رو کر عرض کیا: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیک وسلمک! آپؐ کے تو اگلے پچھلے سب گناہ اللہ تعالیٰ نے معاف فرما دیے ہیں پھر آپؐ اپنے آپ کو اس قدر مشقت میں کیوں ڈالتے ہیں؟ آپؐ نے فرمایا: اے عائشہؓ! یہ تو میرے ربّ کا فضل اور احسان ہے اَفَلَا اَکُوْنَ عَبْدًا شَکُوْرًا، کیا میں اس کا شکرگزار بندہ نہ بنوں۔ میرے رب نے تو میرے ساتھ بخشش و سرفرازی کا یہ معاملہ کیا اور تو کہتی ہے کہ مجھے اس کی بندگی نہ کرنی چاہیے؟

فضل بن ربیع بیان کرتے ہیں کہ میں خلیفہ ہارون الرشید کے ساتھ حج کے لیے مکہ معظمہ گیا۔ جب ہم حج سے فارغ ہوئے تو ہارون الرشید نے مجھ سے کہا کہ اگر یہاں کوئی خدا رسیدہ شخص ہو تو اس کی زیارت کے لیے چلیں۔ میں نے عرض کیا کہ عبدالرزاق صنعانی یہاں موجود ہیں۔ خلیفہ نے کہا کہ مجھے ان کے پاس لے چلو۔ چنانچہ ہم ان کے پاس گئے۔ کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد رخصت ہوئے۔ ہارون الرشید نے مجھ سے کہا کہ ان سے دریافت کرو کہ آپ کے ذمے کوئی قرض تو نہیں؟ میرے دریافت کرنے پر انھوں نے بتایا کہ میرے ذمے قرض ہے۔ ہارون الرشید نے حکم دیا کہ ان کا یہ قرض ادا کر دیا جائے۔

وہاں سے نکلے تو ہارون الرشید نے کہا کہ: اے فضل! میرے دل میں کسی اور بزرگ کو دیکھنے کی تمنا ہے جو اس سے بڑا ہو۔ میں نے عرض کیا کہ سفیان بن عُیینہ بھی یہاں پر موجود ہیں۔ خلیفہ

نے فرمایا کہ مجھے ان کے پاس لے چلو۔ ان سے بھی تھوڑی دیر باتیں کرنے کے بعد رخصت ہوئے اور رخصت ہوتے وقت پھر خلیفہ نے مجھے اشارہ کیا کہ ان سے بھی ان کے ذمے قرض کے بارے میں دریافت کروں۔ انھوں نے بھی فرمایا کہ ہاں میرے ذمے یہ قرض ہے۔ چنانچہ اسے بھی خلیفہ نے ادا کرنے کا حکم دیا۔

وہاں سے باہر نکلے تو خلیفہ نے فرمایا کہ میرا مقصد ابھی حاصل نہیں ہوا۔ اس پر مجھے یاد آیا کہ فُضیل بن عیاض بھی اسی جگہ رہتے ہیں۔ چنانچہ میں (فضل بن ربیع) خلیفہ کو ان کے پاس لے گیا۔ حضرت فُضَیل اس وقت تلاوت میں مشغول تھے۔ میں نے دروازے پر دستک دی تو اندر سے آواز آئی کہ کون ہے؟ میں نے جواب دیا کہ امیر المؤمنین ہیں۔ انھوں نے فرمایا: مَالِیْ وَلِاَمِیْرِ الْمُؤْمِنِیْنَ یعنی مجھے امیر المؤمنین سے اور انھیں مجھ سے کیا سروکار؟ کافی ردّ و کد کے بعد تشریف لائے اور دروازے کو کھول کر چراغ گل کر دیا اور مکان کے ایک کونے میں جا کر کھڑے ہو گئے۔ ہارون الرشید نے دروازے سے آپ کو اندھیرے میں ٹٹولنا شروع کیا، یہاں تک کہ اس کا ہاتھ آپ کے ہاتھ کو لگا۔ حضرت فُضَیل نے خلیفہ کے ہاتھ کی نرمی محسوس کر کے فرمایا: افسوس ہے کہ ایسا نرم ہاتھ دوزخ کی آگ میں جلے، کیا ہی اچھا ہو کہ یہ خدا کے عذاب سے بچ جائے۔ ہارون الرشید یہ سن کر روتے روتے بے ہوش ہو گیا۔ جب ہوش آیا تو عرض کیا: اے فُضَیل! مجھے کچھ نصیحت فرمایئے۔ آپ نے فرمایا کہ: اے امیر المؤمنین! تیرا باپ رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا چچا تھا۔ اُس نے درخواست کی بھی کہ یارسولؐ اللہ مجھے قوم کا سردار بنا دیجئے۔ آپؐ نے اس سے فرمایا کہ: قیامت کے روز امارت سرتاپا ندامت ہوگی۔ (لِاَنَّ الْاِمَارَۃَ یَوْمُ الْقِیَامَۃِ النَّدَامَۃُ) ہارون الرشید نے کہا کہ اس سے زیادہ مجھے نصیحت فرمائیں۔ آپ نے فرمایا کہ: جب عمرؒ بن عبدالعزیز کو خلیفہ بنایا گیا تو انھوں نے سالم بن عبدؒ اللہ اور رجا بن حیٰوۃ اور محمد بن کعب قرظی رضی اللہ عنہم کو بلایا اور کہا کہ میں اِن بلاؤں میں مبتلا ہو گیا ہوں، مجھے کوئی تدبیر بتاؤ کہ ان بلاؤں سے خلاص پا سکوں۔ ان میں سے ایک نے کہا کہ اگر تم قیامت کے روز خدا کے عذاب سے خلاصی حاصل کرنا چاہتے ہو تو جان لے کہ مسلمانوں کا یہ ملک تیرا گھرانہ ہے۔ اور اس کے تمام باشندے

تیرے عیال ہیں۔ پس اس کے تمام بوڑھوں کو اپنے باپ کے مثل سمجھو، اس کے جوانوں کو اپنے بھائیوں کے مثل سمجھو اور اس کے لڑکوں کو اپنے بیٹوں کی طرح سمجھو۔ زُرْ اَبَاکَ وَاَکْرِمْ اَخَاکَ وَاَحْسِنْ عَلٰی وَلَدِکَ یعنی اپنے باپ کی زیارت کر (خود اس کے پاس پہنچ) اور اپنے بھائی کا اکرام کر اور اپنے بیٹے کے حق میں نیکی اور بھلائی کر۔ اس کے بعد فضیل نے کہا کہ اے امیر المؤمنین! مجھے اندیشہ ہے کہ کہیں آپ کا یہ خوب صورت چہرہ دوزخ کی آگ میں نہ جھلسا جائے۔ خدا سے ڈرا اور اس کا حق ادا کر۔

اس کے بعد ہارون الرشید نے آپ سے پوچھا کہ کیا آپ کے ذمے کسی کا کوئی قرض بھی ہے؟ آپ نے جواب دیا کہ ہاں خداوند کریم کی فرماں برداری کا قرض میری گردن پر ہے۔ میں ڈرتا ہوں کہ کہیں اس کے سبب نہ پکڑا جاؤں۔ ہارون الرشید نے کہا کہ اے فُضَیل! میری مراد دنیا کا قرض ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اس عزت وعظمت والے کا ہزار بار شکر ہے کہ اُس نے بہت سی نعمتوں سے سرفراز فرمایا۔ میں اس کا کوئی گلہ نہیں رکھتا جسے مخلوق کے سامنے بیان کروں۔ ہارون الرشید نے ایک ہزار دینار کی تھیلی نکال کر آپ کے سامنے رکھ دی اور عرض کیا کہ اس کو اپنے کسی کام میں صَرف کر لیں۔ فُضَیل نے کہا: اے امیر المؤمنین! میری نصیحتوں نے آپ پر کچھ اثر نہیں کیا۔ میں تجھے بلا کے چنگل سے نکال رہا ہوں اور نجات کی طرف بلا رہا ہوں، اور تو مجھے بلا میں گرفتار کرتا ہے، کیا یہ تیرا ظلم اور بے انصافی نہیں ہے؟

ہارون الرشید اور فضل دونوں روتے ہوئے رخصت ہوئے۔ باہر آ کر ہارون الرشید نے کہا: اے فضل بن ربیع! حقیقت میں فُضَیل بادشاہ ہے۔ دنیا کی سب زینتیں اس کی نظر میں کوئی وقعت نہیں رکھتیں۔ اہل دنیا کی تواضع کرنی بھی اس نے اسی واسطے ترک کر رکھی ہے۔

(۹) حضرت ابُو الفیض ذوالنون بن ابراہیم مصری رحمۃ اللہ علیہ:

آپ کا اصل نام ثوبان تھا۔ ثوبی نژاد اور بہترین قوم سے تھے۔ آپ بلا کے (عمومی تصور دینداری کے منافی) راستے پر چلتے اور ملامت کے طریق کو پسند فرماتے تھے۔ اہل مصر میں سے

بہت کم لوگوں نے آپ کو آپ کی زندگی میں پہچانا۔ زیادہ لوگ آپ کا انکار اور آپ پر ملامت اور ظلم و زیادتی کرنے والے تھے۔ پھر جس رات آپ کا انتقال ہوا اسی رات بہت سے (ستر) اشخاص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا۔ آپؐ نے ان لوگوں سے فرمایا کہ آج خدا کا دوست ذوالنون آ رہا ہے میں اس کے استقبال کے لیے آیا ہوں۔ نیز روایتوں میں یہ بھی ہے کہ جب لوگوں نے آپ کا جنازہ اٹھایا تو ہوا کے پرندوں نے پرے باندھ کر جنازے پر سایہ کیا۔ ان واقعات سے لوگ متنبہ ہوئے اور بہت سے پشیمان اور تائب ہوئے۔

آپ خدا کے بندوں پر بہت ہی شفیق و رحیم واقع ہوئے تھے۔ ایک روز اپنے مریدوں کے ہمراہ کشتی میں سوار دریائے نیل میں جا رہے تھے کہ سامنے سے ایک دوسری کشتی آئی جس میں لوگ خوب گا بجا اور خوشیاں منا رہے تھے اور انھوں نے کشتی میں طرح طرح کی شرارتوں سے ایک ہنگامہ برپا کر رکھا تھا۔ مریدوں نے آپ سے عرض کیا: اے شیخ! ان لوگوں کے لیے بد دعا کیجئے کہ اللہ ان سب کو غرق کر دے اور ان کی نحوست سے اپنی مخلوق کو پاک فرمائے۔ حضرت ذوالنونؒ اُسی وقت اٹھ کھڑے ہوئے اور دعا کے لیے ہاتھ اٹھا کر فرمایا: اے میرے خدایا! ان لوگوں کو آپ نے جیسے اس دنیا میں خوشی عطا فرما رکھی ہے اسی طرح آخرت میں بھی ان کو خوش رکھنا۔ مرید آپ کی یہ دُعا سن کر حیران ہوئے۔ اتنے میں وہ کشتی آپ کے بالکل سامنے آ گئی۔ ان لوگوں نے حضرت ذوالنونؒ کو دیکھتے ہی سخت ندامت و پشیمانی کا اظہار کیا۔ اپنے آلاتِ موسیقی توڑ کر دریا میں پھینک دیے اور توبہ کر کے آپ کے ارادت مندوں میں شامل ہو گئے۔ حضرت ذوالنونؒ نے مریدوں سے فرمایا: تم نے دیکھ لیا۔ سب کی مراد پوری ہو گئی۔ تمھاری مراد بھی حاصل ہو گئی اور وہ بھی اپنی مراد کو پہنچ گئے۔

آپ کا یہ عمل حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی متابعت میں تھا۔ لوگ حضورؐ کو طرح طرح کی اذیتیں اور تکلیفیں دیتے، لیکن آپؐ ہمیشہ یہی فرماتے: ''اَللّٰهُمَّ اهْدِ قَوْمِیْ فَاِنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ، یعنی اے میرے خدایا! میری قوم کو راہِ راست دکھا دے، یہ لوگ نادانی میں مبتلا ہیں۔''

رُشد و ہدایت کی راہ کی منازل کے سلسلے میں حضرت ذوالنونؒ بیان فرماتے ہیں کہ: میں

بیت المقدس سے مصر کو واپس آ رہا تھا کہ دُور سے مجھے ایک شخص آتا ہوا دکھائی دیا۔ میں نے دل میں پختہ ارادہ کر لیا کہ میں اس سے ضرور سوال کروں گا۔ جب ہم ایک دوسرے کے قریب پہنچے تو میں نے دیکھا کہ وہ ایک بوڑھی عورت تھی جو پشم (اون) کا جُبّہ (لمبا کرتہ یا کوٹ) پہنے ہوئے ہے اور ہاتھ میں ایک کوزہ اور عصا ہے۔ میں نے اس سے سوال کیا: مِنْ اَیْنَ؟ قَالَتْ مِنَ اللّٰہِ. قُلْتُ اِلٰی اَیْنَ؟ قَالَتْ اِلَی اللّٰہِ، یعنی تو کہاں سے آئی ہے؟ اس نے جواب دیا کہ خدا کی طرف سے۔ میں نے پوچھا کہ جاؤ گی کہاں؟ اس نے جواب دیا کہ خدا کی طرف۔ ذوالنونؒ کہتے ہیں کہ میں نے اپنے پاس ایک دینار اپنی ضرورت کے لیے رکھ چھوڑا تھا میں نے وہ نکال کر اس کی خدمت میں پیش کیا۔ اس نے ایک تھپڑ مجھے رسید کیا اور کہا: اے ذوالنونؒ! خدا کی جو صورت تو نے اپنے دل میں ٹھہرا رکھی ہے وہ تمھاری کم عقلی پر دلالت کرتی ہے۔ میں خدا ہی کے لیے کام کرتی ہوں اور اس کے سوا کسی سے کوئی چیز طلب نہیں کرتی۔ جس طرح سے اس کی بندگی میں کسی کو شریک نہیں کرتی اسی طرح سے اس کے سوا اور کسی سے کچھ نہیں لیتی۔ اور اتنی بات کہہ کر بڑھیا چلی گئی۔

اس بڑھیا نے جو یہ کہا کہ میں کام خدا ہی کے لیے کرتی ہوں یہ اس کے حق تعالیٰ سے صحیح تعلق اور سچی محبت کی دلیل تھی۔ ایک تو وہ لوگ جو خدا کی بندگی دوسرے جہان میں ثواب حاصل کرنے اور عذاب سے خلاصی کے لیے کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ وہ یہ کام خدا کے لیے کر رہے ہیں، اور دوسرے وہ ہیں جو اُس جہان کے ثواب وعذاب اور اِس دنیا کی ریا وغیبت وغیرہ سے بالکل علیحدہ ہو جاتے ہیں۔ وہ خدا کے ساتھ معاملہ کرنے میں ان باتوں کا کوئی خیال نہیں کرتے۔ وہ جو کام بھی کرتے ہیں صرف خدا کے فرمان کی تعظیم بجالانے کے لیے کرتے ہیں۔ وہ سمجھ لیتے ہیں کہ جب وہ اس کی مخلوق اور اس کے بندے ہیں تو ان کا کام اس کے فرمان کی تعظیم اور تعمیل کے سوا کچھ اور نہیں ہو سکتا، اور خالق و مالک کو اختیار ہے کہ مخلوق کے ساتھ جو اور جیسا معاملہ چاہے فرمائے۔ یہ بڑھیا بھی انہی بلند مرتبہ لوگوں میں سے ایک تھی۔

لیکن خوب جان لو کہ مخلوق کے بندگی واطاعت کی راہ اختیار کرنے سے خداوند تعالیٰ کو نہ تو

کوئی فائدہ پہنچتا ہے اور نہ ہی اس کی نافرمانی سے اس کا کوئی نقصان ہوتا ہے۔ اگر روئے زمین کے تمام انسان حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسے صدق وصفا کے حامل بن جائیں تو اس کا فائدہ انہی کو حاصل ہوگا خداوند تعالیٰ کو اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ اور اگر سارا جہان فرعون جیسا سرکش اور نافرمان ہو جائے تو اس کا نقصان بھی انہی کو ہوگا خداوند تعالیٰ کو اس سے کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اِنْ اَحْسَنْتُمْ اَحْسَنْتُمْ لِاَنْفُسِكُمْ وَاِنْ اَسَاْتُمْ فَلَهَا (۷:۱۷) یعنی اگر تم کوئی نیکی کرو گے تو اس نیکی کا فائدہ تمہیں حاصل ہوگا اور اگر برائی کرو گے تو اس کا وبال بھی تمہاری ہی جان کو بھگتنا پڑے گا۔ دوسری جگہ فرمایا: وَمَنْ جَاهَدَ فَاِنَّمَا يُجَاهِدُ لِنَفْسِهٖ اِنَّ اللّٰهَ لَغَنِیٌّ عَنِ الْعَالَمِيْنَ (۶:۲۹) یعنی جو شخص بھی خداوند تعالیٰ کی فرمانبرداری میں جان لڑاتا ہے وہ اپنے ہی لیے ایسا کرتا ہے، اللہ تعالیٰ کو اہلِ جہان کی کوئی حاجت نہیں ہے۔

حضرت ذوالنون فرماتے ہیں: اَلْعَارِفُ كُلَّ يَوْمٍ اَخْشَعُ لِاَنَّهٗ فِیْ كُلِّ سَاعَةٍ مِنَ الرَّبِّ اَقْرَبُ، یعنی عارف روز بروز خدا کے سامنے زیادہ سے زیادہ جھکتا چلا جاتا ہے اس لیے کہ وہ ہر گھڑی خدا سے قریب سے قریب تر ہوتا چلا جاتا ہے۔ معرفت سے اس کے اندر عجز وخشوع اور عجز وخشوع سے تقرب اور تقرب سے مزید معرفت پیدا ہوتی ہے اور اس طرح وہ آگے ہی آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ اگر کوئی شخص عجز وخشوع اور خوفِ الٰہی کے بغیر معرفت کا دعویٰ کرتا ہے تو وہ جاہل اور جھوٹا ہے، عارف نہیں ہے۔ عارف حق تعالیٰ کی بے غرض اور بے آمیز بندگی کی راہ کے سوا اور کسی راہ پر نہیں چل سکتا۔

آپ کا ایک اور ارشاد ہے کہ: اَلصِّدْقُ سَيْفُ اللّٰهِ فِیْ اَرْضِهٖ، مَا وُضِعَ عَلٰى شَیْءٍ اِلَّا قَطَعَهٗ، یعنی زمین میں سچائی خدا کی تلوار ہے۔ جس چیز پر یہ پڑتی ہے اسے کاٹ کر رکھ دیتی ہے۔ گویا سچائی وہ چیز ہے جس کا مقابلہ دنیا کی کوئی طاقت نہیں کر سکتی، اور دنیا کی سب سے بڑی سچائی خدا کی توحید اور اس کی معرفت ہے۔ جب یہ آدمی کے دل میں داخل ہو جاتی ہے تو دوسری ہر محبت، دوسرے ہر تعلق اور ساری مخلوق کی قدر ومنزلت کو کاٹ کر رکھ دیتی ہے۔ اور ایسا شخص دنیا جہان سے بے پرواہ ہو کر خدا کی بندگی کی راہ پر چلتا ہے۔

(۱۰) حضرت ابواسحاق ابراہیم بن ادھم منصور رحمۃ اللہ علیہ:

آپ اپنے زمانے کے لوگوں کے سردار اور اپنے وقت میں یگانہ بزرگ تھے۔ ابتداءً آپ بلخ کے بادشاہ تھے۔ ایک روز شکار کے لیے نکلے۔ گھوڑا ایک ہرن کے پیچھے ڈال دیا اور لشکر کے لوگ پیچھے رہ گئے۔ ہرن بے بسی کے عالم میں سرپٹ آگے بھاگا جا رہا تھا اور آپ اس کے شکار کے درپے اس کے پیچھے تھے۔ اس حالت میں آپ نے محسوس کیا گویا کہ ہرن ان سے کہہ رہا ہے: اَلِهٰذَا خُلِقْتَ اَمْ بِهٰذَا اُمِرْتَ؟ یعنی کیا تیرے پیدا کرنے والے نے تجھے اسی کام کے لیے پیدا کیا ہے یا اس نے تجھے اس کام کا حکم دیا ہے؟ اس بات نے آپ کی کایا پلٹ دی اور توبہ کی طرف متوجہ ہوئے۔ دنیوی جاہ و جلال سے دل برداشتہ ہو کر زہد و اتقاء کی زندگی اختیار کر لی۔ اور توبہ کے وقت سے پھر ساری عمر اپنے ہاتھ کی کمائی کے سوا کچھ نہیں کھایا۔

حضرت امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد اور حضرت فُضَیل بن عیاض اور سُفیان ثوری رحمہما اللہ کے صحبت یافتہ تھے۔ حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کے بارے میں فرمایا: مُفَاتِیْحُ الْعُلُوْمِ اِبْرَاهِیْم، یعنی ابراہیم تو علوم طریقت کی چابی ہیں۔

آپ کا ارشاد ہے: اِتَّخِذِ اللّٰهَ صَاحِباً وَ ذَرِ النَّاسَ جَانِبًا، یعنی اللہ تعالیٰ کی دوستی اور صحبت اختیار کر اور مخلوقات کو ایک طرف اٹھا کر رکھ دے۔ اور ظاہر ہے کہ مخلوقات میں آدمی کا اپنا نفس بھی شامل ہے۔ جب تک اسے بھی اٹھا کر ایک طرف نہ رکھ دے خدا کی دوستی اور اس کی مصاحبت کا حق ادا نہیں ہوگا اور نہ اس ارشاد کا منشاء پورا ہوگا۔ حضرت ابراہیم ادھم کا یہ قول گویا وَمَا اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ حُنَفَآءَ (۵:۹۸) کی تفسیر ہے۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ: ''لوگوں کو حکم اس بات کا دیا گیا ہے کہ ہر طرف سے کٹ کر مخلصانہ طریق پر اللہ کی بندگی کی راہ اختیار کریں۔'' جو شخص مخلوق میں سے کسی چیز کے ساتھ دل لگاتا ہے وہ خدا سے جدا ہو جاتا ہے۔ اور جو اپنے نفس اور باقی مخلوق سے تعلق منقطع رکھتا ہے وہ واصلِ حق ہوتا ہے۔ جان لو کہ انسان کے لیے سب سے مشکل کام اپنے آپ سے منہ موڑنا ہے۔ جب تم نے

اپنے آپ سے منہ موڑ لیا تو سارے جہان سے منہ موڑ لیا۔ جو شخص باقی مخلوقات سے تو منہ پھیر لے لیکن اپنی طرف متوجہ رہے وہ ظالم ہے کہ دوسری سب مخلوق کو تو اس نے حق کے تابع کر دیا، لیکن اپنے آپ کو اس سے بالاتر رکھا۔

آپ بیان کرتے ہیں کہ (اپنے مجاہدات کے سلسلے میں) جب میں بیابان میں پہنچا تو ایک بوڑھا مرد نمودار ہوا۔ اس نے کہا: اے ابراہیم! تو جانتا ہے کہ یہ کون سی بابرکت جگہ ہے جہاں تو بغیر خرچ کے گزر کر رہا ہے؟ میں نے فوراً تاڑ لیا کہ یہ شیطان ہے جو غیر اللہ کی طرف میری توجہ کرنا چاہتا ہے۔ چاندی کے وہ چار سکے میری جیب میں تھے جو اس زنبیل کی قیمت کے تھے جو میں نے کوفہ میں بیچی تھی۔ میں نے انھیں بھی نکال کر پھینک دیا۔ اس کے بعد میں چار سال اس جنگل میں رہا۔ لیکن میرا رب مجھے وقت پر بلا تکلف کھانا عطا فرماتا رہا۔ اس وقت سے میرا دل غیر سے بالکل خالی ہو گیا۔

(۱۱) حضرت بشر بن حافی رحمۃ اللہ علیہ:

آپ علمِ اصول و فروع کے عالم، معرفت کے تخت اور اہل معاملت کے تاج تھے۔ اپنے خالو حضرت بوعلی حشرمؒ کے مرید اور حضرت فُضَیل بن عیاض کے صحبت یافتہ تھے۔ آپ کی توبہ کی ابتداء اس طرح سے ہوئی کہ ایک روز جوانی کی مستی میں اٹھکیلیاں کرتے ہوئے جا رہے تھے کہ زمین پر ایک کاغذ پڑا ہوا پایا۔ اٹھا کر دیکھا تو اس پر 'بسم اللہ الرحمٰن الرحیم' لکھا ہوا تھا۔ آپ تعظیم کے ساتھ اُسے لے گئے اور معطر کر کے پاک جگہ پر رکھ دیا۔ رات کو خواب میں دیکھا کہ اللہ عزّ وجل آپ سے فرما رہا ہے: یَا بِشْرُ طَیَّبْتَ اِسْمِیْ فَبِعَزَّتِیْ لَاُطَیِّبَنَّ اِسْمَکَ فِی الدُّنْیَا وَالْاٰخِرَۃِ، یعنی اے بشر! تو نے میرے نام کی تعظیم کی اور اسے معطر کیا، مجھے اپنی عزت کی قسم میں تیرے نام کی خوشبو دنیا اور آخرت دونوں میں پھیلا دوں گا۔ آپ نے اٹھ کر نافرمانی و آوارگی کی راہ سے توبہ کی اور اخلاص کے ساتھ بندگی اور تقویٰ کی راہ اختیار کی۔

آپ کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ خداوند تعالیٰ کی تعظیم اور مشاہدۂ حق میں شدتِ غلبہ (حق

تعالیٰ کی موجودگی کے شدت احساس) کی وجہ سے پاؤں میں جوتا یا کوئی دوسری چیز نہیں پہنتے تھے۔ کسی نے اس کا سبب پوچھا تو فرمایا: زمین خدا کا فرش ہے۔ میں اس پر جوتا پہن کر کیسے چلوں، اور میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ اس کے فرش اور میرے پاؤں کے درمیان کوئی چیز حائل ہو۔

آپ کا مقولہ ہے: ''مَنْ اَرَادَ اَنْ یَکُوْنَ عَزِیْزًا فِی الدُّنْیَا وَشَرِیْفًا فِی الْاٰخِرَۃِ فَلْیَجْتَنِبْ ثَلَاثًا: لَا یَسْئَلُ اَحَدًا حَاجَۃً وَلَا یَذْکُرُ اَحَدًا بِسُوْءٍ وَلَا یُجِیْبُ اَحَدًا اِلٰی طَعَامِہٖ. یعنی جو شخص یہ چاہتا ہو کہ دنیا میں عزت اور غلبہ سے رہے اور آخرت میں بھی اسے شرف حاصل ہو اسے تین باتوں سے اجتناب کرنا چاہیے۔ ایک یہ کہ اپنی کسی حاجت کے لیے کسی کے آگے ہاتھ نہ پھیلائے۔ دوسرے یہ کہ کسی کا برائی کے ساتھ ذکر نہ کرے اور تیسرے یہ کہ کسی کی کھانے کی دعوت قبول نہ کرے۔''[1]

مخلوق کے سامنے ہاتھ پھیلانے کے بارے میں فرمایا: اَنَّ اسْتِعَانَۃَ الْمَخْلُوْقِ اِلَی الْمَخْلُوْقِ کَاسْتِعَانَۃِ الْمَسْجُوْنِ اِلَی الْمَسْجُوْنِ، یعنی مخلوق کا مخلوق سے مدد مانگنا اور حاجت روائی کے لیے اس کے سامنے ہاتھ پھیلانا ایسا ہی ہے جیسے ایک قیدی دوسرے قیدی کے سامنے مدد کے لیے ہاتھ پھیلائے جو شخص قاضی الحاجات سے تعلق رکھتا ہو وہ کبھی ایسی حرکت نہیں کر سکتا۔

---

[1] بعض حضرات نے اس قول پر یہ اعتراض کیا ہے کہ یہ سنت کے خلاف ہے۔ کیونکہ دعوت قبول کرنا سنت ہے۔ لیکن کسی دعوت کے سنت ہونے کے معنی یہ ہیں کہ جہاں اور جس کے ہاں سے بھی دعوت آئے اسے قبول کرنا ضروری ہے اور اسے قبول کرنے سے اجتناب ہر حال میں خلاف سنت ہے؟ ظاہر ہے کہ اس سوال کا جواب ہاں میں نہیں دیا جا سکتا اور نہ یہ قابل تصور ہے کہ حضرت بشرؒ جیسا عالم و متقی بزرگ سنت کے خلاف کوئی بات زبان سے نکالے گا۔ یہاں ایک تو یہ بات پیش نظر رہنی چاہیے کہ حضرت بشر کے اس قول کے مخاطب عامۃ المسلمین نہیں ہیں، ان کے مخاطب مرشدانِ طریقت اور اہل زہد و تقویٰ ہیں۔ اور دوسرے اس قول سے مقصود قبولیت دعوت کی مطلق اور کلی ممانعت نہیں ہے۔ منشا یہ ہے کہ اس بارے میں پوری پوری احتیاط برتی جائے۔ ابھی اوپر حضرت فُضیل بن عیاضؒ کے حالات میں آپ نے دیکھا کہ محض اس بات سے کہ ہارون الرشید جیسے بادشاہ کی اپنی خواہش پر بھی جب عبدالرزاق صنعانی اور سفیان بن عُیَینہؒ نے اپنے ذمہ قرضوں کی تفصیل بتائی تو ہارون الرشید کی نظر میں ان بزرگوں کی وقعت گر گئی۔ ایسے ہی واقعات کو نگاہ میں رکھتے ہوئے حضرت بشر نے اہل طریقت کو یہ نصیحت کرنے کی ضرورت محسوس کی کہ اگر وہ دین اور اہل دین کے وقار کو اہل زمانہ کی نظروں میں محفوظ رکھنا چاہتے ہیں تو کسی کی کھانے کی دعوت قبول نہ کریں۔ یہ ایسی ہی بات ہے جیسے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے شروع شروع میں لوگوں کو زیارتِ قبور سے روک دیا تھا اور حضرت عمرؓ نے قحط کے زمانے میں چوری پر قطع ید کی سزا دینا بند کر دیا تھا۔ ظاہر ہے کہ اگر علمبردارانِ شریعت و طریقت پانڈوں اور پروہتوں کی مانند اہل دنیا کے ہاں دعوتیں کھاتے پھریں تو ان کے عزت و وقار لازماً متاثر ہوں گے۔

(۱۲) حضرت ابو یزید طیفور بن عیسیٰ بُسطامی رحمۃ اللہ علیہ:

آپ تصوف کے دس مشہور ائمہ میں سے ایک ہیں۔ حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کے بارے میں فرمایا: اَبُوْ یَزِیْد مِنَّا بِمَنْزِلَةِ جِبْرِیْلَ مِنَ الْمَلَائِکَةِ، یعنی ہمارے درمیان ابو یزید کا وہی مقام ہے جو فرشتوں کے درمیان جبریل علیہ السلام کا ہے۔ آپ کے دادا مجوسی تھے۔ لیکن آپ کے والدِ بزرگوار بُسطام کے بزرگوں میں سے تھے۔ اور انھوں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بڑے مرتبہ کی روایات بیان کی ہیں۔ حضرت ابو یزید نے بندگی کی راہ کا آغاز ریاضت اور مجاہدہ سے کیا۔ فرماتے ہیں: ''عَمِلْتُ فِی الْمُجَاهِدَةِ ثَلٰثِیْنَ سَنَةً، فَمَا وَجَدْتُ شَیْئاً اَشَدَّ عَلَیَّ مِنَ الْعِلْمِ وَمُتَابَعَتِهٖ وَلَوْلَا اخْتِلَافُ الْعُلَمَاءِ لَبَقِیْتُ وَاخْتِلَافُ الْعُلَمَاءِ رَحْمَةٌ اِلَّا فِیْ تَجْرِیْدِ التَّوْحِیْدِ. یعنی میں نے تیس سال مجاہدہ کیا اور اس مجاہدہ میں مجھے علم اور اس کی ٹھیک ٹھیک پیروی کرنے سے زیادہ مشکل کوئی چیز معلوم نہیں ہوئی۔ اور اگر علماء کے درمیان اختلاف نہ ہوتا تو یقیناً میں اسی مقام پر پڑا رہتا۔ لیکن علماء کا اختلاف نہ ہوتا تو یقیناً میں اسی مقام پر پڑا رہتا۔ لیکن علماء کا اختلاف خدا کی بڑی رحمت ہے (کہ اسی سے علم اور عمل میں ترقی اور تعمق کی راہیں کھلتی ہیں)، البتہ توحید کے سلسلے میں اختلاف اور موشگافیاں رحمت نہیں ہیں[1]۔''

حق تعالیٰ کی بالکل بے لوث و بے غرض بندگی کے سلسلے میں حضرت ابو یزید رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اَلْجَنَّةُ لَا خَطَرَ لَهَا عِنْدَ اَهْلِ الْمَحَبَّةِ وَاَهْلُ الْمَحَبَّةِ مَحْجُوْبُوْنَ بِمَحَبَّتِهِمْ. یعنی اہل محبت کے نزدیک جنت کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ کیونکہ اہل محبت کو تو ان کی محبت گھیرے ہوئے ہوتی ہے۔ نیز یہ کہ اللہ سے سچی محبت اور حقیقی تعلق کا لازمی تقاضا غیر اللہ یعنی مخلوق سے بے پرواہ ہو جانا ہے۔ اور جنت بھی مخلوق ہی میں سے ہے۔ اہلِ محبت کی ساری خوشی محبوب کی تعظیم اور اس کے فرمان کی تعمیل ہے۔ ان کے لیے ساری خوشیوں اور لذتوں کا

---

[1] علم کی متابعت یعنی شریعت الٰہی کے مطابق زندگی بسر کرنے کی وضاحت فرماتے ہوئے صاحب کشف المحجوب اس امر کی طرف خصوصی توجہ دلاتے ہیں کہ آدمی کو اس بارے میں ایسی روش اختیار کرنی چاہیے کہ اگر وہ بلند احوال اور بزرگ مقامات سے رہ بھی جائے اور ان احوال و مقامات سے کسی وقت گر بھی پڑے تو شریعت کے میدان ہی میں گرے۔ اس سے باہر نہ جا گرے تا کہ کسی حال میں بھی اس کا معاملہ (خدا سے اس کا تعلق) شریعت سے جدا نہ ہو۔

اوّل و آخر یہی ہے۔

(۱۳) حضرت ابُوعبداللہ حارث بن اسد محاسبی رحمۃ اللہ علیہ:

آپ اصول و فروع کے عالم اور اپنے وقت میں اہلِ علم کا مرجع تھے۔ بغداد میں آپ کی حیثیت شیخ المشائخ کی تھی۔ آپ کی بہت سی تصنیفات ہیں۔ تصوف پر بھی آپ نے 'رغائب' کے نام سے کتاب لکھی۔

آپ کا ارشاد ہے: ''اَلْعِلْمُ بِحَرَکَاتِ الْجَوَارِحِ، یعنی وہ علم جو قلب و ذہن کی کاوش سے غیر معلوم امور کے مطالعہ کے ذریعے حاصل کیا جائے، اس عمل سے بہتر ہے جو صرف جسمانی اعضاء کی حرکات پر مشتمل ہو۔'' ظاہر بات ہے کہ اگر جسمانی اعضاء کی حرکات ومجاھدہ ہی خدا تک پہنچنے کے لیے کافی ہوتے تو عیسائی راہب اور ہندو جوگی جو اس سلسلے میں انتہا کو پہنچے ہوئے ہیں وہ ضرور خدا کو پا لیتے۔ نیز علم تو بعض صورتوں میں عمل کے بغیر نفع دے سکتا ہے جیسے کوئی شخص ایمان لائے اور عمل کا موقع پائے بغیر مر جائے تو وہ نجات پا جائے گا۔ لیکن محض بغیر علم کے کوئی نفع نہیں دے سکتا۔ محاسبی رحمۃ اللہ علیہ کی یہ بات وہی ہے جو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس ارشاد میں بیان فرمائی ہے کہ: ''تَفَکُّرُ السَّاعَۃِ خَیْرٌ مِّنْ عِبَادَۃِ سِتِّیْنَ سَنَۃً، یعنی ایک گھڑی کے لیے خدا کی راہ میں غور و فکر ساٹھ سال کی عبادت (نفل نماز) سے بہتر ہے۔'' حضرت محاسبی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک درویش سے فرمایا: کُنْ لِلّٰہِ وَاِلَّا فَلَاتَکُنْ، یعنی یا تو خدا کا ہو جا اور اگر ایسا نہیں کرتا تو مر جا کہ اپنے گناہ و عذاب میں اضافہ تو نہیں کرے گا۔

(۱۴) حضرت ابوسلیمان داؤد ابنِ طائی رحمۃ اللہ علیہ:

آپ حضرت امام ابوحنیفہؒ کے شاگرد، حضرت حبیب رائیؒ کے مرید اور حضرت فُضَیلؒ اور ابراہیم ادہمؒ کے ہم عصر تھے۔ تمام علوم میں آپ نمایاں مقام رکھتے تھے۔ فقہاء کے استاد اور اہل تصوف کے سرداروں اور مشائخ میں سے تھے۔ اپنے استاد امام ابوحنیفہؒ کی طرح مرتبہ و ریاست سے اجتناب و رُوگردانی کی روش پر گامزن تھے۔ چنانچہ حکایات میں آیا ہے کہ آپ محمد بن حسن

رحمۃ اللہ علیہ سے بہت محبت کرتے تھے اور ان سے بہت میل ملاقات رکھتے تھے، لیکن قاضی ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ کو جو انہی کے مرتبہ کے عالم وفقیہ تھے اپنے پاس نہیں پھٹکنے دیتے تھے۔ کسی شخص نے ایک مرتبہ آپ سے پوچھا کہ محمد بن حسن اور ابو یوسف دونوں علم میں ہم مرتبہ ہیں لیکن آپ محمد بن حسنؒ کو تو بہت دوست رکھتے ہیں اور ابو یوسف کو اپنے پاس پھٹکنے نہیں دیتے۔ حضرت داؤد بن طائیؒ نے فرمایا: محمد بن حسنؒ نے دنیا کا مال اور نعمت دے کر علم حاصل کیا ہے اور اس کا علم دین کی عزت کا اور دنیا کی ذلت کا سبب ہے۔ اور اس کے برعکس ابو یوسف نے فقر و ذلت کی حالت میں علم حاصل کیا اور پھر اس علم کو اپنی عزت اور مرتبے کا ذریعہ بنایا وہ محمد بن حسنؒ کی مانند کیسے ہو سکتا ہے۔

حضرت معروف کرخی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے کوئی شخص نہیں دیکھا جس کی نظر میں دنیا اس سے بڑھ کر حقیر تر ہو، جس قدر داؤد طائی رحمۃ اللہ علیہ کی نظر میں یہ حقیر تھی۔ آپ دنیا اور اہل دنیا کو قطعاً کوئی وزن نہیں دیتے تھے اور فقراء کے سامنے خواہ وہ کتنے ہی بدحال ہوں بچھے جاتے تھے۔

آپ نے اپنے ایک مرید کو نصیحت فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا: اِنْ اَرَدْتَ السَّلَامَۃَ سَلِّمْ عَنِ الدُّنْیَا وَاِنْ اَرَدْتَ الْکَرَامَۃَ کَبِّرْ عَلَی الْاٰخِرَۃِ. یعنی اگر تو سلامتی کا خواستگار ہے تو دنیا سے اپنے آپ کو محفوظ رکھ۔ (یہ تجھ پر قابو نہ پا لے)۔ اور اگر بزرگی و کرامت کا طالب ہے تو آخرت کے انعام و اکرام کی خواہش کے گلے پر بھی چھری پھیر دے۔ فرمان خداوندی کی تعظیم اور اس کی وفا و رضا اور تعمیل ارشاد کے سوا کسی چیز کی طلب نہ رکھ۔

(۱۵) حضرت ابوالحسن سرّی بن مغلس سقطی رحمۃ اللہ علیہ:

آپؒ جنید رحمۃ اللہ علیہ کے خالو، کرخی رحمۃ اللہ علیہ کے مرید، اور حبیب رحمۃ اللہ علیہ کی زیارت اور صحبت سے بھی فیض یافتہ تھے۔ تمام علوم کے عالم تھے اور عراق کے کئی مشائخ آپ کے مرید تھے۔ ابتداءً آپ بغداد کے بازار میں کباڑی کی دکان کرتے تھے۔ ایک روز حبیب راعی

رحمۃ اللہ کا آپ کی دکان کے سامنے سے گزر ہوا۔ انھوں نے کچھ روٹیوں کے ٹکڑے انھیں درویشوں کے لیے دیے۔ جس کے جواب میں حبیب راعی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: خَیرَکَ اللّٰہُ یعنی اللہ تعالیٰ تمھیں خیر عطا فرمائے۔ اس کے بعد سے ان کا دل دنیا اور اس کے مال کی طرف سے اچاٹ ہونا شروع ہو گیا۔ پھر جب بغداد کا بازار جلا تو لوگوں نے آپ سے کہا کہ تیری دکان بھی جل گئی۔ آپ نے جواب دیا: چلو، اس کی قید سے آزاد ہوا۔ لیکن لوگوں کی یہ اطلاع اس بنا پر تھی کہ آس پاس کی سب دکانیں جل گئی تھیں۔ آگ بجھنے کے بعد جب موقع پر گئے تو دیکھا کہ چاروں طرف سب دکانیں جل گئیں تھیں لیکن اُن کی دکان بالکل محفوظ تھی۔ آپ نے جب یہ حال دیکھا تو دکان کا سارا مال خدا کی راہ میں دے دیا۔ اور تصوف کا راستہ اختیار فرما کر اپنے آپ کو خدا کے کام کے لیے وقف کر دیا۔

آپ کے خدا سے تعلق کا یہ عالم تھا کہ آپ کی دعا یہ ہوتی تھی: اَللّٰھُمَّ مَھْمَا عَذَّبْتَنِیْ بِہٖ مِنْ شَیْئٍ فَلَا تُعَذِّبْنِیْ بِذِلِّ الْحِجَابِ. یعنی اے میرے مولا! اگر کبھی تو مجھے عذاب دینے کا فیصلہ فرمائے ہی تو مجھے اپنے حضور کی دوری کی ذلت کا عذاب نہ دیجیو'' کیونکہ دوزخ میں بھی سخت ترین عذاب اللہ تعالیٰ سے شرفِ تکلم اور اس کے دیدار سے محرومی ہو گا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''لَایُکَلِّمُھُمُ اللّٰہُ وَلَا یَنْظُرُ اِلَیْھِمْ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ (۳:۷۷) یعنی اللہ قیامت کے روز نہ ان سے بات کرے گا اور نہ ان کی طرف دیکھے گا۔'' اور ظاہر ہے کہ عذاب میں کسی تخفیف یا اس سے رہائی انہیں دو صورتوں میں سے کسی صورت میں ممکن ہو سکتی ہے کہ عذاب میں گرفتار لوگوں کے حال پر نظر کرم فرمائے یا ان سے بات کرے۔ اور ان میں سے کوئی موقع بھی انھیں حاصل نہیں ہو گا۔ اَللّٰھُمَّ نَعُوْذُبِکَ مِنْ ھٰذَا.

(۱۶) حضرت ابو علی شفیق بن ابراہیم اَزْدی رحمۃ اللہ علیہ:

آپ ابراہیم ادھم رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد اور مرید تھے۔ آپ شریعت، طریقت اور معاملت سب علوم کے عالم تھے۔ عزیمت (بلا) کی راہ پر گامزن تھے اور زہد و تقویٰ میں بہت بلند مقام

رکھتے تھے۔ آپ کی تصانیف بہت ہیں۔

آپؒ کی توبہ کی ابتداء اس طرح ہوئی کہ:

ایک مرتبہ بلخ میں سخت قحط پڑا، یہاں تک کہ انسانوں نے انسانوں کو کھانا شروع کر دیا۔ سب لوگ سخت غمزدہ اور متوحش تھے۔ لیکن ایک غلام بازار میں بہت خوش اور ہنستا پھر رہا تھا۔ لوگوں نے اسے ملامت کرتے ہوئے کہا کہ تمھیں شرم نہیں آتی کہ ہر طرف لوگ فاقوں مر رہے ہیں اور سخت رنجیدہ ہیں اور تو خوشی مناتا اور ہنستا پھر رہا ہے۔ غلام نے جواب دیا کہ مجھے کوئی غم نہیں، اس لیے کہ میرا مالک ایک پورے گاؤں کا بلاشرکتِ غیرے مالک ہے، اس چیز نے میرے دل کو ہر قسم کی پریشانی سے آزاد کر دیا ہے۔ اور میرے سب غم مٹا دیے ہیں۔

غلام کے اس جواب کو سن کر شفیق کی گویا آنکھیں کھل گئیں اور تمام حجاب دُور ہو گئے۔ آپ سخت شرمندگی کے احساس کے ساتھ خدا کی طرف متوجہ ہوئے اور عرض کیا: اے بارِ خدایا! یہ غلام اس شخص کا ہے جس کی ملک میں صرف ایک گاؤں ہے اور یہ اتنی خوشی منا رہا ہے اور ہم تجھ مالک الملک کو اپنا پروردگار کہتے ہیں اور اپنی روزی کے لیے اس درجہ فکر مند ہیں جس کا کوئی شمار نہیں۔ بس یہ خیال آتے ہی آپ نے دنیا کے مشاغل سے منہ موڑ لیا اور حق کے راستہ کو طے کرنا شروع کر دیا۔ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد سے میں پھر کبھی روزی کے لیے غمزدہ نہیں ہوا۔ اور فرمایا کرتے کہ میں تو اس غلام کا شاگرد ہوں۔ میں نے جو کچھ پایا ہے اسی سے پایا ہے۔

اسی سلسلے میں ایک دوسرا واقعہ جو آپ خود بیان فرماتے ہیں وہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ ایک بوڑھا آپ کے پاس آیا اور کہنے لگا: اے شیخ! میں گناہ بہت رکھتا ہوں اور اب توبہ کرنا چاہتا ہوں۔ آپ نے اس سے کہا: بابا! بہت دیر سے آئے ہو۔ اس بوڑھے نے آپ کو جواب دیا: نہیں، میں بہت جلد آ گیا ہوں۔ آپ نے پوچھا کہ جلد کیسے آ گئے ہو؟ بوڑھے نے جواب دیا کہ جو موت سے پہلے آ جائے وہ جلدی آنے والا ہے۔ اگرچہ کتنا ہی دیر لگا کر آیا ہو۔

آپ کا ایک ارشاد ہے:

جَعَلَ اللّٰهُ اَهْلَ طَاعَةِ اَحْيَاءً فِيْ مَمَاتِهِمْ وَاَهْلَ الْمَعَاصِيْ اَمْوَاتًا فِيْ حَيٰوتِهِمْ.

''اللہ تعالیٰ نے اہل طاعت (اپنے فرماں برداروں) کی موت کو بھی زندگی بنا دیا ہے اور اپنے نافرمانوں کو اُن کی زندگی میں بھی مردے شمار فرمایا ہے۔''

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ط بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ۝ (۱۶۹:۳) یعنی جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہوئے انہیں مردہ نہ سمجھو، وہ تو حقیقت میں زندہ ہیں، اپنے رب کے پاس رزق پا رہے ہیں۔'' اور اپنے نافرمانوں کے بارے میں فرمایا: ''فَاِنَّكَ لَا تُسْمِعُ الْمَوْتٰى وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ اِذَا وَلَّوْا مُدْبِرِيْنَ (۵۲:۳۰)۔ یعنی تم مُردوں کو نہیں سنا سکتے اور نہ بہروں کو اپنی آواز سنا سکتے ہو، خصوصاً جبکہ وہ پیٹھ موڑے چلے جا رہے ہوں۔''

(۱۷) حضرت ابوسلیمان عبدالرحمٰن عطیہ درانی رحمۃ اللہ علیہ:

آپ اپنے وقت کے عالم اور ریاضتوں اور مجاہدوں میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ جوارح کی حفاظت، دلوں کی نگہبانی اور معاملات میں آپ کا کلام بہت لطافت والا ہے۔ آپ کا ارشاد ہے کہ جب امید خوف پر غالب آ جاتی ہے تو انسان بے خوف ہو جاتا ہے اور اپنے نفس کی حفاظت ترک کر دیتا ہے، جس سے اس کا 'حال' (حق تعالیٰ سے تعلق اور معاملہ) خراب ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس اگر خوف امید پر غالب آ جائے تو توحید میں نقص پیدا ہو جاتا ہے۔ کیونکہ خوف کا غلبہ خداوند تعالیٰ کی رحمت و بخشش سے ناامیدی سے پیدا ہوتا ہے۔ اور خدا کی رحمت و بخشش سے ناامیدی خدا کے شرک سے ہوتی ہے۔ کیونکہ ناامیدی خداوند تعالیٰ کے بارے میں اس تصور سے پیدا ہوتی ہے کہ وہ قادر مطلق اور مختار کل نہیں بلکہ کوئی اور بھی اس کی راہ میں حائل ہو سکتا ہے۔ اور یہ تصور توحید کو باطل کر دیتا ہے۔ اس لیے امید کی درستی اور خوف کی صحت دونوں ضروری ہیں۔ جب خوف اور امید دونوں برابر ہو جائیں تو توحید اور حال دونوں محفوظ ہوں گے۔ توحید کی حفاظت سے انسان ایمان دار ہوتا ہے اور حال کی حفاظت سے مطیع فرمان بنتا ہے۔ بس امید اور خوف کے توازن سے بندہ صحیح مومن اور بندۂ حق بنے گا۔ یہ دراصل اس حدیث ہی کی تشریح ہے، جس میں حضور نبی کریم

صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ صحیح ایمانی حالت بَیْنَ الْخَوْفِ وَالرَّجَاء [1] ہے۔ یعنی یہ کہ آدمی خداوند تعالیٰ کی رحمت سے پر امید بھی رہے اور خدا کی گرفت اور اس کے عذاب سے بے خوف بھی نہ ہو۔ احمد بن ابوالجوہر رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ میں رات کی تنہائی میں نماز پڑھ رہا تھا اور مجھے اس بات کی بہت خوشی تھی کہ مجھے خدا کے سوا کوئی نہیں دیکھ رہا ہے۔ صبح میں نے حضرت ابوسلیمان درّانی سے تذکرہ کیا، تو انھوں نے فرمایا کہ تو ایک کمزور آدمی ہے، ابھی تو مخلوق سے آزاد نہیں ہوا۔ اسی لیے خلوت میں تیری اور حالت ہوتی ہے اور جلوت میں اور۔ بندۂ حق کے واسطے یہ لائق نہیں ہے کہ اپنے مقصود کے سوا کسی اور طرف توجہ کرے۔

(۱۸) حضرت ابوالمحفوظ معروف بن فیروز کرخی رحمۃ اللہ علیہ:

آپ قدیم مشائخ سادات میں سے ہیں اور رجوع الی اللہ، پرہیز گاری، اور جوانمردی میں مشہور ہیں۔ ابتداء عمر میں بالکل بے دین آدمی تھے۔ علی بن موسیٰ رضا رحمۃ اللہ علیہ کے ہاتھ پر توبہ کی اور ایسے سعادت مند بن گئے کہ وہ ان سے بہت پیار رکھتے اور ان کی بہت تعریف فرماتے تھے۔ کرخی رحمۃ اللہ علیہ کے اقوال میں سے ایک یہ ہے:

لِلْفِتْیَانِ ثَلٰثُ عَلَامَاتٍ: وَفَاءٌ بِلَا خِلَافٍ، وَمَدْحٌ بِلَا جُوْدٍ وَعَطَاءٌ بِلَا سُؤَالٍ. یعنی نیکی سے اس درجہ انس و محبت ہو کہ خواہ کسی شخص نے اس کے ساتھ کبھی کوئی نیکی و بخشش کا معاملہ نہ کیا ہو، اس کی نیکی اور خوبیوں کی تعریف میں بخل نہ کرے۔ نیز نیکی اور بھلائی جہاں اور جس صورت میں بھی پائے اسے اپنی چیز سمجھے اور اس کی تحسین و ستائش اور قدر کرے۔ تیسرے عطاء بے سوال، یعنی جب اس کے پاس مال اور ذرائع ہوں تو ہر وقت اور بلا امتیاز مخلوق خدا کی مدد کے لیے کوشاں اور آمادہ رہے بغیر اس کے کہ کوئی اس کے آگے ہاتھ پھیلائے۔ جہاں کوئی ضرورت مند علم

---

[1] حضرت انسؓ سے ترمذی میں روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک نوجوان کو نزع کی حالت میں دیکھا اور پوچھا کہ "اس کیفیت میں تم اپنے آپ کو کس حال میں پاتے ہو؟" اس نے کہا: "اے اللہ کے رسولؐ، میں اللہ کی رحمت کی امید رکھتا ہوں اور ساتھ ہی اپنے گناہوں کی وجہ سے ڈر بھی لگ رہا ہے۔" نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اس طرح کے موقع پر جس شخص کے دل میں یہ دونوں طرح کے خیالات (خوف و رجا) ہوں گے تو یقیناً اللہ تعالیٰ اس کی توقع پوری کرے گا اور جس چیز سے وہ ڈر رہا ہے اس سے محفوظ رکھے گا۔" یعنی یہ ایمان کی صحیح حالت ہے۔ اسی کو فقہاء نے الایمان بین الخوف والرجا کے الفاظ میں بیان کیا ہے۔

میں آ ئے اس کی مدد کو پہنچے اور سوال کی ذلت سے دوچار کیے بغیر اسے عطا کرے۔

یہ تینوں صفات اللہ تعالیٰ کی ہیں۔ اللہ کبھی اپنے بندوں سے اپنے عہد کے خلاف نہیں کرتا، وہ ہمیشہ وفا پر قائم رہتا ہے خواہ بندوں کا رویہ اس کے بارے میں کچھ بھی رہے۔ ہر چند کہ مخلوق اپنی وفا کے خلاف چلتی ہے لیکن اس کی طرف سے لطف وکرم میں کوئی فرق نہیں آتا۔ بندہ جب بھی اسے پکارے اور کتنی ہی سرکشی اور بغاوت کے بعد پکارے، اللہ اس کے برے کاموں کی وجہ سے اسے کبھی نہیں دھتکارتا۔ وہ آج بھی وہی اور ویسا ہی توّاب ورحیم ہے جو اور جیسا آدم، نوح، ابراہیم، موسیٰ اور محمد علیہم السلام کے ساتھ تھا۔ صرف بندے اس کے ساتھ اپنا رویہ بدلتے رہتے ہیں۔

مدح بے بخشش تو صرف اللہ ہی کا حصہ ہے۔ اللہ بندوں سے کسی خدمت یا چیز کا محتاج نہیں۔ وہ غنی اور حمید ہے۔ زمین وآسمان کے سب خزانے اس کی مِلک ہیں۔ وہ جو چاہتا ہے اسے صرف حکم دیتا ہے کہ ہو جا اور وہ ہو جاتا ہے۔ مگر اس کے باوجود بندہ ذرا اس کی طرف رجوع کرے تو وہ بندے کی تعریف اور قدر دانی فرماتا ہے بلکہ فرشتوں کے روبرو بھی مدح وستائش کے ساتھ اس کا ذکر فرماتا ہے۔

پھر اللہ ہی ہے جو بلا سوال کے ہر ایک کی ضرورت پوری کرتا ہے۔ بلکہ جن ضرورتوں کا آدمی کو پتہ تک نہیں ہوتا اور بہت سی وہ جن کا اُسے کبھی بھی علم نہیں ہوگا سب کو پوری کرتا ہے۔

جو شخص ان صفات کو اپنے اندر پرورش کرے گا وہ گویا خدائی صفات اپنے اندر پرورش کرے گا۔ ان میں سے کوئی صفت بلکہ اس کا شائبہ تک بھی کسی کم ظرف آدمی کے اندر نہیں ہوسکتا ہے اور جس کے اندر صفات ہوں اس سے بڑھ کر کوئی جوانمرد نہیں کہ اس نے اپنے سب سے بڑے اور طاقتور دشمن (شیطان) کو چت کر دیا اور بندے کے لیے اصل جواں مردی یہی ہے کہ اپنے ازلی دشمن کو شکست دے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام میں یہ تینوں صفات بدرجۂ اتم پائی جاتی تھیں اللہ تعالیٰ کے ساتھ جب انھوں نے ایک مرتبہ بندگی کا عہد باندھ لیا تو پھر اس کی وفاداری میں اپنی ہر شے کی بازی لگا دی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے خود اُن کے بارے میں فرمایا: ''وَاِبْرَاهِیْمَ الَّذِیْ وَفّٰی (۳۷:۵۳) وہ

ابراہیم جس نے وفاداری کا حق ادا کر دیا۔'' نیز'' وَاِذِابْتَلٰی اِبْرَاهِیْمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ (۱۲۴:۲) اور جب ابراہیم کو اس کے رب نے چند باتوں میں آزمایا تو وہ اُن سب میں پورا اترا۔''

جب کوئی شخص آپ کے پاس آیا تو بلا طلب وسوال جو کچھ موجود تھا، لا کر سامنے رکھ دیا: ''قَالَ سَلٰمٌ فَمَا لَبِثَ اَنْ جَآءَ بِعِجْلٍ حَنِيْذٍ، (۶۹:۱۱) یعنی وعلیکم السلام کہا اور فورا بھنا ہوا بچھڑا ان کے سامنے لا کر رکھ دیا۔''

اور مدح بے بخشش کے سلسلے میں آپ کا یہ مقام تھا کہ قوم لوط جس سے کسی نیکی و بھلائی کا تو بھلا سوال کیا، جو آپ کے بھتیجے لوط علیہ السلام کی جان کے درپے تھی اس کے عذاب کا حکم لے کر جب فرشتے آئے تو حضرت ابراہیمؑ نے اس قوم کے حق میں اللہ تعالیٰ سے جھگڑا شروع کر دیا اور اس قدر اصرار کیا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:'' اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا اِنَّهٗ قَدْ جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ (۷۶:۱۱) یعنی چھوڑ واب اس جھگڑے کو، تمھارے رب کا حکم ہو چکا ہے۔''

(۱۹) حضرت عبدالرحمٰن حاتم بن عنوان اصم رحمۃ اللہ علیہ:

آپ خراسان کے قدیم مشائخ میں سے ہیں۔ حضرت شفیق رحمۃ اللہ علیہ کے مرید اور حضرت خضرویہ رحمۃ اللہ علیہ کے استاد تھے۔ ابتدا سے انتہا تک ایک قدم بھی آپ نے طریقت کے خلاف نہیں رکھا۔ سرتاپا اخلاص و بندگی تھے۔ چنانچہ حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کے بارے میں فرمایا:

صِدِّيْقُ زَمَانِنَا حَاتِمُ الْاَصَمُّ رَحْمَةُ اللّٰهِ عَلَيْهِ. یعنی ہمارے دَور کے صدیق حاتم اصمؒ ہیں۔

نفس کی آفتوں اور طبیعت کی رعونتوں کے بارے میں آپ کا کلام بہت بلند مرتب ہے۔ فرماتے ہیں:

''اَلشَّهْوَةُ ثَلَاثَةٌ شَهْوَةٌ فِی الْاَكْلِ وَشَهْوَةٌ فِیْ الْكَلَامِ وَشَهْوَةٌ فِی النَّظْرِ. فَاحْفَظِ الْاَكْلَ بِالْيَقِيْنِ وَالتَّوَكُّلِ وَاللِّسَانَ بِاالصِّدْقِ وَالنَّظْرِ. فَاحْفَظِ الْاَكْلَ بِالْيَقِيْنِ وَالتَّوَكُّلِ

وَالْلِّسَانَ بِاالصِّدْقِ وَالنَّظَرَ بِالْعِبْرَۃِ. یعنی شہوات (وہ خواہشاتِ نفس جن پر قابو پانا مشکل ہوتا ہے) تین ہیں: ایک لذّتِ طعام، دوسری لذّتِ کلام، اور تیسری لذّتِ نظر۔ لذّتِ طعام کی حرص کا علاج خدا کی ربوبیت پر کامل یقین اور بھروسہ رکھنا ہے۔ لذّتِ کلام کا علاج زبان کو سچ کا پابند کر لینا ہے، اور لذّتِ نظر کا علاج نظر کو نگاہِ عبرت بنالینا ہے۔'' کیونکہ جو شخص خداوند تعالیٰ کی ربوبیّت پر پختہ ایمان لے آتا ہے اور اس کی تقسیم رزق پر اعتماد و توکل کی راہ اختیار کر لیتا ہے وہ کھانے ہی کی نہیں ہر قسم کی حرص سے خلاص پا جاتا ہے۔ جو شخص اپنی زبان کو سچ بولنے کا پابند بنالیتا ہے وہ لذّتِ کلام کے تمام گناہوں سے خلاصی پا جاتا ہے۔ اور جو شخص آنکھ کے سامنے آنے والی ہر چیز اور ہر واقعہ سے عبرت حاصل کرنے کا خوگر ہو جاتا ہے وہ بدنظری کی تمام اقسام سے خلاصی پا جاتا ہے۔

(۲۰) حضرت ابوعبداللہ محمد بن ادریس شافعی رحمۃ اللہ علیہ:

آپ حضرت امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد اور امام احمد بن حنبلؒ کے اساتذہ میں سے تھے۔ جب تک مدینہ میں رہے امام مالکؒ کے شاگرد رہے۔ جب عراق میں آئے تو محمد بن حسن رحمۃ اللہ علیہ سے میل ملاپ رہا۔ آپ تمام علوم میں امام ہیں اور آپ کا کلام بلند مرتبہ ہے۔ آپ بہت متقی و پرہیزگار، بڑے جواں مرد اور جری بزرگ تھے۔ آپ نے فرمایا: اِذَا رَأَیْتَ الْعَالِمَ یَشْتَغِلُ بِاالرُّخَصِ وَالتَّاوِیْلِ فَلَنْ یَجِیْ مِنْهُ بِشَیْئٍ، یعنی جب تم کسی عالم کو دیکھو کہ وہ تاویلوں اور رخصتوں کی تلاش میں مشغول ہے تو سمجھ لو کہ اس سے کچھ نہ بن پڑے گا۔ علماء مخلوقات کے پیش رَو ہیں۔ اس لیے انھیں عزیمت کی راہ اختیار کرنی چاہیے۔ یہ کسی صورت جائز نہیں ہے کہ کوئی شخص ان کے آگے قدم رکھ سکے۔

<u>دین میں رخصت کی راہ تلاش کرنا عوام کا درجہ ہے۔ خواص اور رہنماؤں کا کام نہیں ہے۔ خواص کا درجہ عزیمت اور مجاہدے کی راہ اختیار کرنا ہے۔</u> اگر آگے چلنے والے ہی عوام کے درجے پر گر جائیں تو عوام کہاں ٹھہریں گے۔ ایسے علماء سے کچھ نہیں ہو سکتا۔ حقیقت یہ ہے کہ خدا کے کام میں رخصت طلب کرنا خدا کے فرمان اور اس کے کام کو خفیف اور اپنے کام کو اہم تر سمجھنے کی علامت

ہے۔ علماء حق تعالیٰ کی دوستی کے دعویدار ہیں اور دوست کبھی دوست کے فرمان کو خفیف نہیں سمجھے۔ دوست تو وہ ہوتا ہے جو دوست کے اشارے پر جان دیتا ہے۔ نہ کہ وہ جو دوست کے حکم اور فرمان سے پہلوتہی کرنے کے حیلے اور بہانے تلاش کرنے لگے۔

مشائخ رحمہم اللہ میں سے ایک صاحب روایت کرتے ہیں کہ ایک رات میں نے خواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا۔ میں نے حضورؐ سے عرض کیا: یا رسولؐ اللہ! مجھے آپ سے یہ حدیث پہنچی ہے کہ زمین میں حق تعالیٰ کے اوتاد و اولیاء اور ابرار ہمیشہ موجود رہتے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ راوی نے میری طرف سے یہ حدیث جو بیان کی ہے وہ اس میں بالکل سچا ہے۔ میں نے عرض کیا کہ حضورؐ ان میں سے ایک کو دیکھنے کی خواہش رکھتا ہوں۔ آپؐ نے فرمایا: ان میں سے ایک محمد بن ادریس شافعیؒ ہے۔

(۲۱) حضرت ابومحمد عبداللہ احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ:

آپ سنت کے شیخ، اہل بدعت پر قہر کرنے والے اور تقویٰ و پرہیزگاری میں بہت عالی مقام اور احادیث کے حافظ ہوئے ہیں۔ مشائخ کبار مثلاً ذوالنون مصری، بشر حافی اور سرّی سقطی اور کرخی رحمہم اللہ وغیرہ کی صحبت اختیار کیے ہوئے تھے۔ آپ تمام حالات میں آزمائے گئے۔ زندگی میں معتزلہ کے ہاتھ سے اور اپنی وفات میں مشبّہ[1] کی تہمتوں سے۔ یہاں تک کہ اہل سنت نے بھی آپ کے حالات سے آگاہی نہ پائی اور آپ پر تہمت لگائی۔ حالانکہ آپ ان تمام تہمتوں سے پاک اور بَری تھے۔

جب بغداد میں معتزلیوں نے غلبہ پایا تو انھوں نے فیصلہ کیا کہ امام احمد بن حنبلؒ کو تکلیف دے کر ان سے قرآن مجید کے مخلوق ہونے کے فتوے پر دستخط کروانے چاہئیں۔ آپ بوڑھے اور کمزور تھے لیکن جب آپ نے اپنے علم و ضمیر کے خلاف ایسا کرنے سے انکار کر دیا تو آپ کے دونوں ہاتھ پیچھے باندھ دیے گئے اور آپ پر اتنے کوڑے برسائے گئے کہ کہتے ہیں کہ اگر ہاتھی پر بھی برسائے جاتے تو ان کی تاب نہ لاسکتا۔ مگر اس کے باوجود جس بات کو غلط سمجھتے تھے اس کو صحیح

[1] حلولی فرقہ کا ایک گروہ۔

قرار دینے کے لیے تیار نہ ہوئے۔ اگر چہ انہی کوڑوں کے زخموں کے نتیجے میں آپ کا انتقال ہوا، لیکن آپ کے حِلم و بردباری اور تفویض إلی اللہ کا یہ عالم تھا کہ وفات کے وقت کچھ لوگوں نے عرض کیا کہ ایسے لوگوں کے بارے میں آپ کیا فرماتے ہیں جنھوں نے ناحق آپ کو ایسی حالت کو پہنچایا۔ آپ نے فرمایا: میں ان کے بارے میں کیا کہوں، انہوں نے مجھے خدا کی راہ میں مارا ہے۔ اور ان کا گمان ہے کہ میں باطل کی راہ پر ہوں اور وہ حق پر ہیں۔ محض ان زخموں کے لیے تو میں قیامت کے روز ان کے خلاف دعویٰ نہیں کروں گا۔

آپ کا کلام بہت عالی مرتبہ ہے۔ آپ سے جو کوئی سند دریافت کرتا تو اگر یہ معاملات سے متعلق ہوتا تو جواب دیتے اور اگر حقائق (طریقت) سے متعلق ہوتا تو بشر حافی رحمۃ اللہ علیہ کی طرف رجوع کرنے کی ہدایت فرماتے۔

ایک مرتبہ ایک شخص آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے دریافت کیا: مَا الْإِخْلَاصُ یعنی اخلاص کیا ہے؟ آپ نے جواب دیا: اَلْإِخْلَاصُ هُوَ الْخَلَاصُ مِنْ اٰفَاتِ الْاَعْمَالِ یعنی اخلاص یہ ہے کہ تو اپنے اعمال کی آفتوں سے خلاصی حاصل کر لے۔ یعنی تیرا عمل ریا اور شہرت طلبی کے جذبہ سے پاک ہو جائے۔

اس نے عرض کیا: مَا التَّوَكُّلُ؟ یعنی توکل کیا ہے؟ آپ نے جواب دیا: اَلثِّقَةُ بِاللّٰهِ یعنی اپنی روزی کے بارے میں خدا پر بھروسہ رکھنا۔

پھر اس نے پوچھا: مَا الرِّضَاءُ؟ یعنی رضا کیا ہے؟ آپ نے جواب دیا: تَسْلِيْمُ الْاُمُوْرِ اِلَى اللّٰهِ، یعنی تمام کاموں کو خدا کے سپرد کرنا اور اس کے فیصلہ پر راضی رہنا۔

پھر اُس نے پوچھا: مَا الْمُحَبَّةُ؟ یعنی محبت کیا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ یہ بات بشر حافی سے پوچھو۔ جب تک وہ موجود ہیں اس کا جواب وہی دیں گے۔

آج کتنے علماء اور صوفیاء ایسے ہیں جو اپنے کسی ہم عصر کو اپنے سے بہتر قرار دے کر کسی کو اس کی طرف رجوع کرنے کا مشورہ دیں۔

(۲۲) حضرت ابوالحسن احمد بن ابوالجواری رحمۃ اللہ علیہ:

آپ شام کے بزرگ ترین مشائخ میں سے تھے۔ تمام مشائخ آپ کی تعریف کیا کرتے تھے۔ یہاں تک کہ حضرت جُنید رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: احمد بن ابوالجواری شام کی خوشبو ہیں۔ آپ احادیث کے راوی ہیں اور آپ کی روایت کردہ سب احادیث صحیح ہیں۔ آپ بہت بڑے سیاح تھے، اس لیے آپ نے بہت سے لوگوں سے فائدہ اٹھایا۔ حضرت ابوسلیمان دُرّانی کے مرید تھے۔ دُنیا اور اہلِ دنیا کی آپ کی نظر میں کیا حیثیت تھی، یہ آپ کے اس ارشاد سے واضح ہو جاتی ہے۔ آپ نے فرمایا:

اَلدُّنْیَا مَزْبَلَةٌ وَمَجْمَعُ الْكِلَابِ، وَاَقَلُّ مِنَ الْكِلَابِ مَنْ عَكَفَ عَلَيْهَا. فَاِنَّ الْكَلْبَ يَاْخُذُ مِنْهَا حَاجَتَهٗ وَيَنْصَرِفُ وَالْمُحِبُّ لَهَا لَا يَزَالُ عَنْهَا وَلَا يَتْرُكُهَا بِحَالٍ.

''یعنی دنیا گندگی کا ڈھیر اور کتوں کے جمع ہونے کی جگہ ہے، اور وہ شخص کتوں سے بھی کمتر ہے جو دنیا کے مال پر جم کر بیٹھ جائے۔ کیونکہ کتا تو اس ڈھیر سے اپنی حاجت پوری کر کے (پیٹ بھر کر) چلا جاتا ہے، لیکن دنیا پرست آدمی اسی سے چمٹا رہتا ہے، اور کسی حال میں اس سے الگ نہیں ہوتا اور اسے نہیں چھوڑتا۔''

نیز آپ نے فرمایا: نِعْمَ الدَّلِیْلُ اَنْتَ وَاَمَّا الْاِشْتِغَالُ بِالدَّلِیْلِ بَعْدَ الْوُصُوْلِ اِلَی الْمَدْلُوْلِ مُحَالٌ. یعنی سب سے اچھی اور سب سے بڑی دلیل آپ (ذات باری تعالیٰ) خود ہیں۔ اپنے مقصود (مدلول) کو پا لینے کے بعد دلیل و منطق میں مشغول رہنے کے کیا معنی؟ اس کے بعد تو اصل کام صرف آپ کے ہر فرمان کے لیے سراپا تسلیم و انقیاد بن جانا اور آپ کی بے چون و چرا اطاعت و فرماں برداری کے لیے ہر آن کمر بستہ رہنا ہی رہ جاتا ہے۔

(۲۳) حضرت ابوحامد احمد بن خضرویہ بلخی رحمۃ اللہ علیہ:

آپ خراسان کے آفتاب، اپنی قوم کے پیشوا، اپنے وقت کے بزرگ اور خواص و عوام کے پسندیدہ تھے۔ اپنا لباس فوجی رکھتے تھے اور ملامت کا طریقہ اختیار کیے ہوئے تھے۔ آپ کی بیوی فاطمہ بلخ کے امیر کی بیٹی اور طریقت میں بڑی شان والی تھیں۔ جب فاطمہ نے توبہ کی اور خدا کی راہ

کے لیے اپنے آپ کو وقف کیا تو کسی ذریعہ سے احمدؒ کو کہلا بھیجا کہ آپ میرے والد سے میری درخواست کریں۔ لیکن آپ نے کوئی توجہ نہ کی۔ اس کے بعد فاطمہ نے کئی لوگوں کی وساطت سے آپ کو کہلایا کہ اے احمد! میں تو تجھے ایک خدا ترس اور بہادر آدمی سمجھتی تھی کہ تو ایک عورت کا رہبر بنے گا، تُو تو کوئی رہزن معلوم ہوتا ہے۔ اس کے بعد احمدؒ نے کسی کو امیرِ بلخ کے پاس فاطمہ کے لیے درخواست کے ساتھ بھیجا اور اس نے اسے برکت کا موجب سمجھ کر قبول کر لیا۔ اور فاطمہ ان کی زوجیت میں آ گئیں۔

حضرت احمدؒ کے بارے میں ابوحفص حدّ ادرحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: لَوْلَا اَحْمَدُ ابْنِ خَضْرِوِیَۃُ مَاظَھَرَتِ الْفَتُوَّۃُ. یعنی اگر احمد بن خضرویہ نہ پیدا ہوتے تو جرأت و جواں مردی ظاہر نہ ہوتی۔ اُس زمانے کے لوگ یہ سمجھ ہی نہ پاتے کہ جرأت و جوانمردی کسے کہتے ہیں۔

آپ کی تصانیف ہر فن کے آداب اور معاملات میں مشہور ہیں۔ آپ کا کلام بلند مرتبہ اور معانی بہت عمدہ ہیں۔ آپ نے فرمایا: اَلطَّرِیْقُ وَاضِحٌ وَالْحَقُّ لَائِحٌ وَالدَّاعِیُ قَدْ اَسْمَعُ فَمَا التَّحَیُّرُ بَعْدَھَا اِلَّا مِنَ الْعُمْیٰ، یعنی راستہ بالکل واضح ہے اور حق آفتاب کی طرح روشن ہے اور بلانے والا خوب توجہ سے سننے والا ہے۔ اس کے بعد پریشانی کس بات کی ہے الا یہ کہ آدمی اندھا ہی ہو۔ جیسا کہ اللہ عزوجل نے فرمایا: "قَدْ تَّبَیَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَیِّ...... الخ (۲:۲۵۶) یعنی صحیح بات غلط خیالات سے الگ چھانٹ کر رکھ دی گئی ہے۔ اب جو کوئی طاغوت کا انکار کر کے اللہ پر ایمان لے آیا، اس نے ایک ایسا مضبوط سہارا تھام لیا جو کبھی ٹوٹنے والا نہیں ہے اور اللہ (جس کا سہارا اس نے لیا ہے) سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے۔"

حضرت احمد بن خضرویہؒ حضرت ابویزید رحمۃ اللہ علیہ کے پاس جایا کرتے تھے۔ فاطمہ بھی ساتھ جاتی تھیں۔ اور آپ سے ہمیشہ گستاخی کے ساتھ پیش آتیں۔ بلکہ جب پہلی مرتبہ گئی ہیں تو ان کے روبرو نقاب بھی الٹ دیا۔ جس پر حضرت احمدؒ کو بہت طیش آیا۔ مگر بعد میں جب فاطمہ نے اس کی وجہ انھیں بتائیں تو انھیں اطمینان ہو گیا۔ حضرت ابویزیدؒ نے فاطمہ کی آواز سننے کے سوا ان کی کسی چیز پر کبھی نظر نہیں کی۔ یہاں تک کہ ایک روز اچانک ابویزیدؒ کی نظر فاطمہ کے ہاتھوں پر پڑی اور انھوں نے دیکھا کہ ہاتھ مہندی سے رنگین ہیں۔ آپ نے پوچھا: فاطمہ! ہاتھ پر مہندی

کیوں لگا رکھی ہے؟ فاطمہ نے کہا: اے ابو یزید! جب تک تیری آنکھ نے میرے ہاتھ کی حنا کو نہ دیکھا مجھے تم سے گستاخانہ کلام کرنے میں بڑی خوشی محسوس ہوتی تھی۔ اب جس صورت میں تیری آنکھ مجھ پر پڑی تیری صحبت مجھ پر حرام ہوئی۔ چنانچہ اس کے بعد یہ وہاں سے رخصت ہو کر اس جگہ ہی کو چھوڑ کر نیشاپور منتقل ہو گئے۔ حضرت ابو یزیدؒ نے فاطمہ کے بارے میں فرمایا: ''مَنْ اَرَادَ اَنْ یَنْظُرَ اِلٰی رَجُلٍ مِنَ الرِّجَالِ مَخْتُوٌّ تَحْتَ لِبَاسِ النِّسْوَانِ فَلْیَنْظُرْ اِلٰی فَاطِمَةَ، یعنی جو شخص عورت کے لباس میں مردانِ خدا میں سے کسی مضبوط جوانمرد کو دیکھنا چاہے وہ فاطمہ کو دیکھ لے۔''

یحیٰ بن معاذ رازیؒ بلخ جاتے ہوئے نیشاپور آئے تو احمدؒ نے ان کی دعوت کا ارادہ کیا اور فاطمہ سے اس سلسلے میں پوچھا کہ کیا کیا سامان کتنا کتنا درکار ہوگا؟ فاطمہ نے جواب دیا کہ اتنی گائیں، اتنی بکریاں، اتنی شمعیں، اتنا عطر، اتنا فلاں سامان اور اتنی فلاں چیز اور ان کے علاوہ اتنے گدھے بھی ذبح کرنے کے لیے منگوا لیں۔ احمدؒ نے پوچھا کہ ان چیزوں کے ساتھ گدھوں کو کیا کرو گی؟ فاطمہ نے کہا کہ جب کوئی سخی کسی سخی کے ہاں مہمان ہوتا ہے تو محلہ کے بہت سے کتے بھی آ جاتے ہیں۔ ان کو بھی تو بھوکے نہ رخصت کرنا چاہیے۔

(۲۴) حضرت ابوزکریا یحیٰ بن معاذ رازی رحمۃ اللہ علیہ:

آپ بہت عالی ہمت اور نیک سیرت بزرگ ہوئے ہیں۔ یہاں تک کہ آپ کی محبت اور وفا کی زبان اور دوستی کے طریقہ کی زینت کہا گیا ہے۔ حضرمی رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کے بارے میں فرمایا کہ خداوند تعالیٰ کے دو یحیٰ ہوئے ہیں۔ ایک انبیاءؑ میں سے اور دوسرا اولیاء سے۔ حضرت یحیٰ بن زکریا علیہما السلام خداوند تعالیٰ سے اس قدر ڈرتے تھے کہ بہت سے نجات کے مدعی ان کے خوف کو دیکھ کر نجات سے ناامید ہو گئے، اور یحیٰؒ بن معاذ نے امید کا ایسا طریقہ اختیار کیا کہ بہت سے لوگوں کا ہاتھ ان کی امید کے سبب مضبوط ہو گیا۔ حضرت حضرمیؒ سے لوگوں نے یحیٰ بن معاذؒ کے حالات دریافت کیے تو آپ نے بتایا کہ آپ کبھی اور کسی حال میں جاہل (خداوند تعالیٰ سے غافل) نہیں رہے۔ اور کبھی کسی کبیرہ گناہ کے مرتکب نہیں ہوئے۔ اور معاملات (اللہ تعالیٰ سے تعلق کی دُرستی) اور ان کے عمل میں اس درجہ کو پہنچے ہوئے تھے کہ ہر

شخص اس کی طاقت نہیں رکھ سکتا۔

یحییٰ بن معاذؒ کے شاگردوں میں سے ایک شاگرد نے آپ سے دریافت کیا کہ اے شیخ! آپ تو خداوند تعالیٰ کی رحمت سے ہمیشہ بہت پُر امید رہتے ہیں، لیکن آپ کا معاملہ (خدا کے بارے میں طرزِ عمل) خائفین کا سا ہے۔ آپ نے فرمایا: بیٹا! عبادت کا ترک گناہ اور گمراہی ہے۔ خوف، امید اور استقامت ایمان کے نشان ہیں۔ ارکانِ ایمان پر عمل کرنے والے کسی شخص کا گمراہی میں پڑنا محال ہے۔ خوف میں آدمی خداوند تعالیٰ کے عذاب کے خوف سے اس کی عبادت کرتا ہے اور امید میں اس کی رحمت و مغفرت کی امید پر۔ جب تک عبادت ٹھیک نہ ہو، نہ خوف درست ہو سکتا ہے اور نہ امید۔ اور جہاں عبادت چاہیے وہاں پر محض عبارت (زبانی جمع خرچ) سے کوئی فائدہ نہیں ہو سکتا۔

آپ کا طریقہ غنا کو فقر پر بزرگی اور ترجیح دینے کا تھا۔ اس لیے خرچ کھلے ہاتھ سے کرتے تھے۔ جب رے[1] میں آپ پر بہت قرض ہو گیا تو آپ نے خراسان کا ارادہ کیا۔ لیکن جب بلخ پہنچے تو وہاں لوگوں نے روک لیا۔ کچھ عرصہ وہاں ٹھہر کر لوگوں کو وعظ و تلقین فرماتے رہے۔ وہاں کے لوگوں نے ایک لاکھ درہم آپ کی خدمت میں پیش کیے۔ اس کے بعد آپ رے کی طرف واپس لوٹے۔ راستے میں ڈاکوؤں نے ڈاکہ ڈال کر ساری رقم لوٹ لی۔ اور آپ خالی ہاتھ نیشاپور آ گئے اور وہیں انتقال ہوا۔

آپ کی بہت سی تصانیف ہیں۔ مشائخ کے گروہ سے جو شخص سب سے پہلے منبر پر بیٹھا اور اس کے ذریعے لوگوں کو وعظ و تلقین کی وہ آپ ہی ہیں۔ آپ کا کلام طبیعت میں رقت اور کانوں میں لذت پیدا کرنے والا ہے اور میں (علیؒ بن عثمان جلابی) ان کے کلام کو بہت محبوب رکھتا ہوں۔ آپ نے فرمایا: اَلدُّنْيَا دَارُ الْاِشْتِغَالِ دَارُ الْاٰخِرَةُ دَارُ الْاَهْوَالِ وَلَا يَزَالُ الْعَبْدُ بَيْنَ الْاَشْغَالِ وَالْاَهْوَالِ حَتّٰى يَسْتَقِرَّ بِهِ الْقَرَارُ اِمَّا اِلَى الْجَنَّةِ وَاِمَّا اِلَى النَّارِ. یعنی دنیا مشغولیوں کی جگہ ہے اور آخرت ہول اور خوف کی جگہ۔ اور بندہ ان دونوں کے درمیان لُوھکتا رہتا ہے یہاں تک کہ ایک جگہ قرار پکڑ لیتا ہے۔ جو یا تو جنت کی نعمتوں میں ہمیشگی کا آرام و راحت ہے یا ہمیشہ کے لیے دوزخ کی آگ میں پڑے آہ و زاری کرنا۔

---

[1] رے سلجوقی سلطان طغرل کا دارالحکومت تھا۔

(۲۵) حضرت ابو حفص عمر بن سالم نیشاپوری رحمۃ اللہ علیہ:

آپؒ احمد خضرویہؒ کے رفیق اور خراسان کے شیخ المشائخ تھے۔ تمام مشائخ آپ کی تعریف کرتے تھے۔

آپ کی توبہ اور رجوع الی اللہ کا قصہ عجیب ہے۔ ابتداء عمر میں ایک کنیز پر عاشق ہو گئے۔ اسے قابو میں لانے کی بہت کوشش کی مگر کامیابی نہ ہوئی۔ کسی نے بتایا کہ نیشاپور کے محلہ شارستان میں ایک یہودی ہے۔ اس کے پاس جاؤ، وہ اپنے سحر و عملیات سے تمھارے لیے اس کا بندوبست کر دے گا۔ یہ اس یہودی کے پاس گئے اور سارا حال بیان کیا۔ اس نے کہا کہ ہاں تمھارا یہ کام ہو جائے گا، لیکن اس کے لیے شرط یہ ہے کہ چالیس روز تک نماز وغیرہ سب چھوڑ دو، بھول کر بھی خدا کا نام زبان پر نہ لاؤ۔ اس دَوران میں نیکی کا کوئی کام نہ کرو، بلکہ اس کی نیت بھی دل کے قریب نہ پھٹکنے دو۔ اس طرح چالیس دن گزارنے کے بعد میرے پاس آؤ، پھر میں حیلہ کروں گا جس سے تیری مراد پوری ہو جائے گی۔ ابو حفص نے یہ بات مان لی اور چالیس روز اس طرح گزارنے کے بعد اس یہودی کے پاس گئے۔ یہودی نے اپنا طلسم استعمال کیا لیکن ان کا کام نہ بنا۔ اس پر یہودی نے کہا کہ تم نے شرط پوری نہیں کی، تم نے ضرور کوئی خلاف ورزی کی ہے اور نیکی کا کام کیا ہے۔ ابو حفص نے کہا کہ میں نے اس دَوران میں کوئی نیک کام نہیں کیا۔ البتہ ایک روز میں جا رہا تھا کہ راستہ میں ایک پتھر پڑا ہوا دیکھا۔ میں نے اسے راستہ سے ہٹا دیا کہ کسی کو اس کی ٹھوکر نہ لگ جائے۔ اس پر اُس یہودی نے انھیں کہا: تو اُس خدا کو آزار مت دے جس کا حق تو نے چالیس دن تک ضائع کیا، لیکن اس نے تیرے ایک عمل کو بھی ضائع نہ جانے دیا۔ یہ سب کر آپ نے سچی توبہ کی اور وہ یہودی بھی مسلمان ہو گیا۔ اس کے بعد آپ ماورد گئے۔ اور حضرت ابو عبداللہ ماوردی کے مرید ہوئے۔

توبہ کے بعد آپ نے لوہار کا کام شروع کر دیا۔ ایک روز آپ اپنی دکان پر بیٹھے یہ کام کر رہے تھے کہ ایک نابینا نے بازار میں بلند آواز سے قرآن مجید کی تلاوت شروع کر دی۔ قرآن مجید کی آواز سن کر آپ پر وجد طاری ہو گیا۔ بے خودی کے عالم میں سنڈاسی کے بغیر اسی طرح بھٹی میں

ہاتھ ڈال کر گرم لوہا نکال لیا۔ اس واقعہ کے بعد آپ نے یہ کام ترک کر دیا اور پھر کبھی دکان کی طرف نہ آئے۔

ایک مرتبہ آپ بغداد کے مشائخ کی زیارت وملاقات کے لیے وہاں تشریف لے گئے۔ چونکہ آپ عربی نہیں جانتے تھے اس لیے وہاں کے ارادت مندوں نے مشورہ کیا کہ بہت بڑے شیخ آرہے ہیں۔ خراسان کے شیخ الشیوخ کو ترجمانی کے لیے مقرر کر کے آپ کے کلام سے فیض حاصل کرنا چاہیے۔ لیکن جب آپ شونیزیہ کی مسجد میں تشریف لائے اور وہاں تمام مشائخ جمع ہوئے تو آپ نے فصیح عربی زبان میں کلام کیا اور سب مشائخ آپ کی عربی میں فصاحت پر حیران رہ گئے۔ مشائخ نے آپ سے سوال کیا: مَا الْفُتُوَّةُ؟ یعنی جواں مردی کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: مناسب ہے کہ آپ حضرات میں سے کوئی صاحب پہلے اپنی رائے ظاہر فرمائیں۔ چنانچہ جنید رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: اَلْفُتُوَّةُ عِنْدِیْ تَرْکُ الرُّؤْیَةِ وَاِسْقَاطُ النِّسْبَةِ. یعنی میرے نزدیک جوانمردی یہ ہے کہ تو اپنے آپ کو دیکھنا چھوڑ دے اور اپنے عمل کو بھی اپنی طرف منسوب نہ کرے۔ گویا 'میں' بالکل ختم ہو جائے۔ ابوحفص رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: "مَا اَحْسَنَ مَا قَالَ الشَّیْخُ وَلٰکِنَّ الْفُتُوَّةَ عِنْدِیْ اَدَاءُ الْاِنْصَافِ وَتَرْکُ مُطَالَبَةِ الْاِنْصَافِ. یعنی شیخ نے بہت اچھی بات فرمائی ہے، لیکن میرے نزدیک جوانمردی یہ ہے کہ آدمی خود تو ہر ایک کو انصاف دے، لیکن دوسروں سے انصاف کا مطالبہ چھوڑ دے۔" یہ سن کر جنیدؒ پھڑک اٹھے اور فرمایا: "قُوْمُوْا یَا اَصْحَابَنَا، فَقَدْ زَادَ اَبُوْحَفْصٍ عَلٰی اٰدَمَ[1] وَذُرِّیَّتِہٖ. یعنی (احترام میں) کھڑے ہو جاؤ دوستو! ابوحفص تو آدمؑ اور

---

[1] حضرت جنیدؒ کے اس قول پر ایک صاحب نے یہ اعتراض کیا ہے کہ اس سے تو یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک حضرت ابوحفصؒ انبیاء علیہم السلام سے بھی بڑھے ہوئے تھے۔ کیونکہ "آدمؑ اور اولادِ آدمؑ" میں تو انبیاءؑ بھی شامل ہیں۔ لیکن حضرت جنیدؒ جیسے عالم اور بزرگ کے بارے میں یہ خیال کرنا اور ان کے اس قول کو یہ معنی پہنانا زیادتی ہوگا۔ یہ ایک انداز بیان ہے جس سے ان کا منشاء حضرت حفصؒ کے تصور جوانمردی کی پوری پوری تحسین کرنا ہے۔ وہ ان الفاظ سے یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ ابوحفصؒ نے جوانمردی کے اس بلند ترین مقام کی نشان دہی کر دی ہے جس کا کوئی انسانی ذہن تصور کر سکتا ہے۔ اور حضرت ابوحفصؒ کی یہ بات ان کی خود ساختہ نہیں ہے۔ انھوں نے جو بات فرمائی ہے وہ دراصل حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہی کے ایک ارشاد کی ترجمانی ہے جس میں آپؐ نے فرمایا کہ میرے رب نے مجھے نو باتوں کا حکم دیا ہے اور ان کی صراحت کرتے ہوئے آپؐ نے فرمایا: "وان اصل من قطعنی وان اعطی من حرمنی واعفو عمّن ظلمنی، یعنی اور یہ کہ جو مجھ سے کٹے میں اس سے جڑوں اور جو مجھے محروم کرے میں اسے دوں اور جو مجھ پر زیادتی کرے میں اس سے درگزر کروں۔"

اس کی اولاد سب پر بازی لے گیا۔''

حضرت ابوحفصؒ کے اقوال میں سے ایک قول یہ ہے کہ ''تَرَکْتُ الْعَمَلَ ثُمَّ رَجَعْتُ اِلَیْهِ ثُمَّ تَرَکَنِیَ الْعَمَلُ فَلَمْ اَرْجِعْ اِلَیْهِ. یعنی میں نے ایک کام کو چھوڑا اور پھر میں اس کی طرف پلٹ گیا۔ پھر خود اُس کام نے مجھے چھوڑ دیا۔ تو اس کے بعد میں نے کبھی اس کی طرف رجوع نہیں کیا۔'' مطلب یہ ہے کہ جب کوئی شخص کسی وقتی یا سطحی تاثر کے تحت کسی فعل کو برا (منکر) سمجھ کر چھوڑتا ہے اور اس تاثر نے دل میں گھر نہیں کیا ہوتا تو آدمی بار بار اُس میں مبتلا ہوتا رہتا ہے۔ لیکن اگر وہ اثر طبیعت میں رچ بس کر اس کا جز بن جائے اور آدمی اپنے آپ اور اپنے گرد وپیش کو اس طرح بدل لے کہ اس منکر اور اس میں مبتلا لوگوں کو آدمی سے اجنبیت محسوس ہونے لگے تو پھر وہ فعل اور اس میں مبتلا لوگ خود ہی آدمی کو چھوڑ کر اس سے الگ ہو جاتے ہیں اور ان سے ہمیشہ کے لیے نجات مل جاتی ہے۔ اس لیے آدمی کو اپنی طبیعت، مزاج اور مذاق ایسا بنانا چاہیے کہ نامناسب اور نافرمانی کے کام اور اس کے برے ساتھ خود اسے چھوڑ جائیں۔ اگر آدمی اپنے مزاج ومذاق اور طبیعت وروابط میں تغیر نہیں کرے گا اور ان کو دُرست اور صحیح سانچے میں نہیں ڈھالے گا تو ہر وقت اس کا اندیشہ رہے گا کہ وہ اپنی پہلی حالت اور پہلے مشاغل کی طرف پھر لڑھک جائے۔

(۲۶) حضرت ابوصالح حمدون رحمۃ اللہ علیہ:

آپ کے والد ماجد کا نام عمارۃ القصار ہے۔ آپ قدیم شیوخ میں سے ہیں۔ علم وفقہ میں آپ کا بلند پایہ لوگوں میں شمار ہے اور پرہیزگاری وتقویٰ میں بہت بڑھے ہوئے تھے۔ شریعت میں ثوری مذہب رکھتے تھے اور طریقت میں ابوتراب بخشیؒ کے مرید تھے۔ آپ کے علم وتقویٰ کی وجہ سے نیشاپور کے تمام ائمہ اور بزرگ آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ سے درخواست کی کہ آپ منبر پر بیٹھ کر لوگوں کو وعظ ونصیحت فرمایا کریں تاکہ لوگ فیض حاصل کریں۔ اور ان کی اصلاح ہو۔ آپ نے فرمایا: میں وعظ کہنے کے ابھی قابل نہیں ہوا۔ لوگوں نے حیران ہو کر اس کی وجہ دریافت کی تو فرمایا کہ ابھی میرا دل دنیا کی عزت ومرتبہ کی طلب سے خالی نہیں ہوا، اس لیے میرا

کلام لوگوں کے لیے فائدہ مند نہیں ہوگا اور نہ اُن پر اثر کرے گا۔ اور جو سخن دلوں پر اثر نہ کرے وہ علم پر ہنسی کراتا ہے۔ اس سے علم کی بے قدری ہوتی ہے۔ ان حضرات نے کہا کہ علماء پر واجب ہے کہ لوگوں کو وعظ و نصیحت کریں۔ آپ نے فرمایا: وعظ و پند کہنا اس شخص پر واجب ہے جس کی خاموشی سے دین میں خلل واقع ہو جانے کا اندیشہ ہو اور اس کے کلام کرنے سے وہ خلل دُور ہو جائے۔

اسی دَوران میں کچھ لوگوں نے دریافت کیا کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ سلف صالحین کا سخن ہماری نسبت دلوں کو بہت زیادہ متاثر کرتا تھا۔ آپ نے فرمایا: ''لِاَنَّھُمْ تَکَلَّمُوْنَ لِعِزِّ الْاِسْلَامِ وَنَجَاتِ النُّفُوْسِ وَرِضَاءِ الرَّحْمٰنِ وَنَحْنُ نَتَکَلَّمُ لِعِزِ النَّفْسِ وَطَلَبِ الدُّنْیَا وَقُبُوْلِ الْخَلْقِ. یعنی سلف صالحین کے سخن میں تاثر کی وجہ یہ تھی کہ ان کا سخن اسلام کی عزت، لوگوں کو نجات کی راہ دکھانے اور خداوند تعالیٰ کی رضا کے لیے ہوتا تھا اور ہم جب یہ کام کرتے ہیں تو ہمارا مقصود اپنی بڑائی کا اظہار، طلبِ دنیا اور لوگوں میں مقبولیت حاصل کرنا ہوتا ہے۔'' کیونکہ جو شخص خدا کی رضا کے لیے بات کرتا ہے اس کے سخن میں دبدبہ اور جلال ہوتا ہے جو شریروں پر بھی اثر دکھاتا ہے۔ اور جو شخص اپنی کسی غرض کو سامنے رکھ کر کلام کرتا ہے تو اس کے سخن میں ذلت و اہانت ہوتی ہے۔ اس سے مخلوق کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔ ایسا سخن کہنے سے نہ کہنا بہتر ہوتا ہے۔

(۲۷) حضرت ابوالقاسم جنید بن محمد بن جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ:

آپ شریعت میں امام الائمہ اور طریقت میں شیخ المشائخ ہیں۔ تمام اہلِ طریقت کے آپ متفقہ امام ہیں۔ کسی کو بھی آپ کی امامت اور مشیخت سے انکار نہیں ہے۔ آپ سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد اور سرّی سقطی رحمۃ اللہ علیہ کے بھانجے اور مرید ہیں۔ اصول و فروع اور معاملات سب میں مفتی اور امام کا درجہ رکھتے ہیں۔ آپ کے مرشد حضرت سرّی سقطیؒ سے لوگوں نے پوچھا کہ کوئی مرید اپنے پیر سے بلند رتبہ ہوا ہے۔ آپؒ نے جواب دیا: ہاں، جنید مجھ سے درجہ میں بڑھا ہوا ہے۔

لیکن ان سب باتوں کے باوجود سرّی سقطی رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی میں جنید رحمۃ اللہ علیہ

کے مریدوں نے ان سے درخواست کی، آپ کچھ وعظ فرمایا کریں۔ لیکن حضرت جنیدؒ نے انکار کر دیا۔ اور فرمایا کہ جب تک شیخ زندہ موجود ہے میں وعظ نہیں کہوں گا۔ یہاں تک کہ ایک رات آپ نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا اور حضورؐ نے آپ سے فرمایا: اے جنید! تم مخلوقِ خدا کو وعظ سنایا کرو۔ تیرے وعظ کو اللہ عزّ وجل نے جہان والوں کی نجات کا موجب ٹھہرایا ہے۔ جب بیدار ہوئے تو دل میں خیال آیا کہ میرا درجہ سرّی سقطی رحمۃ اللہ علیہ سے بڑھا ہوا ہے۔ اسی لیے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے وعظ کہنے کی نصیحت فرمائی ہے۔ صبح جب نماز سے فارغ ہوئے تو سرّی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک شخص نے پیغام دیا کہ وہ فرماتے ہیں کہ جنیدؒ سے کہو کہ نہ مریدوں کے کہنے پر تم نے وعظ کہا نہ بغداد کے مشائخ کے فرمانے پر تو نے وعظ کیا اور نہ ہی میری سفارش اور پیغام سے تو نے وعظ کہا، اب تو حضور علیہ السلام کا فرمان ہوا ہے اس کو ضرور قبول کر لینا۔ جنیدؒ کہتے ہیں کہ یہ پیغام سن کر برتری کا جو خیال میرے سر میں سمایا ہوا تھا یک لخت نکل گیا اور میں نے جان لیا کہ سرّی سقطی رحمۃ اللہ علیہ کا درجہ مجھ سے اوپر ہے اور وہ میرے تمام احوال سے باخبر ہیں اور میں ان کے حالات سے بے خبر ہوں۔ چنانچہ میں ان کی خدمت میں حاضر ہوا اور استغفار کی۔ اور آپ سے دریافت کیا کہ آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ میں نے یہ خواب دیکھا ہے؟ حضرت سرّی سقطیؒ نے فرمایا کہ مجھے خواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ میں نے اپنے رسولؐ کو بھیجا ہے کہ جنیدؒ سے فرمائیں کہ وہ مخلوقات کو وعظ و نصیحت کیا کرے تا کہ بغداد کے باشندے مراد کو پہنچیں۔

حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ کا کلام بہت بلند مرتبہ ہے۔ آپ نے فرمایا: كَلَامُ الْاَنْبِيَاءِ نَبَاءٌ عَنِ الْحُضُوْرِ وَ كَلَامُ الصِّدِّيْقِيْنَ اِشَارَةٌ عَيْنٍ مِنْهُ. یعنی انبیاء کا کلام بارگاہ ربّ العزّت سے مستند اور یقینی خبر ہوتا ہے اور صدیقین (اولیاء) کا کلام اس درگاہ کی طرف سے آنکھ کا اشارہ ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نبی کی اطلاع میں غلطی و خطا کا کوئی امکان نہیں ہے۔ لیکن ولی کے بارے میں یہ امکان ہے کہ اشارہ سمجھنے اور اس کا ادراک کرنے میں غلطی لگ جائے۔ نبی اور ولی میں بالکل واضح اور قطعی فرق ہے۔ جہاں سے نبوت کی حد شروع ہوتی ہے وہاں ولایت کی حد ختم ہو جاتی ہے۔

حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ میرے دل میں شیطان کو دیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی۔ اس کے بعد ایک روز میں مسجد کے دروازہ پر کھڑا تھا کہ ایک بوڑھے آدمی کو آتا ہوا میں نے دیکھا جسے دیکھ کر مجھے شدید نفرت ہو رہی تھی۔ جب وہ میرے قریب آیا تو میں نے اس سے پوچھا کہ تم کون ہو کہ میری آنکھوں کو تجھے دیکھنے کی طاقت نہیں اور تیری موجودگی سے میرے دل کو سخت وحشت ہو رہی ہے؟ اس نے کہا کہ میں وہی ہوں جس کے دیکھنے کی تجھے خواہش تھی۔ میں نے کہا: او ملعون! تجھے کس چیز نے اس بات پر ابھارا کہ تو آدمؑ کو سجدہ نہ کرے؟ اس نے جواب دیا کہ: اے جنید! تم نے یہ کیا بات کہی، کیا میں خدا کی ذات کے سوا غیر کو سجدہ کر دیتا؟ جنیدؒ کہتے ہیں کہ میں اس کا یہ جواب سن کر ہکا بکا رہ گیا اور مجھ سے کوئی جواب نہ بن پڑا۔ اتنے میں میرے پیچھے سے مجھے آواز آئی: قُلْ لَهُ كَذَبْتَ، لَوْ كُنْتَ عَبْدًا مَامُوْرًا لِمَا خَرَجْتَ مِنْ اَمْرِهٖ وَنَهْيِهٖ فَسَمِعَ النِّدَاءَ مِنْ قَلْبِيْ فَصَاحَ وَقَالَ اَحْرَقْتَنِيْ بِاللّٰهِ وَغَابَ. یعنی اے جنید! اس سے کہو کہ تو جھوٹ بک رہا ہے۔ اگر تو خدا کا فرمانبردار بندہ ہوتا تو اس کے حکم سے باہر کیوں جاتا۔ شیطان نے میرے اندر سے یہ آواز سنی اور چیخ کر کہا: خدا کی قسم جنید تو نے مجھے جلا ڈالا، اور غائب ہو گیا۔

اس سے معلوم ہو گیا کہ حق جل وعلا اپنے دوستوں کا نگہبان ہے اور مشکلات میں وہ ان کی مدد اور رہنمائی کو پہنچتا ہے۔

(۲۸) حضرت ابو الحسن احمد بن محمد خراسانی نوری رحمۃ اللہ علیہ:

آپ شریعت میں امام الائمہ، طریقت میں شیخ المشائخ اور اہلِ تصوف کے بادشاہ ہیں۔ صوفیوں کا نوری گروہ انہی کی طرف منسوب ہے۔ کسل کا ترک، بلند ہمتی اور ہمیشہ کا مجاہدہ ان کی خصوصیات ہیں۔ چنانچہ ایک مرتبہ خدا معلوم کیا ترنگ آئی کہ گھر میں ایک ہی جگہ پر کھڑے ہو کر مسلسل تین دن رات خروش کرتے رہے۔ آخر مریدوں نے جا کر حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ سے صورتِ حال کا ذکر کیا۔ وہ تشریف لائے اور انھوں نے ان سے کہا کہ اے ابو الحسن! اگر تو

جانتا ہے کہ اس شور سے کچھ فائدہ پہنچتا ہے تو مجھے بھی حکم دے کہ میں بھی یہی طریق شروع کروں، اور اگر تو جانتا ہے کہ یہ خروش کچھ فائدہ نہیں رکھتا تو اپنے دل کو رضا کے سپرد کر، تاکہ تیرا دل خوش ہو، یہ سن کر نوریؒ خروش سے باز آئے اور فرمایا: ابوالقاسم! تو بہت اچھا معلم ہے۔

حضرت احمد نوری رحمۃ اللہ علیہ بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ میں جنیدؒ کے پاس گیا تو آپ صدر پر بیٹھے ہوئے تھے۔ میں نے ان سے کہا: ''یَـااَبَـا الْـقَـاسِـمْ غَشَّیْتَهُـمْ فَصَـدَّرُوْکَ وَنَـصَـحْـتُـهُـمْ فَرَمَوْنِیْ بِالْحِجَارَةِ، یعنی اے ابوالقاسم تو نے ان سے حق کو پوشیدہ رکھا یہی وجہ ہے کہ انھوں نے تجھے صدارت پر بٹھایا اور میں نے ان کو نصیحت کی تو انھوں نے مجھ پر پتھر برسائے۔'' یاد رہے کہ احمد نوریؒ جنیدؒ کے رفیق تھے، اس لیے آپس میں بے تکلف دوست تھے۔

حضرت احمد نوریؒ کا ارشاد ہے: اَلْجَمْعُ بِالْحَقِّ تَفْرِقَةٌ عَنْ غَیْرِہٖ وَالتَّفْرِقَةُ مِنْ غَیْرِہٖ جَـمْـعٌ بِـالْحَقِّ. یعنی خداوند تعالیٰ سے ملاپ اس کے سوا سے کٹ جانا ہے اور خدا کے ماسوا سے الگ ہونا خداوند تعالیٰ کے ساتھ جمع ہو جانا ہے۔ اس لیے جس شخص کا ارادہ خداوند تعالیٰ کے ساتھ جمع ہونے کا ہو اس کے لیے ضروری ہے کہ غیر اللہ سے جدا ہو، اور جس کا ارادہ غیر اللہ سے جڑے رہنے کا ہو وہ پھر خدا کے ساتھ جمع ہونے کا خیال چھوڑ دے۔ یہ دونوں چیزیں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اور یہ قاعدۂ کلیہ ہے کہ اَلضِّـدَّانِ لَایَجْتَمِعَانِ، یعنی دو متضاد چیزیں ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتیں۔

آپ نے یہ بھی فرمایا: ''اَعَزُّ الْاَشْیَاءِ فِی زَمَانِنَا شَیْئَانِ: عَالِمٌ یَعْمَلُ بِعِلْمِہٖ وَعَارِفٌ یَنْطِقُ عَنِ الْحَقِیْقَةِ، یعنی ہمارے زمانے کی چیزوں میں سے یہ دو بہت بڑی ہیں: ایک وہ عالم جو اپنے علم پر عمل کرتا ہے اور دوسرے وہ عارف جو حقیقت سے کلام کرتا ہے۔''

آپ نے یہ بھی فرمایا: ''مَنْ عَـلِـمَ الْاَشْیَـاءَ بِاللّٰہِ فَرُجُوْعُهٗ فِیْ کُلِّ شَیْءٍ اِلَی اللّٰہِ، یعنی جو شخص تمام چیزوں کو خدا کی طرف سے سمجھتا ہے وہ ہر شے کو دیکھ کر خدا ہی کی طرف متوجہ ہوتا ہے۔ یہ امر واقعہ ہے کہ ہر شے کو دیکھ کر آدمی کا ذہن لازماً اس کے مالک کی طرف جاتا ہے۔ اس لیے یہ ناممکن ہے کہ اگر آدمی کے دل و دماغ میں یہ خیال جاگزیں ہو کہ یہ جہان اور جو کچھ اس میں

ہے سب خداوند تعالیٰ کی مخلوق اور ملک ہے تو وہ پھر خدا کی طرف متوجہ نہ رہے۔ کیونکہ ہر شے جو اس کے سامنے آتی ہے خداوند تعالیٰ ہی کی مِلک اور اسی کی طرف سے ہے۔

(۲۹) حضرت یحییٰ ابو محمد عبداللہ بن خفیف رحمۃ اللہ علیہ:

آپ امت کے زاہدوں اور پرہیز گاروں میں سے ہوئے ہیں۔ حدیث میں ثوریؒ کا مذہب رکھتے تھے۔ آپ صوفیاء کے خفیفہ گروہ کے پیشوا حضرت ابوعبداللہ محمد بن خفیفؒ[1] کے بھائی ہیں اور آپ کی روایتیں عالی مرتبہ ہیں۔

آپ نے فرمایا: ''مَنْ اَرَادَ اَنْ یَکُوْنَ حَیًّا فِیْ حَیٰوتِہٖ فَلَا یُسْکِنِ الطَّمْعَ فِیْ قَلْبِہٖ، یعنی جو شخص یہ چاہتا ہو کہ اپنی زندگی میں زندوں میں شمار ہو تو اسے چاہیے کہ اپنے دل میں طمع کو جگہ نہ دے۔'' اس لیے کہ جس دل میں طمع کا بسیرا ہو وہ دل مردہ اور خیر سے خالی ہوتا ہے۔ اس دل پر مہر لگ جاتی ہے اور مردہ دل کا ہدایت کی طرف آنا ناممکن ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''اِنَّکَ لَاتُسْمِعُ الْمَوْتٰی وَلَا تُسْمِعُ الصُّمَّ الدُّعَآءَ (۲۷:۸۰) یعنی اے نبیؐ! تم مُردوں کو نہیں سنا سکتے اور نہ بہروں کو اپنی بات سنا سکتے ہو۔'' نیز فرمایا: ''مَنْ یُّوْقَ شُحَّ نَفْسِہٖ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝ (۵۹:۹، ۶۴:۱۶) یعنی جو طمع اور تنگ دلی سے بچا لیا گیا تو ایسے ہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔''

طمع کے معنی مخلوق میں سے کسی شے کی طلب میں ایسا مبتلا ہونا ہے کہ وہ خداوند تعالیٰ کی طرف سے آدمی کو غافل اور بے پروا کر دے۔ اور بہت ہی اچھا ہے وہ دل جو خدا کی ذات کے سوا ہر ایک کے لیے مردہ ہو اور صرف خدا کے لیے زندہ ہو۔

حضرت خفیفؒ فرماتے ہیں: ''خَلَقَ اللّٰہُ تَعَالٰی الْقُلُوْبَ مَسَاکِنَ الذِّکْرِ فَصَارَتْ مَسَاکِنَ الشَّھَوَاتِ وَلَا یَمْحُوا الشَّھَوَاتِ مِنَ الْقُلُوْبِ اِلَّا خَوْفٌ مُزْعِجٌ اَوْ شَوْقٌ مُقْلِقٌ، یعنی اللہ تعالیٰ نے دلوں کو ذکر کا مسکن بنایا ہے لیکن وہ شہوات کا مسکن بن گئے، اور شہوات کو دلوں سے یا تو بے قرار کر دینے والا خوف دُور کر سکتا ہے یا مضطرب کر دینے والا شوق۔''

[1] ملاحظہ ہو نمبر ۳۶ بر صفحہ ۱۹۰

وحشت اور بے قراری طمع اور شہوات (خواہشاتِ نفس) میں مبتلا ہونے کا نتیجہ ہوتی ہیں۔ دلوں کا مونس خدا کا ذکر ہے اور اسی سے وہ قرار پکڑتے ہیں۔ اَلَا بِذِکْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ (۱۳:۲۸)۔ اور جو دل طمع اور خواہشات کا مسکن بن جاتا ہے اُس سے اللہ تعالیٰ ہی نہیں ہر ایک اُس سے دُور بھاگتا ہے۔ مشائخ رحمہم اللہ نے فرمایا ہے: ''اَلطَّمَّاعُ مُسْتَوْحِشٌ مِنْهُ كُلُّ وَاحِدٍ، یعنی طمع کرنے والے شخص سے ہر شے متوحش ہوتی اور دُور بھاگتی ہے۔''

(۳۰) حضرت ابو محمد عبداللہ بن فضل بلخی رحمۃ اللہ علیہ:

آپ بزرگ مشائخ میں سے ہیں۔ عراق اور خُراسان میں مقبول تھے۔ آپ محمد بن خضرویہ رحمۃ اللہ علیہ کے مرید تھے۔ متعصب لوگوں نے آپ کو بلخ سے نکال دیا۔ آپ وہاں سے سمرقند چلے گئے اور وہیں عمر بسر کی۔

آپ کا ارشاد ہے: ''اَعْرَفُ النَّاسِ بِاللّٰهِ اَشَدُّهُمْ مُجَاهَدَةً فِیْ اَوَامِرِهٖ وَاَتْبَعُهُمْ لِسُنَّةِ نَبِیِّهٖ. یعنی اللہ کا سب سے بڑھ کر عارف وہ ہے جو سب سے بڑھ کر اللہ کے حکموں کی تعمیل میں سعی ومجاہدہ کرنے والا اور اس کے نبیؐ کی سنت کا اتباع کرنے والا ہو۔'' کیونکہ جس قدر کوئی شخص خدا سے قریب ہوتا ہے اتنا ہی وہ اس کے امر کا دلدادہ، اس کی تعمیل میں کوشاں ہوتا ہے، اور جو شخص جتنا خدا سے دُور ہوتا ہے وہ اسی قدر اس کے رسولؐ کے اتباع سے منکر ہوتا ہے۔

آپ نے یہ بھی فرمایا: ''عَجِبْتُ لِمَنْ يَقْطَعَ الْبَوَادِیَ وَالْقِفَارَ وَالْمَفَاوِزَ حَتّٰى يَصِلَ اِلٰى بَيْتِهٖ وَحَرَمِهٖ لِاَنَّ فِيْهِ اٰثَارُ اَنْبِيَائِهٖ، كَيْفَ لَا يَقْطَعُ بَادِيَةَ نَفْسِهٖ وَهَوَاهُ حَتّٰى يَصِلَ اِلٰى قَلْبِهٖ لِاَنَّ فِيْهِ اٰثَارُ مَوْلَاهُ. یعنی مجھے تعجب ہوتا ہے اس شخص پر جو جنگلوں اور بیابانوں کو طے کرتا ہوا خدا کے گھر اور اس کے حرم تک تو پہنچتا ہے صرف اس لیے کہ وہاں اس کے انبیاء کے آثار ہیں لیکن وہ اپنے نفس اور حرص وہوا کے جنگلوں کو عبور کرنے اور اپنے دل تک پہنچنے کی طرف توجہ نہیں کرتا، جس میں اس کے خدا کے آثار ہیں۔'' مطلب یہ ہے کہ بیت اللہ کا رخ کرنے سے پہلے انسان کو اپنے قلب اور اعمال کی اصلاح کی فکر کرنی چاہیے۔ جو شخص نہ اپنے دل کو حرص وہوا اور

غیر اللہ کی محبت سے پاک کرتا ہے اور نہ اپنے اعمال کو اس کے احکام اور اس کے رسول کی سنت کے تابع کرتا ہے، اس کا حج کے لیے نکلنا نمائش وریا یا محض ایک رسم کی پابندی کے طور پر تو ہو سکتا ہے، خداوند تعالیٰ کی رضا جوئی اور اس کے حکم کی تعظیم وتعمیل کے لیے نہیں ہو سکتا۔ اگر وہ خدا کے حکم کی تعظیم وتعمیل کرنے والا ہے تو اپنے دل کو حرص وہوا سے اور اپنے عمل کو خدا کی نافرمانی سے پاک کیوں نہیں کرتا۔

(۳۱) حضرت ابوبکر محمد بن عمر درّاق رحمۃ اللہ علیہ:

آپ بزرگ مشائخ اور زاہدوں میں سے ہوئے ہیں اور محمد علی ترمذی رحمۃ اللہ علیہ کے صحبت یافتہ تھے۔ آداب اور معاملات میں آپ نے بہت سی کتابیں تصنیف کیں۔ مشائخ انھیں مؤدبُ الاولیاء کہتے ہیں۔

آپ نے فرمایا ہے:

''اَلنَّاسُ ثَلٰثَةٌ: اَلْعُلَمَاءُ وَالْاُمَرَاءُ وَالْفُقَرَاءُ، فَاِذَا فَسَدَ الْعُلَمَاءُ فَسَدَ الطَّاعَةُ وَالشَّرِیْعَةُ وَاِذَا فَسَدَ الْاُمَرَاءُ فَسَدَ الْمَعَاشُ وَاِذَا فَسَدَ الْفُقَرَاءُ فَسَدَ الْاَخْلَاقُ، یعنی انسان تین گروہوں میں منقسم ہیں: ایک علماء، دوسرے امراء اور تیسرے فقراء۔ جب علماء میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے تو دین وشریعت برباد ہو جاتے ہیں۔ جب امراء میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے تو معیشت تباہ ہو جاتا ہے۔ اور جب فقراء بگڑتے ہیں تو مخلوقِ خدا کے اخلاق فاسد ہو جاتے ہیں۔''

علماء کا فساد ان کے طمع وحرص میں مبتلا ہو جانے سے پیدا ہوتا ہے۔ امراء کا فساد ان کا ظالم وجابر بن جانا ہے، اور فقراء کا بگاڑ ان کے اندر عزت وریاست کے حصول کی طلب پیدا ہو جانا ہے۔ علماء جب تک امراء وسلاطین کی صحبت اختیار نہیں کریں گے تباہ نہ ہوں گے۔ امراء جب تک علماء سے منہ نہ موڑیں گے تباہ نہیں ہو سکتے۔ اور فقراء کو جب تک عزت وریاست طلبی کی خواہش دامن گیر نہ ہو اس وقت تک تباہ نہیں ہو سکتے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ امراء وسلاطین بالعموم ظلم وستم کی راہ بے علمی کی وجہ سے اختیار کرتے ہیں۔ علماء کو طمع اور حرص ہی درباروں میں کھینچ لے جاتی ہے اور

وہاں وہ دین کو درباری مصلحتوں اور ضرورتوں کی بھینٹ چڑھانا شروع کر دیتے ہیں۔ اور فقراء میں عزت وریاست کی طمع خدا کی ذات پر بھروسہ نہ رہنے کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ بے علم سلطان، حریص عالم اور بے توکل فقیر قریب قریب شیطان کے ہوتے ہیں، اور اگر یہ تینوں بگڑ جائیں تو ساری مخلوقات بگڑ جاتی ہے۔

(۳۲) حضرت ابوحمزہ خُراسانی رحمۃ اللہ علیہ:

آپ خراسان کے قدیم مشائخ میں سے ہوئے ہیں۔ حضرت ابوسعید احمد بن خرازؒ کی آپ نے زیارت فرمائی۔ توکل علی اللہ میں آپ کا پایہ بہت بلند ہے۔

آپ کی زندگی کا مشہور واقعہ ہے کہ ایک روز جنگل میں چلتے چلتے ایک ویران کنوئیں میں گر پڑے۔ تین روز کے بعد خراز کے سیاحوں کا گروہ وہاں پر اترا۔ حضرت ابوحمزہ فرماتے ہیں کہ میرے دل میں خیال آیا کہ ان کو آواز دوں کہ مجھے کنوئیں سے باہر نکالو۔ مگر پھر فوراً خیال آیا کہ غیر سے مدد مانگنا اچھی بات نہیں ہوگی اور یہ اپنے مولا کی شکایت ہوگی کہ میرے خدا نے مجھے کنوئیں میں ڈال دیا ہے' اب تم لوگ مجھے اس سے باہر نکالو۔ اتنے میں وہ لوگ خود کنوئیں پر آئے اور آپس میں کہنے لگے کہ راستے میں کنواں ہے، کوئی روک بھی موجود نہیں، ایسا نہ ہو کہ کوئی راہ چلتا آدمی اس میں گر پڑے۔ آؤ اس کے اوپر چھت ڈال دیں اور اللہ سے اجر حاصل کریں۔ ان کی یہ باتیں سن کر میرے اوپر گھبراہٹ طاری ہوئی اور اپنی جان سے ناامید ہو گیا۔ جب ان لوگوں نے چھت ڈال دی اور واپس چلے گئے تو میں نے اللہ تعالیٰ کی مناجات شروع کر دی اور دل میں سوچ لیا کہ اب مر جاؤں گا۔ مخلوق کی طرف سے کوئی مدد پہنچنے کی طرف سے میں بالکل ناامید ہو گیا، صرف اللہ پر بھروسہ کر لیا۔ جب رات ہوئی تو چھت میں حرکت محسوس ہوئی۔ میں نے غور سے چھت کی طرف دیکھا تو کیا دیکھتا ہوں کہ چھت کو کھول کر ایک بہت بڑے اژدہا کی مانند ایک جانور چھت سے نیچے لٹک رہا ہے۔ میں نے جان لیا کہ میرے خدا نے میری نجات کا سامان فرمایا ہے۔ چنانچہ میں نے اُس کی دُم کو مضبوط پکڑ لیا اور اس نے مجھے کھینچ کر کنوئیں سے باہر نکال دیا۔

آپ سے لوگوں نے پوچھا کہ "غریب" (اجنبی) کون ہے؟ یہ سوال غالباً اس حدیث کے بارے میں تھا جس میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اسلام غریبوں میں ہی پیدا ہوا اور پھر غریبوں ہی کی طرف پلٹ جائے گا۔ اس لیے غریبوں کے لیے خوش خبری ہے...... اس پر حضرت ابوحمزہ خراسانیؒ نے جواب دیا: اَلْمُسْتَوْحِشُ مِنَ الْاَلْفِ یعنی غریب وہ ہے جو ایک اللہ کی محبت میں وحشت ودیوانگی کی حد کو پہنچ گیا ہو۔

مطلب یہ ہے کہ اسلام شروع بھی انہی لوگوں سے ہوا جو اس کی محبت میں دیوانگی کی حد کو پہنچے ہوئے تھے اور آخر میں بھی اسی طرح کے لوگوں میں رہ جائے گا۔ فصلی قسم کے اور مفاد پرست لوگ چھٹ جائیں گے اور پھر اپنی سابقہ راہوں پر پڑ جائیں گے۔

(۳۴) حضرت ابواسحٰق ابراہیم بن احمد خواص رحمۃ اللہ علیہ:

آپ توکل میں بہت بڑی شان رکھتے ہیں۔ اپنے زمانے کے بہت سے مشائخ سے آپ نے ملاقات فرمائی۔

آپؒ نے فرمایا: "اَلْعِلْمُ کُلُّهٗ فِیْ کَلِمَتَیْنِ: لَاتَتَکَلَّفْ فِیْ مَاکُفِیْتَ وَلَاتُضَیِّعْ مَااسْتُکْفِیْتَ، یعنی سارا علم ان دوکلموں میں ہے: ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ نے جس چیز کا اندیشہ تیرے دل سے نکال دیا ہے اس کے لیے تو فکر مند نہ ہو۔ اور دوسرے یہ کہ جس چیز کا کرنا اس نے تیرے لیے لازم اور فرض کر دیا ہے اسے ضائع نہ کر۔" مطلب یہ ہے کہ جہاں تک تیرے رزق اور تیری اچھی اور بری تقدیر کا تعلق ہے ان کو تو اللہ تعالیٰ نے ازل ہی میں طے کر دیا ہے اس لیے اُن کے متعلق اب تجھے کسی فکر میں پڑنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ کیونکہ تیرے فکروترڈد سے نہ ان کے بہتر ہو جانے کا کوئی سوال ہے اور نہ تیرے کسی مخالف کی کوشش سے ان کے بگڑ جانے کا کوئی اندیشہ ہے۔ تجھے اس زندگی میں جس بات کے لیے فکر مند اور متردّد ہونا چاہیے وہ ان فرائض اور واجبات کی انجام دہی اور ان منہیات کا سدِّ باب ہے جن کا اللہ تعالیٰ نے تجھے حکم دیا ہے، کیونکہ ان کے لیے تجھ سے باز پرس کی جائے گی۔ تیری زندگی کا ہر لمحہ اس تردّد میں گزرنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی

حکم ضائع نہ ہو۔ چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اِنَّ اَحَدًا لَنْ يَمُوْتَ حَتّٰى يَسْتَكْمِلَ رِزْقَهُ فَاجْمِلُوْا فِي الطَّلَبِ. (المصفٰی: ص ۲۴۴) یعنی اطمینان رکھو کہ کوئی شخص اپنا پورا رزق پائے بغیر نہیں مرے گا، اس لیے اپنے رزق کے حصول میں کوئی ناز یبا طریقہ نہ اختیار کرو۔''

آپؒ سے لوگوں نے اپنی زندگی کا عجیب واقعہ بیان کرنے کے لیے عرض کیا تو آپ نے فرمایا کہ میں نے اللہ عزوجل سے دعا کی کہ یا الہ العالمین! مجھے ایک اچھا رفیق عطا فرما۔ اس کے بعد خضر علیہ السلام میرے پاس آئے اور انھوں نے میری صحبت کی خواہش کی۔ لیکن میں حق جَلَّ وَعَلَا سے ڈرا کہ کہیں اس کی ذات کے سوا کسی اور پر بھروسہ نہ ہو جائے اور خدا پر میرے توکل میں کمی نہ واقع ہو جائے اور میں فرض کو ترک کر کے نفلوں کو ادا کرنے والا نہ ہو جاؤں۔ اس لیے میں نے خضر علیہ السلام کی درخواست قبول نہ کی۔

یہ لطیف اشارہ ہے اس طرف کہ حضرت خضر علیہ السلام چونکہ تبلیغ اور اقامت حق کی سعی سے الگ ہو کر انفرادی ذکر و فکر میں مشغول ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ ان کی صحبت میں رَہ کر میں بھی اسی راہ پر چل دوں۔ حالانکہ ہم بندوں کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ تبلیغ اور اقامتِ حق کے فرض سے غافل اور الگ ہو کر جنگلوں اور بیابانوں میں چھپے گیان و دھیان میں لگے رہیں۔

(۳۴) حضرت ابوحمزہ بغدادی بزاز رحمۃ اللہ علیہ:

آپ حارث محاسبیؒ کے مرید اور سرّی سقطیؒ کی صحبت میں پرورش پائے ہوئے تھے۔ حضرت نوریؒ اور خیر نسّاجؒ کے ہم عصر تھے۔ اور حضرت نوریؒ کے ابتلاء کے زمانے میں ان کے ساتھ رہے۔ تفسیر اور قرأت میں عالم تھے۔ اور بغداد میں مسجدِ رصافہ میں وعظ فرمایا کرتے تھے۔

آپ فرماتے ہیں: ''اِذَا سَلِمَتْ مِنْكَ نَفْسُكَ فَقَدْ اَدَّيْتَ حَقَّهَا وَاِذَا اَسْلَمَ مِنْكَ الْخَلْقُ قَضَيْتَ حُقُوْقَهُمْ، یعنی جب تیرے جسم نے تجھ سے سلامتی پائی تو سمجھ لے کہ تو نے اس کا حق ادا کر دیا۔ اور جب مخلوق تیری طرف سے برائی سے محفوظ ہوگئی تو تو نے اس کا حق ادا

کردیا۔'' مطلب یہ ہے کہ انسان کے ذمے حقوق کی دو قسمیں ہیں۔ ایک اس کے اپنے نفس کا حق اور دوسرے مخلوق کا حق۔ جب اُس نے اپنے نفس کو برے کاموں سے ہٹا کر دنیا میں ہلاکت اور آخرت میں خدا کے عذاب سے بچالیا تو نفس کا جو حق اس پر تھا وہ اس نے پورا پورا اَدا کر دیا۔ اور جب مخلوقِ خدا کو آدمی نے اپنی طرف سے برائی سے مامون اور بے خوف کر دیا تو اس نے مخلوق کا حق بھی اَدا کر دیا۔

(۳۵) حضرت ابو محمد سہل بن عبداللہ تستری رحمۃ اللہ علیہ:

آپؒ وقت کے پیر تھے اور صوفیوں کے سُہیلیہ گروہ کے پیشوا ہیں۔ ریاضت، مجاہدے اور عیبوں کے مٹانے میں آپ بلند مرتبہ رکھتے ہیں۔ تمام لوگوں کے نزدیک قابل تعریف تھے۔ آپ کا کلام بہت سَہل اور آسان ہے۔ اسی سے بعض علماء ظاہر نے ان کے بارے میں کہا ہے کہ: ''هُوَ جَمَعَ بَيْنَ الشَّرِيْعَةِ وَالْحَقِيْقَةِ، یعنی یہ کہ یہ وہ شخص ہے جس نے شریعت اور حقیقت کو جمع کر دیا ہے۔'' حالانکہ شریعت اور حقیقت دو الگ چیزیں نہیں ہیں۔ بلکہ ایک ہی چیز کے دو پہلو ہیں۔ نہ شریعت کے بغیر حقیقت کوئی شے ہے اور نہ حقیقت کے بغیر شریعت کوئی شے ہے۔ دونوں لازم وملزوم ہیں۔ شریعت کے بغیر حقیقت بے دینی اور حقیقت کے بغیر شریعت نفاق وریا کاری ہے۔ لیکن ابو محمد سہلؒ نے اس بات کو عام لوگوں کے ذہن سے بہت قریب اور سہل انداز میں بیان کیا۔ اس لیے لوگوں نے کہا کہ انھوں نے شریعت اور حقیقت کو اکٹھا کر دیا ہے۔

آپ نے فرمایا: ''مَاطَلَعَتِ الشَّمْسُ وَلَا غَرَبَتْ عَلٰى وَجْهِ اَهْلِ الْاَرْضِ اِلَّا وَهُمْ جُهَّالٌ بِاللّٰهِ اِلَّا مَنْ يُّؤْثِرُ اللّٰهَ عَلٰى نَفْسِهٖ وَزَوْجِهٖ وَدُنْيَاهُ وَاٰخِرَتِهٖ، یعنی ہر سورج جو طلوع ہوتا ہے اور غروب ہوتا ہے اس کے ساتھ اہل زمین خداوند تعالیٰ سے زیادہ ہی زیادہ بے خبر ہوتے چلے جا رہے ہیں، بجز ان خوش نصیبوں کے جنھوں نے اللہ تعالیٰ کو اپنے آپ، اپنے اہل وعیال اور اپنی دنیا وآخرت سب پر مقدم کر لیا ہے۔''

(۳۶) حضرت ابوعبداللہ محمد بن علی حکیم ترمذی رحمۃ اللہ علیہ:

آپؒ بڑے دبدبے والے شیخ المشائخ ہوئے ہیں۔ مختلف فنونِ علم میں صاحب کمال اور امام ہیں۔ میرے شیخ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ محمد ترمذی ایک دُرِّ یتیم ہے جس کی مثال زمانہ نہیں رکھتا۔ تصوف کے علاوہ علوم شریعت میں بھی آپ کی کتابیں ہیں۔ احادیث میں آپ کی اسناد اعلیٰ پایہ کی ہیں۔ میں ان کی کتب ختم الولایت، نوادر الاصول اور کتاب النہج اور دوسری کتابوں کا شیدا ہوں۔ تفسیر بھی انھوں نے لکھنی شروع کی، مگر عمر نے وفا نہ کی۔ بہرحال جس قدر آپ نے لکھی وہ اہل علم میں پھیل گئی۔ فقہ آپ نے امام ابوحنیفہؒ کے شاگردوں میں سے ایک شاگرد سے حاصل کی۔

آپؒ نے فرمایا: "مَنْ جَهِلَ بِاَوْصَافِ الْعُبُوْدِيَّةِ يَكُوْنُ اَجْهَلَ بِاَوْصَافِ الرُّبُوْبِيَّةِ وَمَنْ لَمْ يَعْرِفْ طَرِيْقَ مَعْرِفَةِ النَّفْسِ لَمْ يَعْرِفْ طَرِيْقَ مَعْرِفَةِ الرَّبِّ بِاَنَّ الظَّاهِرَ مُتَعَلِّقٌ بِالْبَاطِنِ وَالتَّعَلُّقُ بِالظَّاهِرِ بِلَا بَاطِنٍ مُحَالٌ وَدَعْوَى الْبَاطِنِ بِلَا ظَاهِرٍ مُحَالٌ. فَمَعْرِفَةُ اَوْصَافِ الرُّبُوْبِيَّةِ فِيْ تَصْحِيْحِ اَرْكَانِ الْعُبُوْدِيَّةِ وَلَا يَصِحُّ ذَالِكَ اِلَّا بِالْاَدَبِ. یعنی جو شخص بندگی کے اوصاف (شریعت) سے بے خبر ہے وہ اللہ تعالیٰ کے اوصاف (طریقت) سے اور بھی بے خبر (اَجْہَل) ہوگا۔ اور جو اپنے آپ کو پہچاننے کا طریقہ نہیں جانتا وہ خداوند تعالیٰ کی معرفت کا طریقہ بھی ہرگز نہیں جانتا۔ کیونکہ ظاہر باطن سے متعلق ہے اور ظاہر سے تعلق باطن کے بغیر امر محال ہے، اور ظاہر میں فرمانبرداری کے بغیر باطن کا دعویٰ جھوٹ ہے۔ جان لو کہ خداوند تعالیٰ کے اوصاف کی معرفت کا مدار بندگی کے ارکان کی صحت پر ہے اور یہ صحت ادب (احکامِ شریعت کی ٹھیک پابندی) کے بغیر نہیں حاصل ہوسکتی۔"

اپنے اس ارشاد میں حضرت ترمذیؒ نے جن باتوں کو واضح فرمایا ہے وہ یہ ہیں:

۱۔ خداوند تعالیٰ اور اس کے اوصاف کی معرفت کا قدم اوّل یہ ہے کہ بندہ اپنی حیثیت، اپنے مقام اور اپنے حدود کو جانے۔ اگر وہ ان کو نہیں جانتا تو خداوند تعالیٰ اور اس کے اوصاف سے وہ جاہل ہی نہیں بلکہ اَجْہَل ہوگا۔ اپنی حیثیت اور اپنا مقام اور اپنی حدود اسے شریعتِ الٰہی سے

معلوم ہوں گی۔ لہٰذا طریقت کی طرف پہلا قدم علمِ شریعت کا حصول ہے۔

۲۔ جو شخص یہ نہیں جانتا کہ اپنے نفس کی معرفت کا طریقہ کیا ہے اور خدا کی معرفت کی باتیں کرتا ہے وہ بغیر علم کے باتیں بنا رہا ہے۔ پہلے تمہیں اپنے حدودِ اربعہ معلوم ہونے چاہئیں۔ اس کے بعد معرفتِ الٰہی کا راستہ ملے گا۔ اور ان کو معلوم کرنے کا طریقہ شریعتِ الٰہی کو جاننا ہے۔

۳۔ ظاہر میں انسان سے جو کچھ ظہور میں آتا ہے وہ اس کے باطن ہی کا مظہر اور عکس ہوتا ہے۔ اس لیے اگر ظاہر میں خداوند تعالیٰ کے فرمان کی تعظیم اور فرمانبرداری نہیں ہے تو باطن میں حق تعالیٰ کی معرفت اور طریقت کا دعویٰ بے بنیاد ہے۔ امرِ محال ہے کہ باطن میں خداوند تعالیٰ کی معرفت موجود ہو اور پھر ظاہر میں اس کے فرمان کی تعظیم اور فرمانبرداری ظاہر نہ ہو۔

۴۔ ظاہر میں ارکانِ بندگی (احکامِ شریعت کی پابندی) کا جس قدر اہتمام ہوگا اسی درجے کی باطن میں خداوند تعالیٰ کی معرفت موجود ہوگی۔

(۳۷) حضرت ابوسعید احمد بن خراز رحمۃ اللہ علیہ:

آپ خراز یہ گروہ کے صوفیاء کرام کے پیشوا ہیں۔ آپ نے حضرت بشر حافی اور سرّی سقطی رحمہما اللہ سے فیض حاصل کیا اور حضرت ذوالنون مصریؒ کو بھی پایا۔ آپ کا کلام اور رمزیں بلند اور تصانیف روشن اور چمکنے والی ہیں۔ آپ نے فنا اور بقا کی اصطلاحات میں کلام کیا ہے۔

آپ سے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال میں آیا ہے: ''جُبِلَتِ الْقُلُوْبُ عَلٰی حُبِّ مَنْ اَحْسَنَ اِلَیْھَا، قَالَ وَعَجَبًا لِمَنْ لَمْ یَرَ مُحْسِنًا غَیْرَ اللّٰہِ کَیْفَ لَا یَمِیْلُ بِکُلِّیَّتِہٖ اِلَی اللّٰہِ. یعنی اللہ تعالیٰ نے قلوب کو اس وصف پر پیدا فرمایا ہے کہ جو ان پر احسان کرتا ہے وہ لازماً اس کی طرف محبت کے ساتھ مائل ہوتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ مجھے اس دل پر تعجب ہوتا ہے جو خداوند تعالیٰ کے سوا کسی کو اپنا محسن نہیں دیکھتا، پھر وہ کیسے پورے کا پورا اس کی طرف نہیں جھک پڑتا۔''

فی الحقیقت یہ ایک عجیب بات ہے کہ انسان ہی نہیں حیوان بھی احسان اور مروّت سے پیش

آنے والے مُحسن کا گرویدہ ہو جاتا ہے، اور کم ہی انسان ہوں گے جو خداوند تعالیٰ کے مُحسنِ حقیقی ہونے کا اعتراف نہ کریں۔ لیکن اس کے باوجود جس احسان فراموشی ہی کی نہیں جس نمک حرامی اور ڈھٹائی کی روش وہ اللہ تعالیٰ کے مقابلہ میں اختیار کیے ہوئے ہیں اور ساری عمر اختیار کیے رکھتے ہیں حیرت انگیز اور فہم سے بالا ہے۔ ایسے مُحسنِ بے پایاں کی نمک حرامی کی سزا جہنم کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے۔

(۳۸) حضرت ابوالعباس احمد بن مسروق رحمۃ اللہ علیہ:

آپ ”خراسان کے جلیل القدر بزرگوں میں سے ہوئے ہیں۔ آپ نے چالیس بزرگوں کی خدمت کر کے ان سے فیض حاصل کیا۔ تمام اولیاء (اہل اللہ) کا اتفاق ہے کہ آپ زمین کے اوتاد میں سے ایک اَوْتَدْ ہیں۔ ظاہری اور باطنی علوم (شریعت اور طریقت) میں کمال کے درجے کو پہنچے ہوئے تھے۔

آپ نے فرمایا: ”مَنْ کَانَ سُرُوْرُہٗ بِغَیْرِ الْحَقِ فَسُرُوْرُہٗ یُوْرِثُ الْھُمُوْمَ وَمَنْ لَمْ یَکُنْ اُنْسُہٗ فِیْ خِدْمَۃِ رَبِّہٖ فَاُنْسُہٗ یُوْرِثُ الْھُمُوْمَ وَمَنْ لَمْ یَکُنْ اُنْسُہٗ فِیْ خِدْمَۃِ رَبِّہٖ فَاُنْسُہٗ یُوْرِثُ الْوَحْشَۃَ، یعنی جس شخص کی خوشی اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کے ساتھ ہو وہ جان لے کہ اس کی یہ خوشی اسے ہمیشگی کا غم ورثہ میں چھوڑنے والی ہے، اور جس شخص کی محبت اپنے رب کی نوکری اور ملازمت کے سوا کسی اور شے سے ہو تو وہ جان لے کہ اس کی یہ محبت اسے ہمیشگی کی وحشت اور پریشانی کا ورثہ دینے والی ہے۔“ کیونکہ حق تعالیٰ کے سوا جس کے ساتھ بھی وہ مسرور ہے اور محبت رکھتا ہے وہ سب فانی ہیں۔ ان کے فنا ہو جانے کے بعد پھر وہ اس کے لیے ہمیشگی کے غم اور وحشت و پریشانی کے سوا اور کچھ اپنے پیچھے نہ چھوڑیں گے۔ پس دانش مندی کا تقاضا یہ ہے کہ آدمی خداوند تعالیٰ کے ساتھ خوش رہنے کی عادت اور اس کی خدمت و ملازمت کے ساتھ انس و محبت پیدا کرے اور انہی کے ساتھ انس و محبت رکھے کہ ہمیشگی اُسی کے لیے ہے۔

(۳۹) حضرت ابوعلی بن حسن بن علی جوزجانی رحمۃ اللہ علیہ:

آپؒ حضرت محمد بن علی ترمذیؒ کے مرید اور حضرت ابوبکر دراقؒ اور ابراہیم سمرقندیؒ کے پیر تھے۔ آدمی کے دین اور اخلاص فی الدین کو جو آفات لاحق ہوتی ہیں ان کو فوراً جان لینے اور معاملات کے علم میں آپ کو کمال حاصل تھا۔

آپؒ نے فرمایا: ''اَلْخَلْقُ كُلُّهُمْ فِيْ مَيَادِيْنِ الْغَفْلَةِ يَرْكُضُوْنَ وَعَلَى الظُّنُوْنِ يَعْتَمِدُوْنَ وَعِنْدَهُمْ اَنَّهُمْ فِي الْحَقِيْقَةِ يَتَقَلَّبُوْنَ وَعَنِ الْمُكَاشِفَةِ يَنْطِقُوْنَ، یعنی ساری کی ساری مخلوق محض ظن اور گمان پر اعتماد کر کے بھاگی چلی جا رہی ہے اور اپنے نزدیک یہ سمجھ رہے ہیں کہ وہ حقیقت پر ہیں اور جو کلام کر رہے ہیں وہ کشف سے کر رہے ہیں۔''

آپؒ کے اس ارشاد کا اشارہ جاہل پیروں، صوفیوں اور پیشوایانِ طریقت کی طرف ہے کہ جو علم یقینی اور قطعی ہے، یعنی خدا کی کتاب اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اس کو تو نہ جانتے ہیں اور نہ ان کی طرف رجوع کرتے ہیں، محض اٹکل پچو اور ظن وگمان پر مبنی ادھر ادھر سے کچھ باتیں لے کر اور کچھ اپنے ذہن سے بنا کر سمجھ رہے ہیں کہ انھوں نے حقیقت کو پالیا ہے اور جو کچھ وہ کہہ رہے ہیں یہ ان کو کشف سے معلوم ہوا ہے۔ حالانکہ شریعتِ الٰہی کے سوا جو کچھ بھی ہے اس کے صحیح یا غلط ہونے کی کسوٹی اللہ کی شریعت ہی ہے، لیکن اس کی طرف سے یہ غافل ہیں۔

(۴۰) حضرت ابومحمد بن حسین حریری رحمۃ اللہ علیہ:

آپؒ علمِ اصول میں مہارت رکھتے تھے اور فقہ میں وقت کے امام تھے۔ تصوف میں آپ کا یہ مرتبہ تھا کہ حضرت جنیدؒ کی وفات کے بعد آپ ان کے جانشین ہوئے۔

آپؒ نے فرمایا: ''دَوَامُ الْاِيْمَانِ وَقِوَامُ الْاَدْيَانِ وَصَلَاحُ الْاَبْدَانِ فِيْ ثَلٰثَةِ خِصَالٍ: اَلْاِكْتِفَاءُ وَالْاِتِّقَاءُ وَالْاِحْتِمَاءُ. فَمَنْ اِكْتَفٰى بِاللّٰهِ صَلُحَتْ سَرِيْرَتُهٗ وَمَنِ احْتَمَا مَالَمْ يُوَفِّقْهُ اِرْتَاضَتْ طَبِيْعَتُهٗ. فَثَمَرَةُ الْاِكْتِفَاءِ صَفْوُ الْمَعْرِفَةِ وَعَاقِبَةُ الْاِتِّقَاءِ حُسْنُ الْخَلِيْقَةِ وَغَايَةُ الْاِحْتِمَاءِ اِعْتِدَالُ الطَّبِيْعَةِ. یعنی ایمان کا دوام اور دین کا قیام اور

بدن کی اصلاح کا انحصار تین چیزوں پر ہے۔ ایک اکتفی (قناعت) دوسری اتقاء (پرہیز گاری) اور تیسری احتماء (غذا پر نگاہ رکھنا)۔ پس جو اللہ تعالیٰ پر اکتفاء کرلے گا اور اسے کافی سمجھ کر اس پر قناعت کرلے گا، اس کی نیت اور خدا سے اس کا معاملہ درست ہو جائے گا۔ کیونکہ اس سے اللہ تعالیٰ کی صحیح معرفت حاصل ہو جائے گی۔ اور جو خداوند تعالیٰ کی منع کردہ چیزوں سے رُک جائے گا اُس کی سیرت بھی درست اور مضبوط ہو جائے گی۔ اور جو کھانے میں اپنے غیر موافق چیزوں سے بچے گا اس کی طبیعت ریاضت (ہر قسم کی محنت اور مشقت) قبول کرنے کے لیے تیار ہو جائے گی۔ چنانچہ اکتفاء کا ثمرہ خداوند تعالیٰ کی معرفت کا خرابیوں سے پاک ہو جانا ہے۔ اور اتقاء کا انجام حسن خلق ہے اور غذا میں احتیاط برتنے کا نتیجہ تندرستی اور طبیعت کا اعتدال ہے۔'' انسان کے باطن اور اس کے اعمال کا اثر خود اس کے جسم پر جو پڑتا ہے اس کے متعلق حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مَنْ کَثُرَ صَلَاتُهُ بِاللَّيْلِ حَسُنَ وَجْهُهُ بِالنَّهَارِ. یعنی جو شخص راتوں کو بہت نماز پڑھتا ہے اس کا چہرہ دن میں بہت چمکتا ہے۔'' اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''نُوْرُهُمْ يَسْعٰى بَيْنَ اَيْدِيْهِمْ وَبِاَيْمَانِهِمْ (٦٦:٨) یعنی قیامت کے دن ان کی یہ شان ہوگی کہ ان کا نور ان کے آگے آگے اور دائیں دوڑ رہا ہوگا۔'' اور فرمایا: ''وُجُوْهُهُمْ نُوْرٌ عَلٰى مَنَابِرَ مِنْ نُوْرٍ. یعنی ان کے چہرے سراپا نور ہوں گے اور وہ نور کے تختوں پر بیٹھے ہوں گے۔'' اور ان چیزوں کے حصول کا جو راستہ ہے اسے حضرت حریریؒ نے نہایت اختصار اور بہت خوبصورت انداز میں بیان فرمادیا ہے۔

(۴۱) حضرت ابوبکر محمد بن موسیٰ واسطی رحمۃ اللہ علیہ:

آپ اپنے فن میں امام، بلند حال اور لطیف کلام ہوئے ہیں۔ حضرت جنیدؒ کے قدیم مصاحبوں میں سے تھے۔ محقق مشائخ میں سے تھے، اور تمام مشائخ کے نزدیک قابل تعریف تھے۔ کئی شہروں میں آپ گئے لیکن لوگوں نے آرام نہ لینے دیا۔ پھر آپ مَرو میں تشریف لائے جہاں کے لوگ نسبۃً لطیف طبع اور نیک عادت تھے۔ ان لوگوں نے آپ کو قبول کیا اور آپ کے وعظ سے فیض یاب ہوئے۔ چنانچہ آپ نے اپنی بقیہ عمر وہیں بسر کی۔

آپؒ نے فرمایا: ''اَلذَّکِرُ فِیْ ذِکْرِہٖ اَکْثَرُ غَفْلَۃً مِّنَ النَّاسِ لِذِکْرِہٖ. یعنی بسا اوقات ذکر کرنے والا اپنے ذکر کے دوران اپنے ذکر سے سب لوگوں سے بڑھ کر غافل ہوتا ہے۔'' مطلب یہ ہے کہ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ آدمی زبان سے تو ذکر کر رہا ہوتا ہے، لیکن جہاں تک ذکر کے معنی و مفہوم، اس کے مقتضیات و اثرات کا تعلق ہوتا ہے ان کی طرف اس کی کوئی توجہ نہیں ہوتی اور دل کسی اور ہی طرف مشغول ہوتا ہے۔ بلکہ یہ تک ہوتا ہے کہ جو کام اور مشغولیتیں اس ذکر کے منافی اور اس کی ضد ہوتی ہیں، ذاکر ان میں مصروف ہوتا ہے۔[1] اور یہ چیز بندے کے لیے بہت بڑی آفت ہے۔ اگر آدمی حدود اللہ کو ملحوظ رکھے اور اس کا زبان سے ذکر نہ کرے تو اس میں کچھ حرج نہیں کہ ذکر کا اصل مقصود خداوند تعالیٰ کی مقرر کردہ حدود کی محافظت ہی ہے۔ حرج اور ہلاکت کی بات یہ ہے کہ آدمی اس کے نام کے ذکر اور زبان سے اس کی یاد میں لگا ہوا ہو۔ لیکن جس کا ذکر اور جس کی یاد کر رہا ہے اُسی کو بھولے ہوئے ہو۔ یعنی ذکر موجود ہے اور مذکور غائب ہے۔

(۴۲) حضرت ابوبکر بن دَلف بن جَحدر شبلی المعروف ابوبکر شبلی رحمۃ اللہ علیہ:

آپ قوم کے بزرگ اور طریقت کے سردار ہوئے ہیں۔ ابتداء میں خلیفہ کے درباریوں کے افسر اعلیٰ تھے اور حضرت جنیدؒ کے ارادتمندوں میں شامل تھے۔ آپ نے توبہ خیر النساج کی مجلس میں کی۔

آپ نے قُلْ لِّلْمُؤْمِنِیْنَ یَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِھِمْ (۳۰:۲۴) کی تفسیر میں فرمایا: اَیْ اَبْصَارِ الرُّءُوْسِ عَنِ الْمَحَارِمِ وَاَبْصَارِ الْقُلُوْبِ عَمَّا سِوَی اللہِ، یعنی اے نبیؐ! مومنین کو ہمارا یہ حکم پہنچا دو کہ اپنے سر کی آنکھوں کو نیچی رکھیں اور ان سے غیر محرم عورتوں کو نہ دیکھیں اور اپنے دل کی آنکھوں سے اللہ کے سوا کسی اور کی طرف نہ دیکھیں۔ کیونکہ آدمی خدا کی نافرمانی اسی وقت کرتا ہے جب کہ اس کے دل کی آنکھیں خداوند تعالیٰ سے ہٹ کر کسی اور نظارہ میں محو ہوتی ہیں۔

[1] آپ کو یہ معلوم کر کے شاید تعجب ہو کہ آج کل (۱۹۶۲ء) میرے ہاں (سیکیورٹی وارڈ سنٹرل جیل منٹگمری میں) صفائی کے لیے جو مشقتی متعین ہے وہ حافظ قرآن ہے اور چوری کے جرم میں دوسری مرتبہ قید ہو کر آیا ہوا ہے۔ مالی کے کام کے لیے ایک شخص آتا ہے جو بظاہر نہایت متدین، نمازی اور پرہیزگار آدمی معلوم ہوتا ہے، لیکن اغوا کے مقدمہ میں ماخوذ ہے۔ (مرتب)

آپؒ بیان فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں بازار سے گزر رہا تھا کہ ایک جماعت نے کہا: ھٰذا مَجْنُوْنٌ، یعنی وہ دیکھو، پاگل جارہا ہے۔ میں نے ان کے جواب میں کہا: ''اَنَا عِنْدَکُمْ مَجْنُوْنٌ وَاَنْتُمْ عِنْدِیْ اَصِحَّاءُ فَزَادَ لِیَ اللّٰہُ فِیْ جُنُوْنِیْ وَزَادَکُمْ فِیْ صِحَّتِکُمْ، یعنی میں تمھارے نزدیک دیوانہ ہوں اور تم میرے نزدیک تندرست ہو، اچھا اللہ میری اس دیوانگی کو اور بڑھائے اور تمھاری صحت میں اضافہ فرمائے۔'' کیونکہ ان لوگوں نے آپ کو دیوانہ آپ کی خداوند تعالیٰ کے ساتھ دیوانگی کی حد تک بڑھی ہوئی محبت وگرویدگی کی وجہ سے کہا تھا۔ آپ نے فرمایا کہ بھائیو! میں اس دیوانگی سے 'شفاء' کا طلب گار نہیں۔ میں تو یہ دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ میرے اس جنون کو اور بڑھائے۔

(۴۳) حضرت ابو محمد بن جعفر بن نصیر خالدی رحمۃ اللہ علیہ:

آپؒ حضرت جنیدؒ کے اصحاب کبار سے ہیں۔ تصوف کے فنون میں سمندر ہیں۔ نفس کی رعونت ترک کرنے میں آپ کا مقام بہت بلند ہے۔ چنانچہ آپ نے اپنی بہت سی عمدہ باتیں دوسروں کی طرف منسوب کردی ہیں اور دوسروں کے حوالہ سے کہی ہیں۔ حالانکہ بہت سے لوگ دوسروں کی باتیں چرا کر اپنی طرف منسوب کر لیتے ہیں۔

آپ کے بارے میں روایت ہے کہ آپ نے فرمایا: ''اَلتَّوَکُّلُ اِسْتِوَاءُ الْقَلْبِ عَنِ الْوُجُوْدِ وَالْعَدَمِ، یعنی توکل اس چیز کا نام ہے کہ آدمی کے لیے وسائل رزق وآسائش کا ہونا اور نہ ہونا برابر ہو جائے۔'' نہ ان وسائل کی موجودگی اور اضافے سے اسے خوشی ہو اور نہ ان کے عدم یا ان میں کمی سے کوئی غم ہو۔ اس لیے کہ تیرا بدن خدا کی مِلک ہے۔ وہ جس طرح سے چاہے اس پر تصرّف فرمائے۔ جو چاہے اور جتنا چاہے اس کو دے اور جس چیز سے اور جس حد تک چاہے اس سے اس کو محروم کردے۔ تمھیں اس میں دخل دینے کا کیا اختیار ہے۔ تمھیں اس مِلک کو اس کے مالک کے سپرد کرکے اپنے تصرّف سے قطعی طور پر دست بردار ہو جانا چاہیے۔

آپ (ابو محمد بن جعفرؒ) بیان کرتے ہیں کہ میں جنیدؒ کے پاس آیا۔ میں نے دیکھا کہ آپ

بخار کی وجہ سے تکلیف میں مبتلا ہیں۔ میں نے عرض کیا: اے استاد! حق تعالیٰ سے دعا فرمایئے کہ وہ آپ کو اس بیماری سے شفا عطا فرمائے۔ آپ نے فرمایا: میں نے کل عرض کی تھی۔ اس کا مجھے یہ جواب ملا کہ تمھارا بدن ہماری مِلک ہے، ہمیں اختیار ہے کہ چاہیں تو اسے تندرست رکھیں اور چاہیں تو اسے بیمار رکھیں، تو ہمارے اور ہماری مِلک کے معاملات میں دخل دینے والا کون ہے۔ اپنا تصرّف اس سے منقطع کرلو تاکہ تمھارا شمار ہمارے بندوں میں ہو۔

(۴۴) حضرت ابوعلی محمد بن قاسم رَودباری رحمۃ اللہ علیہ:

آپ کا شمار جوانمرد صوفیوں اور تصوف کے سپاہیوں میں ہے۔ آپ کا تعلق شاہی خاندان سے تھا۔ معاملات میں آپ بڑی شان رکھتے ہیں۔

آپ نے فرمایا: اَلْمُرِیْدُ لَا یُرِیْدُ لِنَفْسِہٖ اِلَّا مَا اَرَادَ اللّٰہُ لَہٗ وَالْمُرَادُ لَا یُرِیْدُ مِنَ الْکَوْنَیْنِ شَیْئًا غَیْرَہٗ. یعنی مرید (منزل کو پہنچنے کا طالب) وہ ہوتا ہے جو اپنے لیے کوئی چیز نہ چاہے مگر وہی چیز جو اللہ تبارک وتعالیٰ اس کے لیے پسند فرمائے۔ اور مراد (منزل کو پہنچا ہوا) وہ ہوتا ہے جو دونوں جہانوں میں اللہ تبارک وتعالیٰ کے سوا کسی اور شے کو نہ چاہے۔ مطلب یہ ہے کہ انسان کو اپنے ارادے اور اپنی پسند کو خداوند تعالیٰ کے ارادے اور اس کی پسند کے ساتھ راضی رکھنا چاہیے۔ یہ مریدوں (خداوند تعالیٰ کی رضا کو پہنچنے کے طلبگاروں) کے لیے ابتدائی مقام ہے۔ جب مرید مراد کو پالیتا ہے تو پھر اس کے اندر دونوں جہانوں میں سے بجز خداوند تعالیٰ کی ذات کے کسی شے کی طلب باقی نہیں رہتی ہے۔

(۴۵) حضرت ابوالعباس قاسم بن مہدی سیّاری رحمۃ اللہ علیہ:

آپ صوفیوں کے فرقہ سیّاریہ کے پیشوا ہیں۔ آپ کو توحید کا خزانہ کہا گیا ہے۔ وقت کے امام تھے۔ شریعت اور حقیقت دونوں میں آپ کا علمی پایہ بہت بلند تھا۔ آپ کی تصانیف قابل تعریف ہیں۔ بہت سے مشائخ سے آپ نے ادب حاصل کیا۔ حضرت ابوبکر واسطیؒ کی صحبت میں بھی رہے۔ آپ کا کلام بلند مرتبہ ہے۔

آپ نے فرمایا: ''اَلتَّوْحِیْدُ اَنْ لَّا یَخْطُرَ بِقَلْبِکَ مَادُوْنَ تَوْحِیْدِ. یعنی توحید یہ ہے کہ ماسوا توحید کے اور کسی چیز کا گزر دل پر نہ ہو'' ظاہر ہے کہ جب دل پر توحید کے سوا کسی چیز کا گزر نہ ہوگا تو انسان کی زندگی کے کسی گوشے میں بھی توحید کے سوا کسی اور شے کا گزر نہ ہو سکے گا۔ انسان کے جو کچھ دل میں ہوتا ہے وہی اس کے عمل کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ اور جو کچھ اس کے عمل میں ظاہر ہوتا ہے وہی دراصل اس کے دل میں ہوتا ہے۔

توحید کو اختیار کرنے کے معنی ہی یہ ہیں کہ انسان کی زندگی کے کسی گوشے میں توحید سے تضاد نہ باقی رہے۔ اس کے عقیدہ، اس کے اقوال، اس کے اخلاق، اس کے کردار، اس کے افعال، اس کے معاملات، اس کے تعلقات سب میں خداوند تعالیٰ کی توحید، اسی کا حکم اور اسی کی رضا جاری وساری ہو۔ کسی گوشے میں بھی خدا کے سوا کسی اور کا دخل باقی نہ رہے۔ اور یہ اسی طرح ہو سکتا ہے کہ انسان کے دل پر توحید کا پورا غلبہ اور قبضہ ہو اور وہ اس پر اس طرح سے چھا جائے کہ توحید کے سوا کوئی اور شے اس کے قریب بھی نہ پھٹکنے پائے۔ جب دل جو سب فکر و عمل کا سرچشمہ اور محرک ہے، اس کی یہ کیفیت ہو جائے گی تو ساری زندگی آپ سے آپ توحید کے رنگ میں رنگ جائے گی۔

آپ (حضرت سیاریؒ) کے بارے میں بیان کیا گیا ہے کہ مَرو کے باشندوں میں سے کوئی شخص دولت اور مرتبے میں آپ سے بڑھ کر نہ تھا۔ بہت بڑی جائیداد اور دولت اپنے والد بزرگوار سے ورثہ میں پائی تھی۔ لیکن یہ سب کچھ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دو بالوں کے عوض دے کر حضورؐ کے دو بال خرید لیے، اور فرماتے ہیں کہ مجھے جو کچھ ملا اور ان دو بالوں کی برکت سے ملا۔ جب آپؒ دنیا سے رخصت ہوئے تو فرمایا: ان دو بالوں کو میرے منہ میں رکھ دینا۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔ آپؒ کا مزار مَرو میں ہے اور مرجع خلائق ہے۔

(۴۶) حضرت ابوعبداللہ محمد بن خفیف شیرازی رحمۃ اللہ علیہ:

آپ صوفیاء کے خفیفیہ گروہ کے پیشوا ہیں۔ آپ شاہی خاندان سے تھے۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے توبہ کی توفیق عطا کی اور بادشاہی ترک کر کے حق تعالیٰ کی ملازمت میں داخل ہو گئے۔ ان کی

تصانیف سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے ابن عطاؒ اور شبلیؒ اور حسین بن منصورؒ اور حریری رحمہم اللہ کی صحبتوں سے فیض حاصل کیا۔ آپ نے سفر بہت کیے اور بے شمار بزرگوں سے ملاقات کی۔ اور شاید اسی وجہ سے مجرّد رہے۔ شادی آپ نے نہیں کی۔ تمام علوم میں بڑا درجہ رکھتے تھے۔ حقائق بیان کرنے میں عمدہ ہیں۔ مکہ معظمہ میں یعقوب نہر جوری کی صحبت میں بھی رہے۔

آپؒ نے فرمایا: ''اَلتَّوحِیدُ الِاعْرَاضُ عَنِ الطَّبِیعَۃِ، یعنی توحید طبیعت سے منہ موڑ نے کا نام ہے۔'' حقیقت یہ ہے کہ انسان کی گمراہی اور بے راہ روی کا سب سے بڑا بلکہ اصل سبب طبیعت اور طبعی خواہشات کی اندھا دھند پیروی ہی ہے۔ اور اگر انسان طبیعت کو اپنے تابع کر لے اور اس کی پیروی سے منہ موڑ لے تو پھر توحید سے دنیا کی دوسری کوئی طاقت اسے منحرف نہیں کر سکتی۔ چنانچہ قیامت کے روز جب گمراہ اور عذاب کے مستحق لوگ شیطان کو اپنی گمراہی کا ذمہ دار ٹھہرائیں گے تو وہ بھی ان کے جواب میں ان کو یہی کہے گا کہ ''مَالِیَ عَلَیْکُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ اِلَّا اَنْ دَعَوْتُکُمْ فَاسْتَجَبْتُمْ لِیْ فَلَا تَلُوْمُوْنِیْ وَلُوْمُوْٓا اَنْفُسَکُمْ ط (۲۲:۱۴) یعنی میرا تم پر کوئی زور تو تھا نہیں، میں نے اس کے سوا تو کچھ نہیں کیا کہ اپنے راستے کی طرف تمھیں دعوت دی اور تم نے (اسے اپنی طبیعت اور نفس کے لیے مرغوب پا کر) اس کو قبول کر لیا۔ اب مجھے ملامت نہ کرو، اپنے آپ ہی کو ملامت کرو۔'' اور دنیا میں جن گمراہ سرداروں اور پیشواؤں اور اکابرین کے پیچھے لوگ چلتے رہے ہوں گے، خداوند تعالیٰ کے روبرو جب ان کو اپنی گمراہی کا ذمہ دار ٹھیرانے کی کوشش کریں گے تو ان کا جواب بھی یہ ہوگا کہ: اَنَحْنُ صَدَدْنٰکُمْ عَنِ الْهُدٰی بَعْدَ اِذْ جَآءَ کُمْ؟ بَلْ کُنْتُمْ مُّجْرِمِیْنَ (۳۴:۳۲) وَمَا کَانَ لَنَا عَلَیْکُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍ بَلْ کُنْتُمْ قَوْمًا طٰغِیْنَ (۳۷:۳۰) یعنی کیا راہِ ہدایت کو اختیار کرنے سے ہم نے تمھیں زبردستی روک دیا تھا جبکہ وہ تمھارے سامنے آئی تھی؟ یا حقیقت یہ ہے کہ تم خود ہی جرائم پیشہ اور جرائم کو پسند کرنے والے تھے؟ ہمارا تم پر کوئی زور تو تھا نہیں۔ دراصل تم لوگ خود ہی سرکش اور سرکشی کو پسند کرنے والے تھے۔'' یعنی تم خود اپنی طبیعتوں اور نفس کے مرغوبات کے طلب گار اور متلاشی تھے۔ جب یہ چیزیں تمھیں ہمارے پیچھے چلنے میں حاصل ہوتی دکھائی دیں تو تم ہمارے پیچھے لگ گئے، ورنہ ہم نے کب

تمہیں راہ ہدایت اختیار کرنے سے زبردستی روک دیا تھا یا ہمارے پاس وہ کونسا ایسا زور تھا جس سے ہم تمہیں اپنے پیچھے باندھ لیا تھا؟

(۴۷) حضرت ابوعثمان سعید بن سلام مغربی رحمۃ اللہ علیہ:

آپ سیاست اور ریاضت دونوں کے مالک تھے۔ علم کے فنون میں بھی بلند مرتبہ کے مالک تھے اور اہل تمکین بزرگوں سے ہوئے ہیں۔

آپؒ نے فرمایا: ''مَنْ اٰثَرَ صُحْبَةَ الْاَغْنِيَآءِ عَلٰى مُجَالَسَةِ الْفُقَرَاءِ ابْتَلاهُ اللّٰهُ تَعَالٰى بِمَوْتِ الْقَلْبِ. یعنی جو شخص درویشوں اور اہل اللہ کی مجلس پر دولت مندوں کی مجلس کو ترجیح دیتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو دل کی موت میں مبتلا کر دیتا ہے۔'' ظاہر ہے کہ یہ صورت وہی شخص اختیار کرے گا جس کے نزدیک دنیا کے مال و دولت اور اپنی دنیوی حاجات آخرت کے انعام و اکرام اور وہاں کے حاجات کے مقابلے میں اہم تر ہوں...... اور جب ایک مرتبہ آدمی دنیا کے مال و دولت کی حرص اور اپنی دنیوی حاجات سے مغلوب ہو جاتا ہے تو پھر مشکل ہی سے اسے اس چکر سے نجات نصیب ہوتی ہے۔ اس لیے آدمی کو چاہیے کہ وہ اہل دولت اور اہل دنیا کے طواف میں سرگرداں رہنے کے بجائے خدا کے بندوں کی صحبت اور ان کی مجلس کو اختیار کرے۔

(۴۸) حضرت ابوالقاسم ابراہیم بن محمد بن محمود نصر آبادی رحمۃ اللہ علیہ:

جیسے نیشاپور میں خوارزم بادشاہ تھے اور شاہ پور میں شاہ حمویہ تھے، اسی طرح ابوالقاسم ابراہیمؒ بھی بادشاہ تھے۔ گویا دنیا میں بھی آپ عالی مرتبہ اور صاحب عزت تھے۔ اور دین و طریقت میں بھی آپ کا بڑا مرتبہ تھا۔ صوفیوں کی صف کے پہلوان تھے۔ آپ حضرت ابوبکر شبلیؒ کے مرید تھے اور اپنے زمانے کے علماء میں سب سے بڑے تھے۔

آپؒ نے فرمایا اَنْتَ بَيْنَ نِسْبَتَيْنِ: نِسْبَةٌ اِلٰى اٰدَمَ وَنِسْبَةٌ اِلَى الْحَقِّ فَاِذَا انْتَسَبْتَ اِلٰى اٰدَمَ دَخَلْتَ فِیْ مَيَادِيْنِ الشَّهَوَاتِ وَمَوَاضِعِ الْاٰفَاتِ وَالزَّلَّاتِ وَهِیَ نِسْبَةٌ تَحَقُّقُ الْبَشْرِيَّةِ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا. وَاِذَا انْتَسَبْتَ اِلَى الْحَقِّ

دَخَلْتَ فِيْ مَقَامَاتِ الْكَشْفِ وَالْبَرَاهِيْنِ وَالْعِصْمَةِ وَالْوَلَايَةِ وَهِيَ نِسْبَةُ تَحَقُّقِ الْعُبُوْدِيَّةِ قَالَ اللّٰهُ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِيْنَ يَمْشُوْنَ عَلَى الْاَرْضِ هَوْنًا. یعنی تو دو نسبتوں کے درمیان ہے۔ ان میں سے ایک نسبت تو آدم سے ہے اور دوسری نسبت حق تعالیٰ سے ہے۔ جب تو اپنی نسبت (تعلق) آدم سے جوڑتا ہے تو اس کے ساتھ ہی تو شدید خواہشات، ابتلا و آفات اور مختلف قسم کی لغزشوں کے میدان و مواضع میں داخل ہو جاتا ہے۔ یہی تیری وہ نسبت ہے جس سے تیرا بشر ہونا ثابت ہوتا ہے۔ اور تیری اسی نسبت کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ انسان بڑا جفا کار اور ناعاقبت اندیش واقع ہوا ہے۔ اور جب تو اپنی نسبت (تعلق) حق تعالیٰ سے جوڑتا ہے تو اس کے بعد تو انکشافات حقیقت، براہین حق، عصمت و پاکیزگی اور اللہ تعالیٰ کی دوستی کے مقامات میں داخل ہو جاتا ہے۔ اور یہی تیری وہ نسبت ہے جس سے تیری عبودیت (خداوند تعالیٰ کے عبد اور پیدائشی غلام ہونے) کا ثبوت ملتا ہے، اور تیری اسی نسبت کو سامنے رکھ کر اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا کہ رحمٰن کے بندے زمین پر فروتنی اور عاجزی کے ساتھ چلتے ہیں۔ ان دونوں نسبتوں میں سے پہلی نسبت زندگی کے آخری سانس کے ساتھ ہی ہمیشہ کے لیے منقطع ہو جائے گی، اور صرف دوسری نسبت ہی ہے جو اس کے بعد ہمیشہ باقی رہے گی اور انسان کے کام آئے گی۔ اور اسی دوسری نسبت رکھنے والے لوگوں کے بارے میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا: ''یَاعِبَادِ لَا خَوْفٌ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ وَلَا اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ (۴۳:۶۸) اے میرے بندو! تمھیں آج کے دن (اور اس کے بعد) کوئی اندیشہ نہیں اور نہ کبھی تمیں کوئی پچھتاوا لاحق ہوگا۔'' اب تمھارے لیے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہر قسم کا امن و راحت اور عیش دوام ہے، اور اپنی محنت اور ایثار کا بیش بہا بدلہ ہے۔

(۴۹) حضرت ابوالحسن علی بن ابراہیم حضرمی رحمۃ اللہ علیہ:

آپؒ خدا کی راہ کے مسافروں کے سردار، اہل تحقیقِ حق کی جانوں کے جمال اور درگاہِ خداوندی کے اہل حشمت لوگوں میں سے ہوئے ہیں۔ صوفیاء کرام کے بڑے ائمہ میں سے ہیں۔

اپنے زمانے میں بے نظیر تھے۔ آپ کا کلام بہت عالی اور عبارتیں عمدہ ہیں۔

آپؒ نے فرمایا: ''دَعُوْنِیْ فِیْ بَلَائِیْ هَاتُوْا مَالَكُمْ؟ اَلَسْتُمْ مِنْ اَوْلَادِ اٰدَمَ الَّذِیْ خَلَقَهُ اللّٰهُ تَعَالٰی بِیَدِهٖ وَنَفَخَ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ وَسَجَدَ لَهُ الْمَلٰٓئِكَةُ ثُمَّ اَمَرَهٗ بِاَمْرٍ فَخَالَفَ. فَاِذَا كَانَ اَوَّلُ الدَّنِّ دُرْدِیًّا[1] فَكَیْفَ كَانَ اٰخِرُهٗ. یعنی جاؤ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو، تمھیں کیا؟ کیا تم لوگ اسی آدم کی اولاد میں سے نہیں ہو جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاتھ سے بنایا اور پھر اپنی روح میں سے اس کے اندر روح پھونکی، اپنے فرشتوں سے اس کو سجدہ کرایا اور اس قدر اعزاز بخشنے کے بعد صرف ایک حکم دیا، لیکن اس نے اس کی بھی خلاف ورزی کی۔ جس مشروب کا

---

[1] ایک صاحب نے حضرت حصریؒ کے اس قول پر یہ اعتراض اٹھایا کہ حضرت آدم علیہ السلام نبی تھے۔ ان الفاظ سے ان کی تحقیر ہوتی ہے اور یہ تنقیص انبیاء کے مترادف ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کے جس حکم اور حضرت آدمؑ کی طرف سے جس حکم عدولی کا یہاں تذکرہ ہے وہ ان کے منصب نبوت پر فائز ہونے سے بہت پہلے کا ہے۔ یہ حکم انھیں انسان اوّل اور ابوالبشر کی حیثیت سے نہ کہ نبی کی حیثیت سے دیا گیا تھا اور آدم اور ان کی بیوی دونوں کو دیا گیا تھا۔ اور اس بات کے امر واقعہ ہونے سے بھی مجال انکار نہیں کہ آدم علیہ السلام سے اس حکم کی خلاف ورزی ہوئی اور پھر ایک مدت تک توبہ و استغفار کے بعد اس کی معافی ہوئی۔ نبوت انھیں اس واقعہ اور معافی کے بعد کرۂ ارض کی خلافت پر عملاً فائز کرتے وقت عطا کی گئی تھی۔ قرآن مجید میں صراحت ہے:

فَتَلَقّٰٓی اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَیْهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ ○ قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِیْعًا ۚ فَاِمَّا یَاْتِیَنَّكُمْ مِّنِّیْ هُدًی فَمَنْ تَبِعَ هُدَایَ فَلَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ ○ وَالَّذِیْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِیْهَا خٰلِدُوْنَ ○ (۲:۳۷-۳۹)

''پھر آدمؑ نے اپنے رب سے چند کلمات سیکھ کر توبہ کی جس کو اس کے رب نے قبول کر لیا کیونکہ وہ بڑا معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ ہم نے (اس کے بعد) کہا تم سب یہاں سے اتر جاؤ۔ پھر جو میری طرف سے کوئی ہدایت تمھارے پاس پہنچے تو جو لوگ میری اس ہدایت کی پیروی کریں گے ان کے لیے کسی خوف اور رنج کا موقع نہ ہو گا اور جو اسے قبول کرنے سے انکار کریں گے اور ہماری آیات کو جھٹلائیں گے وہ آگ میں جانے والے لوگ ہیں جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔''

مزید برآں قاری کو چاہیے کہ قائل کے کلام کے اصل منشاء پر اپنی توجہ مرتکز کرے اور اُس مقصد کو سمجھے جس کے لیے خود اللہ تعالیٰ نے بھی اس واقعہ کو ہمیشہ کے لیے قرآن مجید میں ثبت کر دینا ضروری سمجھا اور جسے ذہن نشین کرانے کے لیے حضرت حصریؒ اس کا یہاں اس تند و تیز انداز میں ذکر کر رہے ہیں۔ منشاء یہ ہے کہ آدمی اس بات پر نگاہ رکھے کہ اس کے خالق و مالک نے اس سے کس انتہا درجہ کے احسان و تکریم کا سلوک فرمایا۔ حتیٰ کہ فرشتوں سمیت اپنی ساری ارضی مخلوق پر اسے فضیلت عطا کی۔ اب اس سب کے بعد بھی اگر وہ ناشکری و نافرمانی کی روش اختیار کرے گا تو اسے جان لینا چاہیے کہ جس درجے کا یہ قصور ہے اسی درجے کی پھر سزا بھی ملے گی۔ اور انسان بحیثیت ابن آدم اپنی اُس بنیادی کمزوری اور سادہ لوحی کو بھی یاد رکھے جس کی وجہ سے انسان اوّل اپنی رفیقۂ حیات سمیت شیطان کے پہلے ہی حملہ پر اس کے جھانسے میں آ گیا اور اس کے باوجود اس سے دھوکا کھا گیا کہ ابھی چند روز پہلے اس کی دشمنی کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر چکا تھا بلکہ اسے خدا کو یہ چیلنج دیتے ہوئے بھی دیکھ چکا تھا کہ ذرا مجھے موقع دے، میں دکھا دوں گا کہ آدمی اس لائق نہیں کہ اسے یہ مرتبہ عطا کیا جائے اور اللہ تعالیٰ نے اسے بالفاظ صریح متنبہ فرما دیا تھا کہ دیکھو اس دشمن سے ہوشیار رہنا یہ تیرے درپے آزار ہے (اَقُلْ لَّكُمَآ اِنَّ الشَّیْطٰنَ لَكُمَا عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ ○ ۷:۲۲) (مرتب)

دَخَلْتَ فِیْ مَقَامَاتِ الْکَشْفِ وَالْبَرَاهِیْنِ وَالْعِصْمَةِ وَالْوَلَایَةِ وَهِیَ نِسْبَةٌ تَحَقُّقَ الْعُبُوْدِیَّةَ قَالَ اللّٰهُ تَبَارَکَ وَتَعَالٰی وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِیْنَ یَمْشُوْنَ عَلَی الْاَرْضِ هَوْنًا. یعنی تو دونسبتوں کے درمیان ہے۔ان میں سے ایک نسبت تو آدم سے ہے اور دوسری نسبت حق تعالٰی سے ہے۔ جب تو اپنی نسبت (تعلق) آدم سے جوڑتا ہے تو اس کے ساتھ ہی تو شدید خواہشات، ابتلا و آفات اور مختلف قسم کی لغزشوں کے میدان و مواضع میں داخل ہو جاتا ہے۔ یہی تیری وہ نسبت ہے جس سے تیرا بشر ہونا ثابت ہوتا ہے۔اور تیری اسی نسبت کے لحاظ سے اللہ تعالٰی نے فرمایا ہے کہ انسان بڑا جفا کار اور ناعاقبت اندیش واقع ہوا ہے۔اور جب تو اپنی نسبت (تعلق) حق تعالٰی سے جوڑتا ہے تو اس کے بعد تو انکشافات حقیقت، براہین حق، عصمت و پاکیزگی اور اللہ تعالٰی کی دوستی کے مقامات میں داخل ہو جاتا ہے۔ اور یہی تیری وہ نسبت ہے جس سے تیری عبودیت (خداوند تعالٰی کے عبد اور پیدائشی غلام ہونے) کا ثبوت ملتا ہے، اور تیری اسی نسبت کو سامنے رکھ کر اللہ تبارک وتعالٰی نے فرمایا کہ رحمٰن کے بندے زمین پر فروتنی اور عاجزی کے ساتھ چلتے ہیں۔ان دونوں نسبتوں میں سے پہلی نسبت زندگی کے آخری سانس کے ساتھ ہی ہمیشہ کے لیے منقطع ہو جائے گی، اور صرف دوسری نسبت ہی ہے جو اس کے بعد ہمیشہ باقی رہے گی اور انسان کے کام آئے گی۔ اور اسی دوسری نسبت رکھنے والے لوگوں کے بارے میں اللہ تبارک وتعالٰی نے فرمایا: ''یٰعِبَادِ لَا خَوْفٌ عَلَیْکُمُ الْیَوْمَ وَلَا اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ (۶۸:۴۳) اے میرے بندو! تمھیں آج کے دن (اور اس کے بعد) کوئی اندیشہ نہیں اور نہ کبھی تمہیں کوئی پچھتاوا لاحق ہوگا۔'' اب تمھارے لیے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہر قسم کا امن وراحت اور عیش دوام ہے، اور اپنی محنت اور ایثار کا بیش بہا بدلہ ہے۔

(۴۹) حضرت ابوالحسن علی بن ابراہیم حضرمی رحمۃ اللہ علیہ:

آپؒ خدا کی راہ کے مسافروں کے سردار، اہل تحقیقِ حق کی جانوں کے جمال اور درگاہِ خداوندی کے اہل حشمت لوگوں میں سے ہوئے ہیں۔صوفیاء کرام کے بڑے ائمہ میں سے ہیں۔

اپنے زمانے میں بے نظیر تھے۔ آپ کا کلام بہت عالی اور عبارتیں عمدہ ہیں۔

آپؒ نے فرمایا: ''دَعُوْنِیْ فِیْ بَلَائِیْ هَاتُوْا مَالَكُمْ؟ اَلَسْتُمْ مِنْ اَوْلَادِ اٰدَمَ الَّذِیْ خَلَقَهُ اللّٰهُ تَعَالٰی بِیَدِهٖ وَنَفَخَ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ وَسَجَدَ لَهُ الْمَلٰٓئِكَةُ ثُمَّ اَمَرَهٗ بِاَمْرٍ فَخَالَفَ. فَاِذَا كَانَ اَوَّلُ الدَّنِّ دُرْدِیًا[1] فَكَیْفَ كَانَ اٰخِرُهٗ. یعنی جاؤ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو، تمھیں کیا؟ کیا تم لوگ اسی آدم کی اولاد میں سے نہیں ہو جس کو اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاتھ سے بنایا اور پھر اپنی روح میں سے اس کے اندر روح پھونکی، اپنے فرشتوں سے اس کو سجدہ کرایا اور اس قدر اعزاز بخشنے کے بعد صرف ایک حکم دیا، لیکن اس نے اس کی بھی خلاف ورزی کی۔ جس مشروب کا

---

[1] ایک صاحب نے حضرت حصریؒ کے اس قول پر یہ اعتراض اٹھایا کہ حضرت آدم علیہ السلام نبی تھے۔ ان الفاظ سے ان کی تحقیر ہوتی ہے اور یہ تنقیص انبیاء کے مترادف ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ کے جس حکم اور حضرت آدم کی طرف سے جس حکم عدولی کا یہاں تذکرہ ہے وہ ان کے منصب نبوت پر فائز ہونے سے بہت پہلے کا ہے۔ یہ حکم انھیں انسان اوّل اور ابوالبشر کی حیثیت سے نہ کہ نبی کی حیثیت سے دیا گیا تھا اور آدم اور ان کی بیوی دونوں کو دیا گیا تھا۔ اور اس بات کے امر واقعہ ہونے سے بھی مجال انکار نہیں کہ آدم علیہ السلام سے اس حکم کی خلاف ورزی ہوئی اور پھر ایک مدت تک توبہ و استغفار کے بعد اس کی معافی ہوئی۔ نبوت انھیں اس واقعہ اور معافی کے بعد کرۂ ارض کی خلافت پر عملاً فائز کرتے وقت عطا کی گئی تھی۔ قرآن مجید میں صراحت ہے:

فَتَلَقّٰٓى اٰدَمُ مِنْ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيْهِ ؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ۝ قُلْنَا اهْبِطُوْا مِنْهَا جَمِيْعًا ۚ فَاِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ مِّنِّىْ هُدًى فَمَنْ تَبِعَ هُدَاىَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ (۲:۳۷۔۳۹)

''پھر آدمؑ نے اپنے رب سے چند کلمات سیکھ کر توبہ کی جس کو اس کے رب نے قبول کر لیا کیونکہ وہ بڑا معاف کرنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ ہم نے (اس کے بعد) کہا تم سب یہاں سے اتر جاؤ۔ پھر جو میری طرف سے کوئی ہدایت تمھارے پاس پہنچے تو جو لوگ میری اس ہدایت کی پیروی کریں گے ان کے لیے کسی خوف اور رنج کا موقع نہ ہوگا اور جو اسے قبول کرنے سے انکار کریں گے اور ہماری آیات کو جھٹلائیں گے وہ آگ میں جانے والے لوگ ہیں جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔''

مزید برآں قاری کو چاہیے کہ قائل کے کلام کے اصل منشا پر اپنی توجہ مرتکز کرے اور اُس مقصد کو سمجھے جس کے لیے خود اللہ تعالیٰ نے بھی اس واقعہ کو ہمیشہ کے لیے قرآن مجید میں ثبت کر دینا ضروری سمجھا اور جسے ذہن نشین کرانے کے لیے حضرت حصریؒ اس کا یہاں اس تند و تیز انداز میں ذکر کر رہے ہیں۔ منشا یہ ہے کہ آدمی اس بات پر نگاہ رکھے کہ اس کے خالق و مالک نے اس سے کس انتہا درجہ کے احسان و تکریم کا سلوک فرمایا۔ حتیٰ کہ فرشتوں سمیت اپنی ساری ارضی مخلوق پر اسے فضیلت عطا کی۔ اب اس سب کے بعد بھی اگر وہ ناشکری و نافرمانی کی روش اختیار کرے گا تو اسے جان لینا چاہیے کہ جس درجے کا یہ قصور ہے اسی درجے کی پھر سزا بھی ملے گی۔ اور انسان بحیثیت ابن آدم اپنی اُس بنیادی کمزوری اور سادہ لوحی کو بھی یاد رکھے جس کی وجہ سے انسان اوّل اپنی رفیقہ حیات سمیت شیطان کے پہلے ہی حملہ پر اس کے جھانسے میں آ گیا اور اس کے باوجود اس سے دھوکا کھا گیا کہ ابھی چند روز پہلے اس کی دشمنی کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر چکا تھا بلکہ اسے خدا کو یہ چیلنج دیتے ہوئے بھی دیکھ چکا تھا کہ ذرا مجھے موقع دے، میں دکھا دوں گا کہ آدمی اس لائق نہیں کہ اسے یہ مرتبہ عطا کیا جائے اور اللہ تعالیٰ نے اسے بالفاظ صریح متنبہ فرما دیا تھا کہ دیکھو اس دشمن سے ہوشیار رہنا یہ تیرے درپے آزار ہے (اَقُلْ لَّكُمَآ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمَا عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝ ۷:۲۲) (مرتب)

پہلا گھونٹ ہی اس قدر تلچھٹ والا ہو، اس کے آخری گھونٹ کا کیا حال ہوگا؟'' حقیقت یہ ہے کہ حضرت حُضَرْمی رحمۃ اللہ علیہ نے اللہ تعالیٰ کے انسان پر احسانات کی بے پناہی اور بندے کی ناشکری واحسان فراموشی کی انتہا کی ان چند الفاظ میں تصویر کھینچ کر رکھ دی ہے۔ قرآن مجید میں بصراحت مذکور ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے آدمؑ اور اولادِ آدمؑ کو خلافتِ ارضی عطا کرنے کا فیصلہ فرمایا تو ابلیس نے اللہ تبارک وتعالیٰ کے اس فیصلہ کو چیلنج کیا اور کہا کہ یہ مخلوق اس مرتبہ کی اہل نہیں ہے، آپ مجھے موقع دیں میں آپ کو عملاً دکھاؤں گا کہ یہ ہرگز اس لائق نہیں۔ لَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ (۷:۱۷) ان میں سے بیشتر کو آپ ناشکرگزار پائیں گے، اور ان کی اکثریت بغاوت، نمک حرامی اور نافرمانی کی راہ پر چلے گی۔ لیکن اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے انسان کو زمین پر خلافت سے سرفراز فرمایا۔ اب اس امر واقعہ کو جان لینے کے بعد جو شخص خدا کی نافرمانی اور سرکشی کو اختیار کرے اس سے بڑھ کر احسان فراموش اور نمک حرام کون ہوسکتا ہے۔ ایسے لوگ فی الحقیقت اللہ تبارک وتعالیٰ کو شیطان کے مقابلے میں ہٹا کرنے کے گناہ کا ارتکاب کرتے ہیں۔ جو مخلوق اپنے خالق کی طرف سے اس قدر عزت افزائی کا صلہ یہ دے، اس کی سزا ابدی جہنم نہیں تو اور کیا ہے۔ کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ اس گناہ کے مقابلہ میں سخت تر سزا ہے؟

متاخرین میں سے صوفیاءِ کرام کے ائمہ

متاخرین میں سے (۱) حضرت شیخ ابو العباس احمد بن محمد اشقانیؒ، (۲) ابو جعفر محمد بن المصباح صیدلانی، (۳) ابو القاسم عبد الکریم بن ہوازن قُشیری، (۴) ابو القاسم بن علی بن عبد اللہ گرگانی، (۵) ابو عبد اللہ محمد بن علی داستانی بُسطامی، (۶) ابو سعید فضل اللہ بن محمد مہیمنی، (۷) ابو احمد مظفر بن احمد بن حمدان، اور (۸) ابو الفضل محمد بن حسن ختلی رحمہم اللہ تعالیٰ نمایاں ہیں۔ اور سب کے سب حضرت علی ہجویریؒ کے اساتذہ کرام ہیں۔ ان کا ذکر ان کی زندگی کے حالات میں کیا جا چکا ہے، اس لیے ان کے حالات یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں۔

ان کے علاوہ بھی کچھ شیوخ کا ذکر حضرت علی ہجویریؒ نے کیا ہے، لیکن ان کے احوال میں کوئی خاص قابلِ ذکر و توجہ بات نہیں ہے۔ اس لیے ان کو اس ترتیب سے حذف کر دیا گیا ہے۔

صوفیوں کے مختلف فرقے اور ان کے مذاہب کا فرق

۱۔ فرقہ محاسبیہ یا محاسبی فرقہ:

خصوصیت:

صوفیاء کا یہ گروہ حضرت ابوعبداللہ حارث بن اسد محاسبی رحمۃ اللہ علیہ سے نسبت رکھتا ہے۔ آپ اپنے سارے اہل زمانہ کے نزدیک مقبول النفس اور مقتول النفس ہوئے ہیں۔ اور آپ کا ظاہری اور باطنی کلام خالص توحید کے بیان میں ہے۔ آپ کے مذہب کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ ''رضا'' کے مقاماتِ تصوف میں سے ایک مقام ہونے کے قائل نہیں ہیں بلکہ اسے احوال میں سے سمجھتے ہیں۔ یعنی ان کا کہنا یہ ہے کہ 'رضا' کوئی مقام یا مرتبہ نہیں ہے بلکہ ایک حالت ہے جو بندے پر طاری ہوتی ہے۔ اور حضرت علی ہجویریؒ اس بارے میں ان سے متفق ہیں۔ انھوں نے اس بارے میں جو وضاحت کی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے:

''رضا'' کی حقیقت:

جہاں تک ''رضا'' کے مطلوب و مقصود ہونے کا تعلق ہے، کتابُ اللہ اور حدیثِ رسولؐ اللہ دونوں سے اس کی اہمیت ظاہر ہے اور امت کا اس پر اتفاق ہے۔ چنانچہ سچے مومنوں کے بارے میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ''رَضِیَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْعَنْهُ ذَالِکَ الْفَوْزُ الْعَظِیْم (۵:۱۱۹) یعنی اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہوئے۔ یہی بڑی کامیابی ہے۔'' دوسری جگہ فرمایا: ''لَقَدْ رَضِیَ اللّٰهُ عَنِ الْمُوْمِنِیْنَ اِذْیُبَایِعُوْنَکَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ (۴۸:۱۸) اللہ اہل ایمان سے راضی ہو گیا جب انھوں نے درخت کے نیچے تجھ سے بیعت کی۔'' اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''ذَاقَ طَعْمَ الْاِیْمَانِ مَنْ رَضِیَ بِااللّٰهِ رَبًّا وَّ...... یعنی ایمان کا ذائقہ اس

شخص نے چکھا جو اللہ کو اپنا رب، اسلام کو اپنا طریق زندگی اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا رہنما و رہبر (رسول) بنانے پر راضی ہو گیا۔

خدا کی رضا بندے کے حق میں یہ ہے کہ وہ بندے کی طرف کرم نوازی، نعمت اور اجر و ثواب کے ارادہ سے متوجہ ہو اور بندے کی طرف سے رضا یہ ہے کہ وہ اپنی دلی رغبت اور خوشی کے ساتھ اپنے رب کے احکام کی تعمیل میں سرِ اطاعت جھکا دے۔ اور اس کے حکم پر ہر حال میں راضی اور قائم رہے: اِمَّا مَنْعٌ اَوْ اِمَّا عَطَاءٌ وَاِمَّا جَمَالٌ اَوْ اِمَّا جَلَالٌ یعنی بندہ اسی روش پر قائم رہے خواہ مالک کی طرف سے انعام و بخشش کا حکم صادر ہو یا اُن سے محرومی کا، اور وہ جمال سے توجہ فرمائے یا جلال سے۔

کچھ لوگوں نے حضرت حسن رضی اللہ عنہ کے سامنے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کا یہ قول پیش کیا: اَلْفَقْرُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِنَ الْغِنَاءِ وَالسُّقْمُ اَحَبُّ اِلَیَّ مِنَ الصِحَۃِ. یعنی یہ کہ میرے نزدیک فقر غنٰی سے زیادہ محبوب ہے، اور بیماری صحت سے زیادہ محبوب ہے۔ اس کے جواب میں حضرت امام حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا: ''فَقَالَ الْحَسَنُ ابْنُ عَلِیِّ رَحِمَ اللّٰهُ اَبَاذَرٍ اَمَّا اَنَا فَاَقُوْلُ مَنْ اَشْرَفَ عَلٰی حُسْنِ اِخْتِیَارِ اللّٰهِ لَهٗ، لَمْ یَتَمَنَّ غَیْرَمَا اخْتَارِ اللّٰهُ لَهٗ، حضرت حسن بن علیؓ نے فرمایا: اللہ ابوذرؓ رحم فرمائے۔ مگر میں کہتا ہوں کہ جو شخص اللہ کے حسنِ اختیار پر نگاہ رکھتا ہو، وہ اس چیز کے سوا جو اللہ نے اس کے لیے پسند فرمائی ہو اَور چیز کی آرزو نہیں کرتا۔''

رضا کی صفت یہ ہے کہ وہ انسان کو ہر تردد اور تمام غموں سے نجات بخشتی ہے۔ رضا اس اعتقاد سے پیدا ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ آدمی کو اس کے تمام احوال میں دیکھنے والا اور اس کے حال سے پوری طرح باخبر ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مَنْ لَمْ یَرْضَ بِاللّٰهِ وَبِقَضَائِهٖ شَغَلَ قَلْبَهٗ وَتَعَبَ بَدْنَهٗ. یعنی جو شخص خدا کی قضا اور اپنے بارے میں اس کے فیصلے پر راضی نہیں ہوتا، اس کا دل دنیوی تفکرات میں اور اس کا بدن رنج و الم میں کھو جاتا ہے۔'' حضرت بشر حافیؒ نے حضرت فُضَیل بن عیاضؒ سے دریافت کیا کہ زُہد افضل ہے یا رضا؟ حضرت فُضَیل نے

جواب دیا: ''اَلرِّضَاءُ اَفْضَلُ مِنَ الزُّهْدِ لِاَنَّ الرَّاضِیَ لَا یَتَمَنّٰی فَوْقَ مَنْزِلَۃٍ. یعنی رضا زہد سے بڑا مرتبہ ہے، کیونکہ 'راضی' اوپر کی منزل کی خواہش نہیں رکھتا۔'' یعنی زہد کے اوپر ایک دوسری منزل ہے جس کی زاہد کو تمنا ہوتی ہے۔ مگر رضا کے اوپر کوئی منزل نہیں ہے جس کی راضی کو تمنا ہو۔ نیز رضا کوئی کسبی شے نہیں ہے جو مجاھدے اور کسب کے ذریعے بندے کو حاصل ہو جائے۔ بلکہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطیے اور بخشش کے طور پر حاصل ہوتی ہے۔ کیونکہ دل کا سکون اور طمانیت قلب بندہ کسب اور کوشش سے حاصل نہیں کر سکتا، بلکہ یہ خداوند تعالیٰ کے عطیات میں سے ہیں۔ وہ توجہ فرماتا ہے تو یہ حاصل ہوتے ہیں۔ جیسا کہ اوپر خداوند تعالیٰ کا یہ ارشاد گزرا ہے: رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَرَضُوْعَنْہُ. گویا خداوند تعالیٰ کی رضا مقدم ہے اور بندے کی رضا اس کے بعد ہے۔ اس سے محاسبی رحمۃ اللہ علیہ کے قول کی صحت کا ثبوت ملتا ہے کہ رضا مقامات میں سے نہیں ہے کہ اسے کسب و کوشش سے حاصل کیا جاسکے، بلکہ یہ احوال میں سے ایک حالت ہے جو خدا کی عنایت اور اس کی مہربانی سے بندے پر طاری ہوتی ہے۔

''مقام'' اور ''حال'' کا فرق:

''مقام'' اور ''حال'' میں فرق یہ ہے کہ 'مقام' کا تعلق مجاھدے سے ہے، اور یہ مجاھدے سے حاصل ہوتا ہے۔ یعنی یہ ایک کسبی شے ہے۔ اس کے برعکس 'حال' خدا کی عطا کردہ بزرگی ہے۔ یہ اس کے فضل اور لطف و عطیہ سے حاصل ہوتا ہے۔ جب یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے دل پر وارد ہوتا ہے تو اپنے اختیار اور کسب سے اسے علیحدہ نہیں کیا جاسکتا اور جب یہ رخصت ہونے لگتا ہے تو اسے اختیار اور کسب سے روکا نہیں جاسکتا۔

مقاماتِ تصوّف:

تصوف کے مقامات میں سے پہلا مقام توبہ ہے۔ یعنی خدا کی بغاوت و نافرمانی سے آیندہ باز رہنے اور سابق نافرمانیوں کی تلافی کا خلوص دل سے عہد۔ اس کے بعد دوسرا مقام اَنابت ہے۔ یعنی خدا کی طرف خشوع و خضوع کے ساتھ رجوع ہونا۔ تیسرا مقام زھد ہے۔ یعنی ترک ماسوا

اللہ۔ یعنی اللہ کے ہر مدِ مقابل اور سرکش سے قطع تعلق اور دوسرے ہر تعلق کو اللہ سے تعلق تابع کر دینا۔ اور اس کے بعد چوتھا مقام ہے ''توکل''۔ یعنی خدائے بزرگ و برتر کی ذات پر کامل بھروسہ۔ اسی سے آگے ''رضا'' کے حصول کا راستہ کھلتا ہے۔ جو صوفیائے کرام رضا کو مقامات میں سے ایک مقام قرار دیتے ہیں ان کے نزدیک بھی رضا مقامات میں سے آخری اور انتہائی مقام ہے۔ یہ مقامات اسی ترتیب سے مجاہدہ کرنے سے حاصل ہو سکتے ہیں۔ خوب جان لو کہ کسی کے لیے نہ یہ ممکن ہے اور نہ ہی جائز کہ توبہ کے بغیر انابت کا، انابت کے مقام کو طے کیے بغیر زہد کا اور زہد کے مقام سے گزرے بغیر توکل کا دعویٰ کرے یا اس کو پالے۔ اور نہ یہ صحیح ہے کہ کسی مقام پر ڈیرہ ڈال کر بیٹھ جائے۔ اسے آگے بڑھنے کے لیے مسلسل مجاہدہ (یعنی کوشش اور جدوجہد) کرنا چاہیے۔ اسے آگے بڑھنے کے لیے مسلسل مجاہدہ (یعنی کوشش اور جدوجہد) کرنا چاہیے۔ جس مقام سے گزر رہا ہو اس کے تمام لوازمات اور مقتضیات پورے دل و جان سے سمجھے اور ادا کرے۔ ورنہ آگے راستہ نہیں ملے گا۔

صوفیاء اور شریعت:

نیز کسی حال میں بھی شریعتِ الٰہی کے خلاف کوئی حرکت نہ کرے۔ نہ ظاہر میں اور نہ باطن میں۔ ایک دن کا ذکر ہے کہ ابوحمزہ بغدادی رحمۃ اللہ علیہ حضرت محاسبی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس آئے اور انھوں نے وجد میں آکر کوئی حرکت ایسی کی جو ظاہر میں حلولیوں کے مشابہ تھی۔ اس پر حضرت محاسبیؒ اس قدر برہم ہوئے کہ چھری اٹھا کر ابوحمزہ کو مار ڈالنے کے ارادے سے اس پر چل پڑے۔ اور فرمایا: ''اَسْلِمْ یَامَطْرُوْدُ، کَفَرْتَ. اسلام لا، اے مردود، تو کافر ہو گیا۔'' دوسرے مرید آپ کے پاؤں پر گر پڑے اور انھوں نے ابوحمزہ کو آپ سے جدا کر دیا۔ اور عرض کیا کہ ہم سب تو اسے خواص اولیاء اور مخلص موحدوں میں سے سمجھتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ: مجھے بھی اس میں تردد نہیں، مگر اس نے حرکت ایسی کی ہے جو حلولیوں کے مشابہ ہے، اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''مَنْ تَشَبَّہَ بِقَوْمٍ فَھُوَ مِنْھُمْ، یعنی جس شخص نے کسی قوم سے مشابہت اختیار کی اس کا

شمار انھیں میں ہوگا۔ نیز آپؐ نے فرمایا: ''مَنْ کَانَ مِنْکُمْ یُوْمِنُ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ فَلَا یَقِفَنَّ مَوَاقِفَ التُّھَمِ، یعنی تم میں سے جو شخص خدا اور آخرت کو مانتا ہو وہ اپنے آپ کو کسی مشکوک جگہ پر جانے سے بھی بچائے۔'' اس پر ابوحمزہ نے عرض کیا: یا شیخ! اگرچہ حقیقت کے لحاظ سے میں نے کوئی غلط حرکت نہیں کی، مگر ظاہر میں چونکہ میرا فعل ایک گمراہ قوم کے مانند تھا۔ لہٰذا میں توبہ کرتا ہوں اور اپنے اس فعل سے رجوع کرتا ہوں۔

اس سے واضح ہے کہ صحیح اور سچے صوفیاء کرام علماء حق سے بھی کچھ بڑھ کر ہی خدا کے دین کے پہرے دار تھے۔ اور باطن ہی میں نہیں ظاہر شریعت میں بھی نہایت درجہ شریعت الٰہی اور سنت رسولؐ کے پابند تھے۔[1]

۲۔ قصاری فرقہ

خصوصیات:

قصاری فرقہ ابوصالح حمدون بن احمد بن عمارۃ القصار رحمۃ اللہ علیہ کی طرف منسوب ہے۔ آپ کا طریقہ ملامت کا ظاہر اور نشر کرنا تھا۔ کیونکہ ان کے نزدیک تزکیہ نفس کے لیے خلق کی ملامت ضروری چیز ہے۔ آپ کا مسلک یہ تھا کہ انسان کا اپنے باطن میں خدا کے ساتھ معاملہ اس معاملہ سے بہت زیادہ اچھا ہونا چاہیے جو اس کا مخلوق کے سامنے ہے۔

طریق ملامت:

''ملامت'' کے بارے میں مفصل بحث اوپر 'طریق ملامت' کے باب میں گزر چکی ہے، اس لیے اسے یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔

---

[1] حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: ولایت کے مراتب میں سب سے بلند اور انتہائی مرتبہ عبدیت کا مقام ہے ... اور تصوف کا مقصود یہ ہے کہ شرعی عقاید پر یقین محکم ہو جائے اور فقہی احکام کے ادا کرنے میں آسانی میسر ہو اس کے سوا تصوف کا کچھ اور مقصود نہیں ہے (ملاحظہ ہو مکتوب نمبر ۳۰۔ ۲۰۷، دفتر اول)

۳۔ طیفوری فرقہ یا فرقہ طیفوریہ

خصوصیات:

اس گروہ کے پیشوا حضرت ابو یزید طیفور بن عیسیٰ بن سروشان بُسطامیؒ ہیں۔ ان کا طریقہ غلبہ اور ''سکر'' (بے ہوشی) کا تھا۔ یعنی خداوند تعالیٰ کے شوق کا اس قدر غلبہ ہو کہ اس میں آدمی بے ہوشی کی حد تک کھو جائے لیکن اقتداء اور پیروی کے بارے میں اس طریقت کے مشائخ اس امر پر متفق ہیں کہ اقتداء اور پیروی بہر حال اسی مستقیم الحال شخص کی کرنی چاہیے جو احوال کی گردش سے خلاصی پائے ہوئے ہو۔ جو راہِ مستقیم پر اس درجہ جم چکا ہو کہ وہ سکر اور بے ہوشی کے باوجود جادۂ حق سے ادھر ادھر نہ ہو۔ جس کا ''سکر'' اور بے ہوشی حق کے لیے ہوں، نہ یہ کہ اُسے حق اور باطل کا بھی ہوش نہ رہے۔ چنانچہ حضرت سہل بن عبداللہ تستریؒ کے بارے میں بیان کرتے ہیں کہ اپنے بڑھاپے کے زمانے میں بے ہوشی کے عالم میں پڑے رہتے تھے۔ لیکن نماز کا وقت آتا تو بالکل اچھے بھلے تندرست ہو جاتے۔ اور نماز سے فارغ ہوتے تو پھر اسی حال میں پڑے رہتے۔

''سُکر'':

طیفوریہ کے نزدیک ''سُکر'' کی حالت ''صحو'' یعنی ہوشی کی حالت پر فضیلت رکھتی ہے۔ کیونکہ اس حالت میں بندہ بالکل اپنے خدا میں گم ہوتا ہے، اور تمام مخلوق سے کلیۃً بے خبر اور بے نیاز۔ البتہ اس بارے میں طیفوریہ کے ہاں اختلاف پایا جاتا ہے کہ آیا ''سُکر'' کو مصنوعی طور پر اختیار کرنا درست ہے یا نہیں؟ اور آیا مجاہدہ سے ''سُکر'' کی حالت کو آدمی پہنچ سکتا ہے یا نہیں۔

ایک گروہ کہتا ہے کہ مصنوعی طور پر اپنے اوپر ''سُکر'' کی حالت طاری کرنا درست بھی ہے اور مجاہدہ سے اس کو آدمی پہنچ سکتا ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اِبْکُوْ فَاِنْ لَمْ تَبْکُوْا فَتَبَاکُوْا، یعنی اول تو (خدا کے خوف سے) روؤ، اور اگر فی الواقع نہ رو سکو تو رونی صورت بناؤ۔'' نیز فرمایا: ''مَنْ تَشَبَّہَ بِقَوْمٍ فَھُوَ مِنْھُمْ، یعنی جو شخص کسی قوم کی

مشابہت اختیار کرے گا وہ بھی اسی قوم سے سمجھا جائے گا۔'' اس سے یہ حضرات یہ دلیل لاتے ہیں کہ جس قدر مجاھدے کی راہ سے ہم کوشش کر سکتے ہیں وہ کرتے ہیں اور تکمیلِ حال کے لیے خداوند تعالیٰ کی رحمت سے امیدوار ہیں۔

دوسرا گروہ کہتا ہے کہ مصنوعی طور پر اپنے ظاہر پر ایسی حالت طاری کرنا جو باطن اور حقیقت میں موجود نہیں، ریاء ہے، اور ریاء خداوند تعالیٰ کے ہاں شرک ہے۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ ''سکر'' یعنی بے ہوشی اور ''صحو'' یعنی ہوش ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ مجاہدہ ہوش کو مستلزم ہے، یعنی مجاہدہ اور کوشش کے لیے ہوش ضروری ہے۔ کیونکہ ہوش کے بغیر مجاھدہ ممکن نہیں ہے۔ اور جب تک ہوش موجود ہو بے ہوشی (سکر) کے لیے کوئی گنجائش نہیں۔ اس لیے سکر' کو مجاھدہ سے حاصل نہیں کیا جا سکتا۔

۴۔ جُنیدی فرقہ

خصوصیات:

جنیدی فرقہ کے پیشوا حضرت ابوالقاسم جنید بن محمد بن جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ اس فرقہ کی خصوصیت یہ ہے کہ ان کا طریقہ طیفوری گروہ کے برعکس ''صحو'' یعنی ہوش پر مبنی ہے۔ صوفیاء کے تمام گروہوں میں سے سب سے زیادہ مشہور اور مقبول مذہب انہی کا ہے۔ اور سب مشائخ جنیدی مذہب میں ہوئے ہیں۔ میرے (علی بن عثمان جلابی کے) شیخ بھی انہی کے مذہب پر ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ ''سکر'' بچوں کے کھیل کی جگہ ہے اور ''صحو'' مردوں کے فنا کا میدان۔

''صحو'':

جنیدی گروہ کے لوگ ''صحو'' کو ''سکر'' پر فضیلت دیتے ہیں اور ''صحو'' سے ان کے ہاں مراد ہوش مندی ہے کہ آدمی خداوند تعالیٰ کے ساتھ اپنے حال اور معاملہ کو درست کرے، نہ کہ دنیا کمانے اور سمیٹنے میں ہوشیاری اور ہوشمندی۔ چنانچہ حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: ''اَلصَّحْوُ

عِبادَةٌ بِلا خِلافٍ عَنْ صِحَّةِ حَالِ الْعَبْدِ مَعَ الْحَقِّ، یعنی ''صحو'' کے معنی حق تعالیٰ کے ساتھ بندے کے اس طرح سے صحیح الحال ہونے کے ہیں کہ اس میں کچھ خلاف نہ رہے۔''

''سکر'' کی فضیلت میں طیفوریہ اور ''صحو'' کی فضیلت کے بارے میں جنیدیہ جو دلائل دیتے ہیں وہ درج ذیل ہیں:

''سکر'' کی فضیلت کے بارے میں طَیفوریہ کے دلائل:

طیفوریہ گروہ کے لوگ کہتے ہیں کہ خدا کے راستے میں بندے کی راہ میں حجابِ اعظم (سب سے بڑی رُکاوٹ) اس کا اپنا وجود ہے۔ ''سکر'' کی حالت میں یہ سب سے بڑی آفت فنا ہو جاتی اور باقی سب مخلوق سے بھی آدمی بے نیاز ہو جاتا ہے۔ اس لیے خدا اور بندے میں کوئی دُوری باقی نہیں رہتی۔ ان کا ہو جاتا ہے۔ اس لیے خدا اور بندے میں کوئی دُوری باقی نہیں رہتی۔ ان کا کہنا ہے کہ یہی وہ حالت ہے جب کہ بندے کے ہر فعل کو اللہ تعالیٰ اپنا فعل قرار دیتا ہے۔ چنانچہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''وَمَا رَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ وَلٰکِنَّ اللّٰہَ رَمٰی (۸:۱۳) یعنی اے محمدؐ ریت کی مٹی تو نے پھینکی وہ تو نے نہیں پھینکی تھی بلکہ اللہ نے پھینکی تھے۔'' کیوں کہ اس وقت حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے وجود کو بالکل گم کر چکے تھے اور سرتاپا عبدیت کے مقام پر تھے۔ اور آپؐ کی حالت ''سکر'' کی حالت تھی۔ آپؐ کے فعل کو خداوند تعالیٰ کا اپنی طرف منسوب کرنا ہی اس بات کو صاف ظاہر کرتا ہے کہ آپؐ اپنے ساتھ نہیں بلکہ خدا کے ساتھ قائم تھے۔

''صحو'' کی فضیلت کے بارے میں جنیدیہ کے دلائل:

طیفوریہ کے جواب میں جنیدیہ کہتے ہیں کہ ''سکر'' کی حالت میں آدمی عقل، تمیز اور علم سب کو گم کر دیتا ہے۔ اور اسے صحیح اور غلط کی بھی تمیز نہیں رہتی۔ ''سکر'' ''احوال'' کی پریشانی ہے اور اس میں صحت دُور ہو جاتی ہے۔ اس حالت میں بندہ کسی چیز کی اصل حقیقت سے واقف نہیں ہو سکتا۔ اور آدمی کے بھٹکنے اور غلط راہ اختیار کرنے کی وجہ ہی یہ ہوتی ہے کہ وہ چیزوں کی اصل حقیقت اور قدر و قیمت سے ناواقف ہوتا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے بھی آدم علیہ السلام کو اشیاء کے اسماء اور ان کی

حقیقت سے آگاہ فرمایا اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ تعالیٰ سے یہ دعا فرمائی کہ:
''اَللّٰھُمَّ اَرِنَا حَقَائِقَ کُلِّ الْاَشْیَاءِ کَمَا ھِیَ. یعنی خدایا! ہمیں اشیاء کو ان کو حقیقی صورت میں دکھا۔'' اس لیے کہ جو شخص اشیاء کی حقیقت کو پالے گا، اس کا طرزِ عمل خود بخود دُرست ہو جائے گا۔
نیز اللہ تعالیٰ نے بندوں کو مخاطب کر کے یہ بھی فرمایا: فَاعْتَبِرُوْا یٰاُولِی الْاَبْصَارِ (۲:۵۹) یعنی اے عقل رکھنے والو! (جو کچھ دیکھتے ہو اس سے) بصیرت اور سبق حاصل کرو۔'' ظاہر ہے کہ جب تک آدمی گردوپیش کی چیزیں اور واقعات پر غور وفکر نہ کرے گا اور ان کی حقیقت کو نہیں سمجھے گا تو وہ عبرت کیسے حاصل کر سکے گا۔ اور سبق کیسے لے گا۔ اور غور کرنے اور حقیقت کو سمجھنے کے لیے عقل اور ہوش یعنی ''صحو'' کی ضرورت ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کی راہ ''صحو'' ہے نہ کہ ''سکر''۔

قول فیصل:

میں (علی بن عثمان جلابی) بھی اپنے استاد کی موافقت میں حضرت جنیدؒ کے مذہب پر ہوں۔ ''صحو'' کے ''سکر'' سے افضل ہونے کی واضح دلیل یہ ہے کہ صاحبِ سکر کے حال کا کمال خود ''صحو'' ہے۔ کیونکہ ''سکر'' کی حالت حاصل کرنے کی ضرورت کا احساس، اس کو حاصل کرنے کی کوشش اور پھر اس کے حصول کے بعد اس حال کو قائم رکھنا سب چیزیں ہوش کی محتاج ہیں۔ اس سے واضح تر دلیل ''سکر'' پر ''صحو'' کی فضیلت کی اور کیا ہو سکتی ہے۔

لیکن اصل حقیقت یہ ہے کہ جو چیز مطلوبِ حقیقی ہے وہ خداوند تعالیٰ کی اطاعت اور بندگی میں سچی جانثاری اور فدویّت ہے کہ اس بارے میں انسان کے اپنے وجود سمیت دنیا جہان کی کوئی شے سرِ مو اس کے راستے میں حائل نہ ہو سکے۔ اگر یہ حالت حاصل ہو جائے تو جہاں یہ چیز ایک طرف ''حقیقی سکر'' ہے تو دوسری طرف یہی چیز کمالِ ہوشمندی اور ''حقیقی صحو'' ہے۔ نہ ہوش اور ''صحو'' کا اس سے بڑھ کر کچھ مقصود ہے اور نہ ''سکر'' اور غلبۂ حال کا۔ اور اگر یہ صورت نہیں تو سب مناظرہ بازی ہے اور ''سکر'' اور ''صحو'' دونوں بے معنی اور بے فائدہ الفاظ کا گورکھ دھندا ہے۔

۵۔ نوری فرقہ

خصوصیت: صحبت اور ایثار:

نوری فرقہ کے پیشوا ابوالحسن احمد بن نوری رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ ان کے مذہب کی خصوصیت یہ ہے کہ ان کے نزدیک گوشہ نشینی ناپسندیدہ ہے، اور صحبت درویش مردوں کا فرض ہے۔ اور اس میں دوسروں کے حقوق اور ان کی منفعت کو اپنی مصلحت پر مقدم رکھنا لازم ہے۔ آپ کا ارشاد ہے کہ: اِيَّاكُمْ وَالْعُزْلَةِ فَاِنَّ الْعُزْلَةَ مُقَارَبَةُ الشَّيْطَانِ وَعَلَيْكُمْ بِالصُّحْبَةِ فَاِنَّ فِي الصُّحْبَةِ رِضَاءُ الرَّحْمٰنِ، یعنی گوشہ نشینی سے بچو۔ اس لیے کہ گوشہ نشینی شیطان سے مقاربت ہے۔ تمھارے لیے لازم ہے کہ صحبت اختیار کرو۔ اس لیے کہ اس میں خدائے رحمٰن کی خوشنودی ہے۔'' لیکن شرط یہ ہے کہ دوسروں کے درمیان رہتے ہوئے ایثار پیشگی کو اپنی مستقل روش بناؤ۔ یہ صحبت دوسروں سے دنیوی فوائد حاصل کرنے اور ان کے مال اڑانے کے لیے نہ ہو بلکہ دوسروں کی خدمت اور ان کے لیے ایثار کی خاطر ہو۔

''ایثار''

''ایثار'' کا خداوند تعالیٰ کے ہاں بڑا درجہ ہے۔ اہلِ ایثار کی تعریف کرتے ہوئے خداوند جلّ وعلا نے فرمایا: ''وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (۹:۵۹) یعنی خود حاجت مند ہونے کے باوجود دوسروں کی ضرورت کو اپنی ضرورت پر مقدم رکھتے ہیں۔'' صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم دوسرے اوصاف کے ساتھ اس وصف میں بھی بے نظیر تھے۔ انصار میں سے ایک صحابیہؓ کا بیان ہے کہ جنگِ اُحد کے روز وہ پانی لے کر خیمہ سے نکلی کہ کسی مجاہد کو پلائے۔ اس نے میدان جنگ میں ایک صحابیؓ کو زخموں سے چُور چُور دیکھا۔ وہ اپنی زندگی کے آخری سانس لے رہا تھا۔ اشارے سے اس نے پانی مانگا۔ وہ کہتی ہے کہ میں نے آگے بڑھ کر پانی کا برتن اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ اتنے میں پاس سے دوسرے زخمی نے آواز دی: ''مجھے پانی دو کہ یہ سنتے ہی

پہلے نے پیالہ مجھے واپس کر دیا کہ یہ پانی اُسے دے دو۔ جب میں پانی لے کر دوسرے پاس آئی تو ایک اور زخمی کی آواز آئی کہ مجھے پانی پلاؤ۔ یہ سن کر اس دوسرے نے مجھے کہا کہ پہلے اسے پلاؤ۔ اس طرح سے میں سات آدمیوں کے پاس پانی لے کر گئی۔ ہر ایک نے پہلے پانی مانگا۔ لیکن جب دوسرے کی آواز سنی تو پہلے اس کو پلانے کا اشارہ کیا۔ وہ فرماتی ہیں کہ جب میں ساتویں کے پاس پانی لے کر پہنچی تو وہ دَم توڑ چکا تھا۔ میں واپس پلٹی کہ دوسرے کو دُوں تو دیکھا کہ وہ بھی اپنے رب کے حضور پہنچ چکا ہے۔ اسی طرح میں ایک ایک کر کے سب کے پاس آئی۔ لیکن کوئی بھی زندہ نہ ملا۔ اس موقع پر آیت نازل ہوئی کہ:

وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (۹:۵۹)

نافعؒ کا بیان ہے کہ ایک روز حضرت عبداللہ بن عمرؓ کو مچھلی کی خواہش ہوئی۔ میں نے سارے شہر میں تلاش کی مگر کہیں سے دستیاب نہ ہوئی۔ چند روز کے بعد مچھلی ملی تو آپؓ نے اس کے کباب تیار کرنے کا حکم دیا۔ نافعؒ کہتے ہیں کہ جب میں نے کباب تیار کر کے آپ کے سامنے رکھے تو آپ اس قدر خوش ہوئے کہ آپ کی خوشی آپ کے چہرے سے صاف نمایاں ہو رہی تھی۔ اتنے میں ایک سائل نے دروازے پر آ کر صدا دی۔ آپ نے حکم دیا کہ یہ کباب اس سائل کو دے دو۔ نافعؒ کہتے ہیں کہ ہم نے بہت کہا کہ اتنے روز سے آپ کو مچھلی کا شوق تھا۔ بڑی مشکل سے دستیاب ہوئی ہے۔ سائل کو اور کوئی چیز دے دیتے ہیں۔ لیکن حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا کہ میں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ: ''اَيُّمَا امْرَءٍ يَشْتَهِيْ شَهْوَةً فَرَدَّ شَهْوَةً وَاٰثَرَ الْاٰخِرَةَ عَلٰى نَفْسِهٖ غُفِرَ لَهٗ، یعنی جس کسی کو کوئی خواہش ہو اور وہ اس خواہش کو پالے اور پھر اس سے اپنا ہاتھ روک کر دوسرے کی ضرورت کو اپنی ضرورت پر ترجیح دے کر وہ چیز اسے دے دے تو اللہ تعالیٰ اس کو بخش دے گا۔'' حضورؐ کا یہ ارشاد پیش کر کے حضرت عبداللہؓ نے فرمایا کہ میں نے اس مچھلی کی خواہش کو اپنے دل سے نکال دیا ہے اور اب اس کا کھانا مجھ پر حرام ہے، اسے اس سائل کو دے دو۔

جس رات حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو بکر صدیقؓ کے ہمراہ مکہ سے مدینہ

کے لیے ہجرت فرمائی وہی رات تھی جس کے لیے کفارِ مکہ کا یہ پروگرام تھا کہ آپؐ کے گھر پر سب مل کر ہلہ بول دیں اور آپؐ کو مار ڈالیں، لیکن حضرت علیؓ نے یہ سب کچھ جانتے ہوئے حضورؐ کے بستر پر اس رات سونے کے لیے اپنے آپ کو پیش کیا اور اس پر سو گئے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے جبرئیلؑ اور میکائیلؑ سے فرمایا کہ میں نے تم کو ایک دوسرے کے بھائی بنا رکھا ہے، تم میں سے کون ہے جو اپنی جان اپنے بھائی پر قربان کرنے کے لیے تیار ہو؟ لیکن کوئی بھی اس کے لیے تیار نہ ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: فرشتو! علی کو دیکھو، میں نے محمدؐ اور علیؓ کو آپس میں بھائی بنایا اور علیؓ اپنے بھائی پر جان قربان کرنے کے لیے بخوشی راضی ہو گیا اور اس کے بستر پر سو گیا کہ اس کے بھائی کے بجائے اسے مار ڈالا جائے۔ اب تم دونوں زمین پر جاؤ اور علیؓ کی اس کے دشمنوں سے حفاظت کرو۔ چنانچہ جبرئیلؑ اور میکائیلؑ فوراً زمین پر آئے اور ایک حضرت علیؓ کے سر کی طرف اور دوسرا پاؤں کی طرف کھڑا ہو گیا۔ اور جبرئیلؑ نے کہا: بَخٍ بَخٍ مَنْ مِثْلُکَ اِبْنَ اَبِیْ طَالِبٍ اِنَّ اللّٰہَ تَعَالٰی یُبَاھِیْ بِکَ عَلٰی مَلٰئِکَتِہٖ یعنی اے ابی طالب کے بیٹے! آج کون تیری مثل ہے کہ تیرے سبب اللہ تعالیٰ فرشتوں پر فخر کرتا ہے اور تو اطمینان کی نیند سو رہا ہے۔

حکایات میں ہے کہ جب غلام الخلیل[1] اہل حق کی عداوت پر کھلم کھلا اتر آیا تو اس نے نوریؒ اور رقامؒ اور ابو حمزہؒ کو گرفتار کرا کر خلیفہ کے روبرو پیش کر دیا اور خلیفہ سے کہا کہ یہ بے دینوں کے گروہ کے سردار ہیں۔ اگر آپ ان کے قتل کا حکم صادر فرما دیں تو بہت اچھا ہو۔ کیونکہ یہ اتنا بڑا نیکی کا کام ہے کہ جس شخص کے ہاتھ سے یہ صادر ہو اس کو خدا کے ہاں سے اجر دلانے کا میں ذمہ لیتا ہوں۔ خلیفہ نے فوراً ان تینوں کے قتل کا حکم دے دیا۔ اور جلاد نے ان میں سے رقامؒ کو پہلے قتل کرنے کا ارادہ کیا۔ اسے دیکھ کر نوریؒ اٹھے اور رقامؒ کی جگہ پر بیٹھ گئے اور ان کا چہرہ خوشی سے تمتما رہا تھا۔ یہ

---

[1] یہ ایک مکار اور ریاکار درویش تھا جو تصوف اور پارسائی کا مدعی تھا اور خلیفہ اور درباریوں کے نزدیک اس کی بڑی شہرت تھی۔ یہ اہل حق علماء درویشوں اور مشائخ کی برائی اہل ریاست کے ذہنوں میں ڈالتا رہتا تا کہ اس کی عزت اور قدر و منزلت دربار میں قائم رہے۔ حضرات نوری، رقام اور ابو حمزہ رحمہم اللہ کی مسلمانوں میں روز افزوں مقبولیت کو دیکھ کر اسے اندیشہ ہوا کہ کہیں اہل دربار و ریاست کا رجوع بھی انہی کی طرف نہ ہو جائے۔ اس لیے ان بزرگوں کو مستقل طور پر اپنے راستے سے ہٹانے کے لیے اس بہروپیے نے یہ تدبیر سوچی کہ ان کو سرکاری مشینری کے ہاتھوں قتل کروا دیا جائے۔

دیکھ کر حاضرین اور جلاّدوں کو سخت تعجب ہوا۔ جلاّد نے کہا: ''اے جواں مرد! تلوار ایسی چیز نہیں کہ رغبت کے ساتھ اپنے آپ کو اس کے سامنے پیش کیا جائے جیسا کہ تم نے بڑی خوشی سے اپنے آپ کو پیش کر دیا ہے۔ ابھی تیری باری نہیں آئی۔ حضرت نوری رحمۃ اللہ علیہ نے جواب دیا: ''ہاں میں بھی اس بات کو جانتا ہوں۔ مگر انسان کے پاس جان سے بڑھ کر اور کوئی شے عزیز نہیں ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ یہ چند سانس جو باقی ہیں ان کو اپنے بھائیوں پر نثار کر دوں۔ اس لیے کہ یہ دنیا خدمت کرنے کی جگہ ہے۔ اور آخرت قربِ خداوندی کی جگہ ہے اور وہاں قربت خدمت سے حاصل ہوتی ہے۔'' قاصد نے یہ خبر خلیفہ کو پہنچائی تو اس پر رقت طاری ہوگئی اور وہ اس بلندئ کردار اور کلام سے سخت متعجب ہوا۔ اس نے حکم دیا کہ قتل کے حکم کی تعمیل روک دی جائے اور قاضی القضاۃ ابو العباس کو بلا کر معاملہ اس کے سپرد کر دیا۔ وہ ان تینوں کو گرفتاری کی حالت میں اپنے گھر لے گیا۔ شریعت کے احکام اور ان کی حقیقت کے بارے میں ان سے گفتگو کی اور ہر لحاظ سے ان کو کامل پایا، اور ان کے معاملہ میں اُس سے جو غفلت ہوئی تھی اُس پر پشیمانی کا اظہار کیا۔ حضرت نوری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: اے قاضی! آپ نے صرف کچھ سطحی باتوں کے بارے میں دریافت کیا۔ فَاِنَّ لِلّٰهِ عِبَادٌ یَاْکُلُوْنَ بِاللّٰهِ وَیَشْرَبُوْنَ بِاللّٰهِ وَیَجْلِسُوْنَ بِاللّٰهِ وَیَقُوْلُوْنَ بِاللّٰهِ. یعنی اللہ کے کچھ بندے ایسے بھی ہیں جن کا کھانا، پینا، اٹھنا، بیٹھنا اور بولنا سب اللہ سے وابستہ ہے اور ان کی یہ کیفیت اگر ایک لمحہ کے لیے بھی ان سے دُور ہو جاتی ہے تو وہ بے قرار ہو جاتے ہیں اور ان کے اندر سے ایک شور اٹھتا ہے۔

قاضی آپ کی تاثیرِ کلام اور صحتِ حال سے بے حد متاثر ہوا اور اس نے خلیفہ کو لکھا کہ اگر یہ لوگ بے دین ہیں تو پھر دنیا میں موحّد کون ہے؟ خلیفہ نے ان سب کو اپنے پاس بلایا اور کہا کہ اگر کوئی حاجت ہو تو طلب کرو۔ انھوں نے کہا کہ آپ سے بس یہی حاجت ہے کہ آپ ہمیں بالکل فراموش کر دیں۔ نہ ہمیں نوازیں اور نہ ہماری راہ میں حائل ہوں۔ خلیفہ اس پر رو دیا اور بڑی عزت کے ساتھ ان کو رخصت کیا۔

نیکیوں کی چابی:

یاد رکھو کہ اللہ عزّ وجلّ نے تمام نیکیوں کی چابی اپنی محبوب چیزوں کو دوسروں پر خدا کی خوشنودی کے لیے خرچ کر دینے کو فرمایا ہے۔ ارشاد ہے: لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ (۳:۹۲) لوگو! تم ہرگز نیکی کو نہیں پہنچ سکتے جب تک کہ خدا کی راہ میں اپنی محبوب چیزوں کو خرچ نہ کرو۔" انسان کے پاس دنیا کی سب سے محبوب شے اس کی اپنی جان ہے۔ اور سب سے بلند مرتبہ یہ ہے کہ انسان اسے خدا کی راہ میں خرچ کر دے۔ ایسے لوگوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: "وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا بَلْ اَحْيَاءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ (۳:۱۶۹) یعنی جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے گئے ان کو مردہ مت سمجھو، وہ اپنے رب کے پاس زندہ ہیں۔ اور ان کو رزق دیا جاتا ہے۔" دوسری جگہ فرمایا: "وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ بَلْ اَحْيَاءٌ. یعنی جو لوگ اللہ کی راہ میں مارے جاتے ہیں ان کو مردہ مت کہو بلکہ وہ زندہ ہیں۔" حضرت رُوَیم رحمۃ اللہ علیہ کے پاس ایک شخص آیا اور عرض کیا کہ آپ مجھے کچھ نصیحت فرمائیں۔ آپ نے فرمایا: "يَا بُنَيَّ! لَيْسَ الْاَمْرُ غَيْرَ بَذْلِ الرُّوْحِ اِنْ قَدَرْتَ عَلٰى ذَالِكَ وَاِلَّا فَلَا تَشْتَغِلْ بِتُرَّهَاتِ الصُّوْفِيَاءِ. یعنی اے میرے بچے! جان کی بازی لگائے بغیر کام نہیں بنتا۔ اگر تجھے ایسا کرنے کی ہمت ہو تو اس راہ میں قدم رکھو، ورنہ صوفیوں کی لغویات میں مت پڑو۔"

۶۔ فرقہ سُہَیلیہ

خصوصیات:

فرقہ سُہَیلیہ کے پیشوا حضرت سہیل بن عبداللہ تستری رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ اہل تصوف میں صاحب حشمت بزرگ تھے اور ان کا طریقہ اجتہاد اور نفس کا مجاہدہ اور ریاضت تھا۔

مجاہدۂ نفس، اس کی اہمیت اور حقیقت:

حضرت علی ہجویری رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت سہیل کے مذہب کے ثبوت و وضاحت میں جو بحث کی ہے اس کا خلاصہ درج ذیل ہے:

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا (۲۹:۶۹) یعنی جو لوگ ہماری راہ میں مجاہدہ (جدوجہد) کریں گے ہم ان کو اپنا راستہ ضرور دکھائیں گے۔'' حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اَلْمُجَاهِدُ مَنْ جَاهَدَ نَفْسَهٗ. یعنی اصل مجاہد وہ ہے جو خدا کی راہ میں اپنے نفس سے جہاد کرے۔'' ایک اور موقع پر حضورؐ نے (میدان جنگ سے واپسی کے موقع پر) فرمایا: ''رَجَعْنَا مِنَ الْجِهَادِ الْاَصْغَرِ اِلَى الْجِهَادِ الْاَكْبَرِ. قِيْلَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ مَاالْجِهَادُ الْاَكْبَرُ قَالَ اَلَا وَهِيَ مُجَاهَدَةُ النَّفْسِ. یعنی ہم چھوٹے جہاد کی طرف سے بڑے جہاد کی طرف پلٹ آئے۔ صحابہؓ نے عرض کیا: یارسول اللہؐ! وہ جہادِ اکبر کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: آگاہ رہو وہ نفس کے خلاف مجاہدہ ہے۔'' اس سے معلوم ہوا کہ اپنے نفس کو ہر آن حدود اللہ کے اندر اور اُن کا پابند اور اللہ کی رضا کی راہ پر گامزن رکھنا میدانِ جنگ میں دشمنوں کے خلاف لڑنے سے بھی مشکل تر کام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مجاہدۂ نفس صوفیاء کے تمام مذاہب میں جاری ہے اور اسے بہت قابل تعریف سمجھا جاتا ہے۔ سہیلیہ اس بارے میں بہت نمایاں ہیں اور سہیل بن عبداللہ تستریؒ اس میں غلو کی حد کو پہنچے ہوئے تھے۔ ان کے بارے میں روایت ہے کہ ان کا معمول پندرہ روز کے بعد ایک دن کھانا کھانے کا تھا اور اس طرح سے انھوں نے بہت تھوڑی غذا سے لمبی عمر گزار دی۔ ان کے مذہب کی بنا یہ ہے کہ خود حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم راتوں کو بیداری، کم خوری اور روزوں کی صورت میں اس قدر نفس سے مجاہدہ فرماتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے آپؐ سے فرمایا: ''مَآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْقُرْاٰنَ لِتَشْقٰى (۲۰:۲) اے محمدؐ! ہم نے قرآن تجھ پر اس لیے نہیں اتارا کہ تم رنجیدہ ہو اور مصیبت میں پڑ جاؤ۔'' حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ مسجد کی تعمیر کے دوران حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی اینٹیں ڈھو رہے تھے۔ میں نے عرض کیا کہ آپ تکلیف نہ

فرمائیں۔ آپؐ کے حصہ کی اینٹیں میں ڈھونڈوں گا۔ آپؐ نے فرمایا: ''خُذْ غَیْرَھَا فَاِنَّهٗ لَا عَیْشَ اِلَّا عَیْشَ الْاٰخِرَةِ. یعنی اے ابوہریرہؓ! تو کسی دوسرے کے حصہ کی اینٹیں اٹھا۔ حقیقی زندگی تو صرف آخرت کی زندگی ہے۔ چنانچہ ارشاد باری ہے: ''لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ کَبَدٍ (۹۰:۴) دنیا میں تو آدمی کو ہم نے محنت اور مشقت اٹھانے ہی کے لیے پیدا کیا ہے۔'' حضرت حبانؒ بن خارجہ مکی سے روایت ہے کہ میں نے حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے غذا کے بارے میں دریافت کیا تو آپؓ نے فرمایا: ''اِبْدَاءْ بِنَفْسِکَ فَجَاھِدْھَا وَابْدَءْ بِنَفْسِکَ فَاغْزِھَا. یعنی مجاہدہ کرنا اپنے نفس سے شروع کر اور اسے خوب مشقت میں ڈال اور لڑائی اپنے نفس سے شروع کر اور اس سے خوب ڈٹ کر لڑ۔''

نفس کے ساتھ مجاہدہ اور لڑائی کرنے کے معنی اسے ''ھوا'' یعنی خواہش سے روکنا اور دُور رکھنا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَھَی النَّفْسَ عَنِ الْھَوٰی فَاِنَّ الْجَنَّةَ ھِیَ الْمَاْوٰی (۷۹:۴۰) یعنی جو اپنے رب کے روبرو کھڑا ہونے سے ڈرا اور اس نے اپنے نفس کو خواہش (کی پیروی) سے روکا تو ایسے شخص کا ٹھکانا جنت ہے۔'' اسی سلسلے میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: ''اَخْوَفُ مَا اَخَافُ عَلٰی اُمَّتِیْ اِتِّبَاعُ الْھَوٰی وَطُوْلَ الْاَمَلِ. یعنی مجھے اپنی امت کے بارے میں جس چیز کا سب سے بڑھ کر خوف ہے وہ ان کے خواہشات کے پیچھے چل پڑنے اور لمبی آرزوؤں میں پڑ جانے کا ہے۔''

ھوائے نفس کی دو قسمیں:

ھوائے نفس کی دو قسمیں ہیں۔ ایک خواہشِ لذت وشہوت اور دوسرے مرتبہ وریاست کی خواہش۔ اوّل الذکر انسان کی ذات سے متعلق ہے اور اس میں عام مخلوقِ خدا اُس کے شر اور فتنے سے مامون و بے خوف ہوتی ہے۔ لیکن دوئم الذکر کا فتنہ اس کے ساتھ عام مخلوقات کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے اور مساجد اور گرجے بھی محفوظ نہیں رہتے۔ اس میں مبتلا لوگ خود گمراہ ہوتے ہیں اور مخلوقات کو گمراہی کی طرف بلاتے اور اس میں پڑنے کے لیے ان کو مجبور کرتے ہیں۔ اس لیے اس سے اجتناب اور اس کا سدِ باب اوّل الذکر سے بھی بڑھ کر ضروری اور اہم ہے۔

۷۔ فرقہ حکیمیہ

خصوصیت:

حکیمیہ فرقہ کے پیشوا حضرت ابوعبداللہ محمد بن علی حکیم ترمذی رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ ان کا مسلک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اولیاء کا ایک گروہ ہے جسے وہ تمام مخلوقات سے برگزیدہ فرماتا ہے۔ وہ اپنے نفس اور خواہشات پر قابو رکھتے ہیں۔ ان کو حقیقت کا علم ہوتا ہے اور ان سے کرامت کا ظہور ہوسکتا ہے۔

ولایت اور اس کی حقیقت:

حضرت علی ہجویریؒ نے اس بارے میں کلام کرتے ہوئے "ولایت" پر جو بحث فرمائی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ 'ولی' کے معنی دوست کے ہیں۔ جو شخص اللہ کی دوستی اختیار کرے اور اس دوستی کو ہر دوسری دوستی سے عزیز تر رکھے وہ اللہ کا ولی ہے۔

انسانوں میں سے کچھ لوگ اللہ کے اولیاء یعنی دوست ہیں جن کو اللہ تعالیٰ برگزیدہ فرماتا ہے۔ وہ نفس اور ھوا کی بندگی سے پاک ہوتے ہیں۔ خدا سے ان کی محبت دوسری تمام محبتوں سے بڑھ کر ہوتی ہے۔ ایسے لوگ ہر زمانے میں ہوتے ہیں اور قیامت تک ہوتے رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: اَلَا اِنَّ اَوْلِیَاءَ اللّٰهِ لَاخَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا هُمْ یَحْزَنُوْنَ (۱۰:۶۲) یعنی آگاہ رہو کہ اللہ کے اولیاء (یعنی اس کے دوستوں) کے لیے نہ تو کوئی خوف ہے اور نہ ہی کوئی غم۔" اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "اِنَّ مِنْ عِبَادِ اللّٰهِ لَعِبَادًا یَغْبِطُهُمُ الْاَنْبِیَآءُ وَالشُّهَدَآءُ، قِیْلَ مَنْ هُمْ یَارَسُوْلَ اللّٰهِ؟ صِفْهُمْ لَنَا لَعَلَّنَا نُحِبُّهُمْ. قَالَ قَوْمٌ تَحَابُّوْا بِرُوْحِ اللّٰهِ مِنْ غَیْرِ اَمْوَالٍ وَلَا اکْتِسَابٍ وُجُوْهُهُمْ نُوْرٌ عَلٰی مَنَابِرَ مِنْ نُوْرٍ لَایَخَافُوْنَ اِذَا خَافَ النَّاسُ وَلَا یَحْزَنُوْنَ اِذَا حَزِنَ النَّاسُ ثُمَّ تَلَا: اَلَا اِنَّ اَوْلِیَاءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَیْهِمْ وَلَا

هُمْ يَحْزَنُوْنَ. وَاَيْضًا قَالَ النَّبِىُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمْ، يَقُوْلُ اللّٰهُ عَزَّوَجَلَّ مَنْ اٰذٰى وَلِيًّا فَقَدِ اسْتَحَلَّ مُحَارَبَتِىْ. یعنی اللہ کے بندوں میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جن پر انبیاء اور شہداء بھی رشک[1] کرتے ہیں۔ صحابہؓ نے عرض کیا کہ: یارسولؐ اللہ! وہ لوگ کون ہیں؟ ان کی صفت بیان فرمائیے تاکہ ہم ان سے محبت کریں (اور ان کی صحبت اختیار کریں) حضورؐ نے فرمایا: وہ ایک گروہ ہے جو مال و دولت اور تمام دوسری چیزوں سے بڑھ کر اللہ کے احکام کو محبوب رکھتا ہے۔ قیامت کے روز ان کے چہرے سراسر نور ہوں گے اور وہ نور کے منبروں پر بیٹھے ہوں گے، جب دوسرے لوگ خوفزدہ ہوں گے انھیں کوئی خوف نہ ہوگا، اور جب دوسرے لوگ غمزدہ ہوں گے انھیں کوئی غم نہ ہوگا۔ پھر آپؐ نے یہ آیت پڑھی: اَلَا اِنَّ اَوْلِيَاءَ اللّٰهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ. اور حضورؐ نے یہ بھی فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جس نے میرے کسی ولی کو اذیت دی، اس کے خلاف جنگ کرنا میرے لیے جائز ہوگیا۔“

اس بارے میں اختلاف ہے کہ آیا ولی کو اپنے ولی ہونے کی خبر ہوتی ہے یا نہیں؟ حضرت ابویزید رحمۃ اللہ علیہ سے لوگوں نے پوچھا کہ ولی کی پہچان کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: ”اَلْوَلِىُّ هُوَالصَّابِرُ تَحْتَ الْاَمْرِ وَالنَّهْىِ. یعنی ولی وہ ہے جو خداوند تعالیٰ کے امر اور نہی پر ڈٹ جاتا ہے۔“ اس لیے کہ جس قدر گہرا خدا سے کسی کا تعلق ہوگا اور اس سے اپنی دوستی میں صادق اور مخلص ہوگا اسی قدر اس کے دل میں خدا کے حکم کی عظمت اور عزت زیادہ ہوگی۔

اولیاء اور شریعت:

ایسے لوگ ملحد ہیں اور ان پر خدا کی لعنت ہو جو یہ کہتے ہیں کہ ولی شریعت الٰہی کی پابندیوں

---

[1] حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے صاف واضح ہوگیا کہ خدا کے اولیاء وہ لوگ ہیں جو خدا کی محبت وتعلق اور اس کے احکام کو دوسری ہر محبت وتعلق اور دوسرے ہر حکم پر مقدم اور اس سے عزیز تر رکھیں، اور جو چیز بھی ان سے ٹکرائے وہ اس کے حکم کا ساتھ دیں۔

رہی یہ بات کہ ان پر انبیاء اور شہداء رشک کریں گے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اولیاء انبیاء سے افضل اور بلند مرتبہ ہیں۔ خدا کی مخلوق میں سب سے افضل اور بلند مرتبہ انبیاء علیہم السلام ہیں۔ رشک کی وجہ یہ ہوگی کہ یہ وہ لوگ ہیں جن پر نہ خدا کی طرف سے وحی آئی۔ نہ انھوں نے خدا، نہ اس کے فرشتوں اور نہ ان حقیقتوں کو براہ راست دیکھا جن کا مشاہدہ انبیاء علیہم السلام کو کرایا جاتا ہے۔ انبیاء کی تعلیم بھی ان تک بالواسطہ پہنچی۔ یہ محض فہم وفراست سے کام لے کر ایمان وعمل اور خدا کی فرمانبرداری اور ملازمت کے اس درجہ کمال کو پہنچ گئے۔

سے آزاد ہوتا ہے۔ حضرت ابو یزیدؒ کے بارے میں روایت ہے کہ آپ کو کسی نے بتایا کہ فلاں شہر میں ایک ولی ہے۔ آپ بیان کرتے ہیں کہ میں یہ سن کر اس کی زیارت کے لیے اس شہر میں گیا، اور اس کے محلے کی مسجد میں پہنچا۔ جب وہ شخص مسجد میں آیا تو میں نے دیکھا کہ اس نے مسجد میں تھوک پھینکی۔ اس کی یہی حرکت دیکھ کر واپس پلٹ آیا۔ کیونکہ اس کی یہ حرکت دیکھ کر میرے دل نے کہا کہ اگر یہ خدا کا ولی ہوتا تو خدا کی شریعت پر لازماً نگاہ رکھتا۔ اور خدا کے گھر کا احترام کرتا۔ اسی رات میں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا۔ آپؐ نے فرمایا: اے ابو یزید! جو کام تو نے کیا اس میں اللہ تعالیٰ تمہیں برکت عطا فرمائے۔

اولیاء سے کرامتوں کا ظہور:

اولیاء اللہ سے کرامتوں کا ظہور ہوتا ہے۔ اس میں کوئی چیز عقل کے خلاف نہیں ہے۔ کرامت اس فعل کو کہتے ہیں جو خلافِ عادت ہو۔ اس کا ظہور خدا کی طرف سے ولی کے ذریعے سے ہوتا ہے اور اس کا مقصد ولی کی تکریم اور عزت افزائی کا اظہار ہوتا ہے۔ یعنی اس بات کا مظاہرہ کہ وہ خدا کے نزدیک برگزیدہ اور بزرگ ہے۔ استدلالی قوت کے ذریعے حق کو باطل سے الگ چھانٹ کر رکھ دینا بھی ولایت کی نشانی ہے۔

معجزہ اور کرامت:

معجزہ اور کرامت میں یہ فرق ہے کہ معجزہ نبی کے ہاتھ سے صادر ہوتا ہے اور نبی کو اپنے معجزہ کے بارے میں پورا یقین ہوتا ہے۔ کرامت کے بارے میں ولی یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ یہ کرامت ہے یا استدراج۔ نیز صاحبِ معجزہ نبی ہونے کی وجہ سے شریعت الٰہی کے اوامر و نواہی میں تصرّف کر سکتا ہے۔ کیونکہ وہ خود شارع ہوتا ہے۔ لیکن ولی صاحبِ کرامت ہونے کے باوجود قطعی طور پر شریعت الٰہی کے تابع ہوتا ہے۔ اور اس کے لیے تسلیم اور قبولِ احکام کے سوا کوئی چارہ نہیں۔ اس کی کوئی کرامت بھی نبی کی شریعت کے خلاف نہیں ہو سکتی۔

اولیاء اور عصمت:

اولیاء معصوم نہیں ہوتے۔ اس لیے کہ عصمت صرف نبوت کی شرط ہے۔ کسی شخص سے خرقِ عادت (بظاہر حال کرامت) کا ظہور اس کے برگزیدہ یا ولی ہونے کی قطعی دلیل نہیں۔ اگر اس کی زندگی شریعتِ الٰہی کے تابع اور اس کے مطابق ہے تو یہ اس کے ولی ہونے کی علامت ہو سکتی ہے، ورنہ اس سے خرقِ عادت کے ظہور کی حیثیت وہی ہوگی جو دجال کے ہاتھوں ظاہر ہونے والے بعض خرقِ عادت واقعات کی ہوگی۔ فرمانبرداری (کتاب و سنت کا کامل اتباع) ولایت کی ایک لازمی شرط ہے۔ لیکن 'ولی' گناہ اور نافرمانی سے پاک نہیں ہوتا۔ اس سے گناہ اور نافرمانی کا ارتکاب ہوسکتا ہے۔ گناہ اور نافرمانی ولایت کے منافی نہیں ہیں۔ ولایت کی نفی ایمان کی نفی اور ارتداد سے ہوتی ہے نہ کہ نافرمانی اور گناہ گاری سے۔ محمد بن علی حکیم ترمذی، جنید بغدادی، ابوالحسن نوری اور حارث محاسبی رحمہم اللہ تعالیٰ کا یہی مذہب ہے۔ سہل بن عبداللہ تستری، ابوسلیمان دُرّانی اور ابوحمدون قصار وغیرہم رحمہم اللہ تعالیٰ کا مذہب یہ ہے کہ ولایت کی شرط فرمانبرداری پر قائم رہنا ہے۔ جب کبیرہ گناہ ولی کے دل پر گزرے گا تو وہ فوراً ولایت سے معزول ہو جائے گا۔

صحیح صورت یہ ہے کہ ولی یعنی خدا کے دوست سے اس کی نافرمانی بالعموم احیاناً ہوتی ہے۔ اور جب اس سے نافرمانی ہو جاتی ہے تو وہ متنبہ ہوتے ہی فوراً توبہ کر کے اللہ تعالیٰ سے اپنا تعلق درست کرنے کی فکر کرتا ہے۔

کرامتوں کے واقعات:

۱۔ روایت ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرؓ جا رہے تھے کہ آپ نے دیکھا کہ راستے میں بہت سے لوگوں کو شیر روکے کھڑا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے شیر کو مخاطب کر کے فرمایا: ''اے کتے! اگر تجھے خدا نے کوئی حکم دیا ہے تو اپنا کام کر ورنہ ہمارا راستہ چھوڑ دے''۔ آپؓ کی یہ بات سن کر شیر راستہ چھوڑ کر چلا گیا۔

۲۔ روایت ہے کہ ایک عجمی نوجوان حضرت عمرؓ کے قتل کے ارادے سے مدینہ میں آیا۔ اس

نے لوگوں سے آپؓ کا پتہ دریافت کیا۔ لوگوں نے بتایا کہ کہیں غیر آباد جگہ میں سوئے ہوئے ہوں گے۔ وہ آپؓ کی تلاش میں نکلا اور دیکھا کہ آپؓ بالکل تنہا ایک درخت کے نیچے زمین پر پڑے سو رہے ہیں۔ اس نے دل میں خیال کیا کہ اس حالت میں ان کو مار ڈالنا بہت آسان ہے۔ اور وہ تلوار سونت کر حملہ کے ارادے سے آپؓ کی طرف لپکا۔ اس کا آپؓ کی طرف بڑھنا تھا کہ اس نے دیکھا کہ دو شیر اُس پر حملہ کے لیے اس کی طرف لپکے۔ چنانچہ وہ خوف کے مارے مدد کے لیے چیخا۔ حضرت عمرؓ بیدار ہوئے اور آپؓ نے اس سے چیخنے کا سبب دریافت کیا۔ اس شخص نے سارا قصہ کہہ سنایا اور مشرف بہ اسلام ہوا۔

۳۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دور خلافت کا واقعہ ہے کہ عراق سے حضرت خالدؓ بن ولید کے پاس کچھ تحفے آئے جن میں ایک ڈبیہ زہر کی بھی تھی۔ جس کے بارے میں قاصد نے بتایا کہ ایسا زہر قاتل کسی بادشاہ کے خزانہ میں نہیں۔ اس کی ذرا سی مقدار بھی آدمی کو مار ڈالتی ہے۔ حضرت خالدؓ نے فرمایا کہ زندگی اور موت صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے، کوئی اور شے کسی کا کچھ نہیں بگاڑ سکتی اور بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھ کر اس شیشی میں سے زہر لے کر کھالیا۔ آپؓ پر اس زہر کا کچھ بھی اثر نہ ہوا۔ اسے دیکھ کر بہت سے لوگ مسلمان ہو گئے۔

۴۔ حضرت ابراہیم ادھم رحمۃ اللہ علیہ بیان کرتے ہیں کہ میں نے ایک دفعہ ایک چرواہے سے پانی مانگا۔ اس نے کہا کہ پانی تو میرے پاس نہیں البتہ دودھ ہے وہ آپ جتنا چاہیں لے سکتے ہیں۔ میں نے کہا کہ مجھے تو پانی کی ضرورت ہے۔ اس پر اس چرواہے نے اپنا عصا اٹھا کر ایک پتھر پر مارا اور اس سے ایک نہایت صاف اور پاکیزہ پانی کا چشمہ بہہ نکلا۔ میں اس کے اس معاملہ کو دیکھ کر متعجب ہوا۔ اس نے کہا کہ تعجب کی کوئی بات نہیں ہے۔ جب بندہ اللہ عزوجل کا مطیع فرمان ہو جاتا ہے تو دنیا کی تمام چیزیں اس کی مطیع ہو جاتی ہیں۔

۵۔ حضرت ابراہیم رقی رحمۃ اللہ علیہ بیان کرتے ہیں کہ میں اپنی ابتدائی حالت میں مسلم مغربی رحمۃ اللہ علیہ کی زیارت کے لیے گیا۔ جب میں ان کی مسجد میں پہنچا تو وہ جماعت کرا رہے تھے اور سورۂ فاتحہ غلط پڑھ رہے تھے۔ میں نے یہ دیکھ کر اپنے دل میں خیال کیا کہ سفر کی مشقت

ضائع ہو گئی۔ وہ رات میں نے وہاں گزاری اور صبح طہارت وغیرہ کے لیے نکلا کہ فرات کے کنارے جا کر وضو کروں۔ راستہ میں ایک شیر سویا ہوا تھا وہ مجھ پر حملہ آور ہوا۔ میں واپس بھاگا اور شیر میرے پیچھے آ رہا تھا۔ میں بھاگتا ہوا مسجد میں آ گیا۔ اتنے میں حضرت مسلم اپنی عبادت گاہ سے باہر نکلے اور آپ نے شیر کو کان سے پکڑ لیا اور اس کا کان مروڑتے ہوئے اس سے کہا: ''اے خدا کے کتو! کیا میں نے تم کو نہیں کہا تھا کہ میرے مہمانوں کو نہ ستانا۔'' اور اس کے بعد آپ نے مجھ سے کہا: ''ابو اسحاق! تم ظاہر کے آراستہ کرنے میں مشغول ہو تبھی تو خدا کی مخلوق سے خوف کھاتے ہو۔ خدا کی خاطر باطن کو درست کرو تو مخلوقات کے خوف سے آزاد ہو جائے گے۔'' نزول ہدایت سے اصل مطلوب احکامِ الٰہی کے منشاء اور مقصود کو سمجھنا اور ان کو عملی جامعہ پہنانے کی دل و جان سے سعی کرنا ہے۔ لب ولہجہ، طرز ادا اور طریق قرأت سب ثانوی چیزیں ہیں۔ چنانچہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں عام اجازت تھی کہ جس طرح کوئی پڑھ سکتا ہے پڑھے لیکن اس کے منشاء و مقصود کو سمجھنے اور اس پر دل و جان سے گامزن ہونے کی کوشش کرے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ (۲۵:۵۷) یعنی ہم نے اپنے رسولوں کو واضح احکام کے ساتھ بھیجا اور ان کے ساتھ کتاب اور میزان نازل کی اور اس کی غرض یہ ہے کہ لوگ انصاف (ہماری اطاعت و بندگی) پر قائم ہوں۔''

انبیاؑء اور اولیاء:

یہ بات بھی اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ طریقت کے تمام شیوخ کا اس بات پر اتفاق ہے کہ اولیاء ہر حال میں انبیاء علیہم السلام کے پیرو ہیں۔ اور ان کی دعوت کی تصدیق کرنے والے ہیں۔ اس لیے کہ نبوت کی جو ابتداء ہے وہ ولایت کی انتہا ہے۔ تمام انبیاؑء اولیاء ہوتے ہیں لیکن کوئی ولی نبی نہیں بن سکتا۔ نبی صفات بشری کی نفی میں اصل ہیں اور اولیاء اس میں عارضی ہیں۔ اور میں علی بن عثمان جلابی کہتا ہوں کہ جو شخص انبیاء کا پیرو نہ ہو اور اپنے آپ کو ولی خیال کرتا ہو تو وہ شیطان کا ولی ہے، اللہ کا ولی نہیں ہو سکتا۔

۸۔ فرقہ خرازیہ

خصوصیات:

فرقہ خرازیہ کے پیشوا حضرت ابو سعید خراز رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ تصوف میں فنا اور بقا کی اصطلاح انھوں نے ہی جاری کی ہے۔ تصوف میں اپنے مقصود کو انھوں نے انہی دو اصطلاحات میں واضح کیا ہے۔

''فنا'' اور ''بقا'' کی حقیقت:

خرازیہ کے اس مذہب کی صراحت حضرت علی ہجویریؒ نے حسب ذیل طریق پر کی ہے۔

بعض لوگوں کے نزدیک فنا سے مراد اپنی ذات اور اپنے وجود کو مٹا دینا ہے اور بقاء سے مراد خدا سے متحد ہو کر اس سے پیوستہ ہو جانا یا بالفاظ دیگر اس میں حُلول کر جانا ہے۔ لیکن کھلی بات ہے کہ قدیم اور محدث، خالق اور مخلوق، صانع اور مصنوع کا امتزاج نہیں ہو سکتا اور نہ یہ ممکن ہے کہ انسان کا وجود فنا ہو کر خدا کے وجود میں حلول کر جائے۔ کسی شخص کو خدا اور اس کی صفات کے ساتھ مشارکت نہیں ہے اور نہ ہو سکتی ہے۔ اس قسم کا عقیدہ رکھنا صریح کفر ہے اور دہریوں کا مذہب ہے۔

علم کے میدان میں فنا کا مفہوم یہ ہے کہ تم جان لو کہ یہ دنیا اور اس کے سب متعلقات عارضی اور فانی ہیں۔ اور بقا کا مطلب یہ ہے کہ تم یہ جان لو کہ عقبیٰ اور جو کچھ خدا کے پاس ہے وہی باقی اور ہمیشہ رہنے والی چیزیں ہیں۔ جیسا کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ''كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَيَبْقَى وَجْهُ رَبِّكَ ذُوالْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ (۵۵:۲۷) یعنی جو کچھ اس زمین پر ہے سب فانی ہے اور باقی صرف تیرے صاحبِ جلال واکرام رَب کی ذات رہے گی۔'' نیز فرمایا: ''وَالْآخِرَةُ خَيْرٌ وَأَبْقَى (۸۷:۱۷) یعنی آخرت بہتر اور باقی رہنے والی ہے۔'' دنیا میں جو کچھ بھی انسان کو حاصل ہے یا حاصل ہو سکتا ہے وہ سب فنا ہو جانے والا ہے۔ جیسا کہ خداوند تعالیٰ نے فرمایا: ''مَا عِنْدَكُمْ

يَنفَدُ وَ مَاعِندَاللّٰهِ بَاقٍ (۱۶:۹۶) یعنی جو کچھ تمھارے پاس ہے وہ سب ختم ہو جانے والا ہے اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہی باقی رہنے والا ہے۔'' علمی لحاظ سے فنا اور بقا کے یہی معنی ہیں جو خداوند تعالیٰ نے خود واضح فرما دیے ہیں۔

عمل کے میدان میں فنا و بقا کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اپنے اندر سے جہل و غفلت اور خدا کی نافرمانی اور خواہشاتِ نفس کی پیروی کو فنا کرے۔ تا آنکہ خدا کا علم و ذکر اور اس کی فرمانبرداری ہی اس کے ساتھ باقی رہ جائے۔

حضرت ابراہیم شیبانی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''عِلْمُ الْفَنَاءِ وَالْبَقَاءِ يَدُوْرُ عَلَى الْإِخْلَاصِ وَالْوَحْدَانِيَّةِ وَصِحَّةِ الْعَبُوْدِيَّةِ، وَمَا كَانَ غَيْرُ هٰذَا وَهُوَ الْمُغَالِيْطُ وَالزَّنْدَقَةُ. یعنی فنا و بقا کے علم کے مرکز و محور اخلاص اور انسان کی ساری زندگی میں خالص توحید کا جاری و ساری ہونا اور بندگی میں درستی ہیں۔ جو لوگ فنا و بقا سے اس کے علاوہ کچھ اور مراد لیتے ہیں وہ بے دین اور زندیق ہیں۔'' ان کو دینِ حق سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

پس ''فنا'' اور ''بقا'' کی بحث کا اصل ماحصل صرف یہ ہے کہ آدمی اس زندگی اور اس دنیا کی عارضی اور فنا ہو جانے والی چیزوں کو مقصودِ زندگی بنانے کے بجائے اپنی توجہ اور ساری سعی و جہد کا مرکز و محور آخرت کو بنائے جو خَيْرٌ وَّاَبْقٰى ہے۔ بہتر بھی ہے اور ہمیشہ رہنے والی بھی ہے۔ اور آخرت کی بھلائی کی راہ اپنی پوری زندگی میں خدا کی فرمانبرداری اختیار کرنا ہے۔

۹۔ فرقہ خفیفیہ

خصوصیت:

خفیفی مذہب کے پیشوا ابو عبداللہ محمد بن خفیف شیرازی رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔ جو اپنے وقت میں ظاہری اور باطنی علوم کے عالم تھے۔ ان کی نمایاں خصوصیت شہوانی خیالات کے سلسلے میں کمال درجے کی عفت تھی۔ آپ شاہی گھرانے کے فرد تھے۔ میں نے سنا ہے کہ توبہ سے پہلے آپ نے

چار سو عورتوں سے نکاح کیے۔ پھر آپؒ نے توبہ کی اور شیراز کے ایک بزرگ سے تقرب حاصل کیا۔ توبہ کے بعد بھی بادشاہوں اور رئیسوں کی بیٹیاں حصول برکت کی خاطر آپ سے نکاح کرتی تھیں۔ اس طرح تقریباً چالیس عورتوں نے آپ سے نکاح کیے۔ لیکن آپ ان سب کو مقاربت کیے بغیر کنوارپنے ہی میں طلاق دے دیتے تھے۔ ایک وزیرزادی سے آپ کا نکاح ہوا۔ صرف وہ آپ کے ساتھ چالیس برس تک رہی۔ وہ فرماتی ہیں کہ آپؒ نے مجھے دکھایا کہ سینے سے ناف تک آپ کے پیٹ میں اندر کی طرف بارہ گرہیں لگی ہوئی ہیں۔ یہ دکھا کر آپ نے فرمایا: اے وزیر کی بیٹی! یہ سب صبر کی گانٹھیں ہیں۔ ہم نے خوبصورت چہروں اور عمدہ کھانوں سے اب صبر کرلیا ہے۔

غیبت اور حضور کی حقیقت:

جس طرح فرقہ خرازیہ نے اپنے تصوف کو فنا اور بقا کی اصطلاحات میں بیان کیا ہے۔ خفیفیہ نے اسے ''غیبت اور حضور'' کی اصطلاحات میں بیان کیا ہے۔ غیبت سے مراد یہ ہے کہ آدمی کا دل ماسوا اللہ سے غائب ہو۔ یہاں تک کہ اپنے آپ سے بھی غائب ہو۔ اور بہ حق (خداوند تعالیٰ کے حضور) حاضر ہو۔ اس کی نشانی رسموں (Formalities) سے بے پرواہ ہو جاتا ہے۔ اس کو مثال سے یوں سمجھ سکتے ہیں کہ جب ایک غلام اپنے آقا کے حضور میں ہوتا ہے تو اس کی ساری توجہ آقا کی رضا و خوشنودی اور اس کے حکام کو سمجھنے اور ان کی ٹھیک ٹھیک تعمیل پر مرتکز ہوتی ہے۔ اسے کسی اور چیز کا تو درکنار خود اپنے وجود کا بھی ہوش نہیں ہوتا۔ یہ حال اس شخص کا ہوتا ہے جسے ہر آن اپنے خدا کے سامنے اور اس کے حضور میں موجود ہونے کا شعور اور احساس ہو۔

مشائخ عظام میں اس بارے میں اختلاف ہے کہ آیا ''غیبت'' ''حضور'' پر مقدم ہے یا ''حضور'' ''غیبت'' پر۔ حالانکہ یہ بحث فضول ہے۔ جب آدمی حضور بہ حق ہوگا تو اپنے آپ سے غائب ہوگا اور جب اپنے آپ سے غائب ہوگا تو حضور بہ حق ہوگا۔ دونوں چیزیں لازم و ملزوم ہیں۔

''غَیبت'' اور ''حضور'' کی کیفیت:

مشہور ہے کہ حضرت ذوالنونؒ کے مریدوں میں سے ایک شخص نے حضرت بایزیدؒ کی

زیارت کا قصد کیا۔ جب وہ ان کی عبادت گاہ پر پہنچا تو اس نے دروازے کو دستک دی۔ اندر سے ابو یزیدؒ نے پوچھا کہ کون ہے اور کیا کام ہے؟ اس نے جواب دیا کہ بایزیدؒ سے ملنا چاہتا ہوں۔ ابو یزیدؒ نے حیرت سے پوچھا: ابو یزید کون ہے اور کہاں رہتا ہے؟ مدت ہوئی کہ میں نے اسے تلاش کیا مگر مجھے وہ نہ ملا۔ چنانچہ یہ شخص حضرت ذوالنونؒ کے پاس واپس آیا اور اس نے سارا قصہ بیان کیا تو ذوالنونؒ نے کہا: ''اَخِی اَبُوْیَزِیْدَ ذَهَبَ فِی الذَّاهِبِیْنَ اِلَی اللّٰهِ، یعنی میرا بھائی ابو یزید خدا کی طرف جانے والوں میں شریک ہو گیا۔''

۱۰۔ فرقہ سیّاریہ

خصوصیت:

سیاری فرقہ کے لوگ ابوالعباس سیاری رحمۃ اللہ علیہ کے پیرو ہیں جو مَرو میں امام تھے۔ اور تمام علوم میں عالم اور ابوبکر واسطیؒ کے مصاحب تھے۔ ان کے مذہب کی خصوصیت یہ ہے کہ انھوں نے تصوف کو ''جمع'' اور ''تفرقہ'' کی اصطلاحات میں بیان کیا ہے۔

سیاری مذہب کے سوا تصوف میں کوئی مذہب اپنی اصلی حالت پر نہیں رہا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ نساء اور مرو میں کوئی وقت ایسا نہیں گزرا جبکہ اس مذہب کا کوئی مقتداء موجود نہ رہا ہو۔ چنانچہ اب بھی نساء اور مرو میں ابوالعباس سیاریؒ کے اصحاب میں سے بہت لوگ موجود ہیں۔ خاص کر اہل نساء اور مرو کے پاس اس فرقہ کے عمدہ رسائل ہیں۔ میں (علی بن عثمان جلابی نے ان کے بعض رقعات کا مرو میں مطالعہ کیا ہے، بہت ہی عمدہ ہیں۔ ان کی عبارتوں کی بنا جمع اور تفرقہ پر ہے۔ محاسبی، نحوی، فقہاء، اور اہل تصوف سبھی ان اصطلاحات کو استعمال کرتے ہیں۔ لیکن ہر گروہ کی ان سے مراد علیحدہ علیحدہ ہے۔

جمع اور تفرقہ کے معنی اور حقیقت:

''سیاریہ'' نے ان اصطلاحات سے جو مراد لیا ہے اور ان کے درمیان اس سلسلے میں جو

اختلاف ہے اس کا خلاصہ یہ ہے:

تمام اہل سنت والجماعت کا اس پر اتفاق ہے کہ "اَلْجَمْعُ مَا جَمَعَ بِاَوْصَافِهٖ وَالتَّفْرِقَةُ مَا فَرَقَ بِاَفْعَالِهٖ. یعنی جمع وہ ہے جو اپنے اوصاف سے جمع ہو اور تفرقہ وہ ہے جو اپنے افعال سے جدا ہو۔" مطلب یہ ہے کہ جب انسان خدائی یعنی خدا کے پسندیدہ اوصاف سے اس طرح متصف ہو کہ اس کے اوصاف اور افعال میں کوئی تناقص نہ پایا جائے، یہاں تک کہ اللہ نے اسے ارادے اور تصرف کی جو آزادی عطا فرمائی ہے اس سے بھی خدا کے حق میں دست بردار ہو جائے تو وہ جمع کی حالت میں ہے۔ اور اگر اس کے اندر خدا کی پسندیدہ سب صفات جمع نہیں اور اس کی صفات وافعال میں تناقض وتفرقہ پایا جاتا ہے تو وہ تفرقہ کی حالت میں ہے۔ حضرت ابوعلی رودباری رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ بندے کے اوصاف میں جمع سے مراد اس کا صدق عقیدت کے ساتھ صحیح عزیمت کے ساتھ توحید پر قائم ہونا ہے۔ دوسرے الفاظ میں بندے کے تمام اقوال اور افعال عین حق کے مطابق ہوں۔ اس کے ہر قول اور فعل کا سرچشمہ اور اس کی نسبت خدا کی طرف ہو۔ حدیث قدسی ہے کہ "لَایَزَالُ عَبْدِیْ یَتَقَرَّبُ اِلَیَّ بِالنَّوَافِلِ حَتّٰی اُحِبَّهٗ فَاِذَا اَحْبَبْتُهٗ کُنْتُ سَمْعًا وَبَصَرًا وَّیَدًا وَّلِسَانًا فَبِیْ یَسْمَعُ وَبِیْ یُبْصِرُ وَبِیْ یَنْطِقُ وَبِیْ یَبْطِشُ، یعنی میرا بندہ نوافل کے ذریعے میرا تقرب حاصل کرتا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں، اور جب میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں تو میں اس کے کان، آنکھ، ہاتھ اور زبان بن جاتا ہوں، پھر وہ جو کچھ بھی سنتا، دیکھتا، بولتا یا چھوتا ہے سب میرے لیے اور میرے ذریعہ سے کرتا ہے۔" یہی وجہ ہے کہ حضورؐ کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "وَمَا رَمَیْتَ اِذْ رَمَیْتَ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰی (۸: ۱۷) اے محمدؐ! (وہ ریت کی مٹھی) تو نے نہیں پھینکی بلکہ میں نے پھینکی"۔ اور دوسری جگہ فرمایا: "اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَكَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰهَ (۴۸: ۱۰) اے میرے حبیبؐ! جو لوگ تجھ سے بیعت کرتے ہیں وہ در حقیقت اللہ سے بیعت کرتے ہیں۔" نیز یہ کہ "مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ (۴: ۸۰) یعنی جس نے رسول کی فرمانبرداری کی اس نے اللہ کی فرمانبرداری کی"۔ نیز یہ کہ "قُلْ اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَیَغْفِرْ لَكُمْ

ذُنُوْبَکُمْ (۳۱:۳)اے محمدؐ!ان سے کہہ دو کہ اگر تم حقیقت میں اللہ سے محبت رکھتے ہو، تو میری فرمانبرداری اختیار کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمھاری خطاؤں سے درگزر فرمائے گا۔''

جمع وتفرقہ کے بارے میں صوفیاء کا اختلاف:

جمہور صوفیائے کرام کے نزدیک جمع سے مراد مواہب اور تفرقہ سے مراد مکاسب ہیں۔ یعنی جو کچھ بندے کو کسب کے ذریعے ...... مجاہدے اور اپنی سعی وکوشش ...... سے حاصل ہوتا ہے وہ تفرقہ ہے۔ اور جو کچھ بلا کسب ومجاہدہ محض خدا کی عنایت سے بطور عطیہ ملتا ہے وہ سب جمع ہے۔ کسب میں سب سے بڑا مرتبہ یہ ہے کہ مجاہدہ میں انسان اپنے فعل کی آفتوں سے خدا کے جمال کے ساتھ خلاصی پائے ہوئے ہو۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنے افعال میں یہ احساس اور شعور رکھتا ہو کہ گویا اللہ تعالیٰ کو سامنے دیکھ رہا ہے۔ یہ وہی بات ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبرئیل علیہ السلام کے سامنے بیان فرمائی اور انھوں نے اس کی تصدیق کی: ''اَنْ تَعْبُدَ اللّٰہَ کَاَنَّکَ تَرٰہُ فَاِنْ لَمْ تَرٰہُ فَاِنَّہٗ یَرٰکَ، یعنی تو اللہ کی بندگی اس طرح کر گویا کہ تو اُسے دیکھ رہا ہے۔ کیونکہ اگر تو اسے نہیں دیکھتا تو وہ تجھے دیکھ رہا ہے۔''

فرقہ سیاریہ کے نزدیک ''جمع'' اور ''تفرقہ'' ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ کہتے ہیں کہ جب ہدایت ومواہب (خدائی عطیات) کا اظہار اور غلبہ ہوا تو کسب ومجاہدہ ساقط ہوا۔

قول فیصل:

حضرت علی ہجویریؒ اس مسلک سے اختلاف کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جب تک انسان زندہ وسلامت اور ہوش وحواس میں ہے، کسب ومجاہدہ سے بندہ کبھی الگ نہیں ہوسکتا۔ اس لیے ''جمع'' ''تفرقہ'' سے یعنی ''ہدایت ومواہب'' ''کسب ومجاہدہ'' سے الگ نہیں ہو سکتے۔ ان دونوں کا آپس میں وہی تعلق ہے جو نور اور آفتاب کا، عرض اور جوہر کا، صفت اور موصوف کا تعلق ہے کہ وہ ایک دوسرے سے الگ نہیں ہو سکتے۔ اسی طرح مجاہدہ ہدایت سے، شریعت طریقت سے اور یافت طلب سے کبھی جدا نہ ہوگی۔ اگرچہ استثنائی صورتوں میں ہدایت مقدم اور مجاہدہ

مؤخر بھی ہوتا ہے۔ لیکن عام قاعدہ یہی ہے کہ مجاہدہ مقدم ہوتا ہے، اور اس کے نتیجے میں ہدایت ومواہب حاصل ہوتے ہیں۔ بہرحال دونوں لازم وملزوم ہیں۔ نہ کوشش کے بغیر تنہا ہدایت ومواہب کافی ہیں اور نہ ہدایت کے بغیر محض کوشش سے کچھ حاصل ہو سکتا ہے۔ بندہ کوشش اور مجاہدہ کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ اپنی بخشش وعنایت سے اسے ہدایت سے نوازتا ہے۔ حق تعالیٰ نے فرمایا: ''وَالَّذِیْنَ جَاهَدُوْا فِیْنَا لَنَهْدِیَنَّهُمْ سُبُلَنَا (۲۹:۶۹)۔ یعنی جو لوگ ہماری راہ میں کوشش اور مجاہدہ کرتے ہیں ہم ان کو اپنی راہ ضرور دکھاتے ہیں۔'' نیز فرمایا: وَیَهْدِیْٓ اِلَیْهِ مَنْ یُّنِیْبُ (۴۲:۱۳) یعنی وہ اپنی طرف آنے کا راستہ اُس شخص کو دکھاتا ہے جو اس کی طرف رجوع کرے۔'' اللہ تعالیٰ نے اپنی کلام پاک کا آغاز ہی اس بات سے فرمایا کہ: ''ذٰلِکَ الْکِتٰبُ لَا رَیْبَ فِیْهِ هُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ (۲:۲) یعنی اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ اللہ کی کتاب اور سراپا ہدایت ہے لیکن یہ ہدایت ہے متلاشیانِ حق کے لیے۔''

۲۲/۱۱ حُلولیہ فرقے

''حلولیہ'' کے دو گروہ ہیں۔ ایک گروہ ابوحلمان دمشقی کا متبع ہے۔ اور دُوسرا فارس کی طرف منسوب ہے۔ اور صوفی لوگوں کی کافی تعداد ان کو خدا کے شیدائیوں میں شمار کرتی ہے۔ لیکن شیخ علی ہجویریؒ اُن کو کافر اور مردُود فرماتے ہیں اور ان پر لعنت اور پھٹکار کرتے ہیں۔

خصوصیت اور دینی حیثیت:

''حُلولیہ'' جیسا کہ ان کے نام سے ظاہر ہے، بندے کی رُوح کے خدا کے ساتھ حلول وامتزاج کے قائل ہیں۔ اور ان کے ہاں بندے کا بلند ترین مقام یہ ہے کہ اس کی رُوح خدا کے ساتھ امتزاج اور حلول کر جائے۔ یہ وہی بات ہے جس کو بدھ مذہب والے ''نروان'' کہتے ہیں۔ شیخ موصوف فرماتے ہیں: میں علی بن عثمان جلابی کہتا ہوں کہ میں فارس اور ابوحلمان کو نہیں جانتا کہ

وہ کون ہیں۔ مگر جو شخص ایسی باتوں کا قائل ہو جو توحید کے خلاف ہیں اس کا دین میں کچھ حصہ نہیں۔ اور جس کے دین کی اصل ہی صحیح اور مستحکم نہیں تو اس کے فروع اور دوسری چیزیں بدرجۂ اولیٰ خلل والی ہوں گی۔ کرامات اور کشفِ آیات بجز اہل دین وتوحید کے کسی کو حاصل نہیں ہو سکتے۔ انسانی روح حادث اور مخلوق ہے۔ اس کا قدیم اور خالق اور اپنے صانع کے ساتھ کسی طرح بھی امتزاج وحلول ممکن نہیں۔ دراصل اسی طرح کے صوفی لوگ ہیں جن کی وجہ سے اہل علم ودین صوفیا اور اہل تصوف سے برگشتہ ہوتے ہیں۔ صوفیاء کو چاہیے کہ وہ اس طرح کے گمراہ لوگوں سے علیحدگی اور برأت اختیار کریں اور ان سے مداہنت برت کر علماء اور عام مسلمانوں کو اپنے آپ اور طریقت اور حقیقت سے بدگمان اور متنفر نہ کریں۔

☆☆☆☆☆

تصوف کے مسائل اور راہِ سلوک کے حجاب

﴿پہلا کشف الحجاب﴾

اللہ تعالیٰ کی معرفت کے بارے میں

معرفت الٰہی کی ضرورت:

خداوند تعالیٰ کی بندگی اختیار کرنے اور اس کے تقرب کی راہ پر بڑھنے میں جو پہلی چیز انسان کے راستے میں رکاوٹ (حجاب) بنتی ہے وہ انسان کی خداوند تعالیٰ سے ناواقفیت (عدم معرفت) ہے۔ ظاہر بات ہے کہ اگر آدمی خدا کو جانے گا ہی نہیں تو اس کی بندگی اور اس کے تقرب کی راہ اختیار کرنے کی طرف اسے توجہ ہی نہیں ہوگی بلکہ اس کے دل میں اس کا خیال بھی نہیں پیدا ہوگا۔ اور اگر وہ خداوند تعالیٰ کو جانتا ہو لیکن خدا کے متعلق اس کا علم صحیح نہ ہو تو وہ اس کی بندگی اور تقرب کے لیے جو راستہ اور طریقہ اختیار کرے گا وہ بھی صحیح نہ ہوگا۔ اس لیے لازم ہے کہ آدمی کو خدا کا علم بھی ہو اور وہ علم صحیح بھی ہو۔ چنانچہ جس قدر آدمی کے اندر خدا کی معرفت صحیح ہوگی اسی کے لحاظ سے اس کا عمل درست اور خداوند تعالیٰ کی درگاہ میں اس کا مقام بلند ہوتا چلا جائے گا۔ یہ بات عقل عام کی رُو سے بھی بالکل واضح ہے اور اللہ تعالیٰ نے بھی غلط کار لوگوں کے طرزِ عمل کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: مَاقَدَرُو اللّٰہَ حَقَّ قَدْرِہٖ (۳۹:۶۷) انھوں نے اللہ کے بارے میں بہت غلط اندازہ لگایا۔ اسی وجہ سے یہ کفر اور شرک میں مبتلا ہیں۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ”لَوْعَرَفْتُمُ اللّٰہَ حَقَّ مَعْرِفَتِہٖ لَمَشَیْتُمْ عَلَی الْبُحُوْرِ وَلَزَالَتْ بِدُعَائِکُمُ الْجِبَالُ. یعنی اگر تم اللہ تعالیٰ کو پہچانتے جیسا کہ اسے پہچاننے کا حق ہے تو تم سمندر پر چلتے اور اپنی دعا سے پہاڑوں کو اپنی جگہ سے ہٹا دیتے۔“ ظاہر بات ہے کہ جو شخص فی الحقیقت خدا کا بندہ اور اس کا خلیفہ بن جائے تو کوئی وجہ

نہیں کہ خدا کی مخلوق اس سے سرتابی کرے اور اس کا حکم نہ مانے۔

معرفت کی قسمیں:

معرفت الٰہی کی دو قسمیں ہیں۔ ایک علمی اور دوسری حالی۔ علمی معرفت یہ ہے کہ خداوند کریم کے بارے میں انسان کا علم صحیح ہو۔ اس میں کوئی ٹیڑھ اور غلطی نہ رہے۔ حالی معرفت یہ ہے کہ بندے کا حال (اس کی عملی زندگی) اس کی علمی معرفت کی آئینہ دار اور مجسمہ ہو..... حالی معرفت علمی معرفت پر فضیلت رکھتی ہے اور یہی مطلوب و مقصود ہے۔ علم حال کے بغیر ہوسکتا ہے لیکن حال علم کے بغیر نہیں ہوسکتا۔ اسی وجہ سے کہتے ہیں کہ عارف جاہل نہیں ہوسکتا اور جاہل عارف نہیں ہوسکتا۔

معرفت کے حصول میں عقل کا مقام:

اس میں شبہ نہیں کہ انسان کے پاس عقل اور علم ہی کسی چیز کو جاننے اور اس کی معرفت کے حصول کے آلات اور ذرائع ہیں۔ لیکن خدا کو جاننے اور اس کی معرفت حاصل کرنے کے لیے اگر صرف عقل اور علم کافی ہوتے تو ہر عالم اور عاقل شخص عارف ہوتا اور کوئی بے علم اور بے عقل آدمی خدا کو نہ پاسکتا۔ اور یہ دونوں باتیں خلاف واقعہ ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ علم و عقل معرفت کی علت نہیں بلکہ صرف اس کے ذرائع ہیں۔ معرفت کی علت صرف خدا کی عنایت ہے۔ اس کی عنایت کے بغیر علم اور عقل دونوں اندھے ہیں۔ اور یہ دونوں مل کر بھی انسان کو حقیقت سے ہم آغوش نہیں کرسکتے۔ چنانچہ حضرت علیؓ نے فرمایا: ''عَرَفْتُ اللّٰهَ بِاللّٰهِ وَعَرَفْتُ مَادُوْنَ اللّٰهِ بِنُوْرِهٖ. یعنی ہم نے اللہ عزّ وجلّ کو اسی کی عنایت سے پہچانا اور جو کچھ اس کے ماسوا ہے اسے اس کے نور سے پہچانا۔'' اور خود اللہ تعالیٰ نے بھی مومنین کے بارے میں ارشاد فرمایا: ''وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِىْ قُلُوْبِكُمْ (۴۹: ۷) یعنی اللہ نے ایمان کو تمھارے لیے محبوب بنادیا اور اسے تمھارے دلوں میں مزین کردیا۔'' اور کفار کے بارے میں فرمایا: ''وَلَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ (۶: ۲۸) یعنی اگر یہ کافر (قیامت کے بعد سب کچھ آنکھوں سے دیکھ لینے کے بعد) دنیا کی

طرف لوٹائے جائیں تو پھر وہی کریں گے جن چیزوں سے ان کو منع کیا گیا ہے۔" نیز یہ کہ: "اِنَّ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا سَوَآءٌ عَلَیْهِمْ ءَاَنْذَرْتَهُمْ اَمْ لَمْ تُنْذِرْهُمْ لَا یُؤْمِنُوْنَ (۶:۲) یعنی جن لوگوں نے کفر کی روش اختیار کر لی ہے ان کے لیے یکساں ہے کہ انھیں خبردار کرو یا نہ کرو، یہ ایمان نہیں لائیں گے۔" پس اللہ کی عنایت کے بغیر علم وعقل اور کسی دوسرے کی طرف سے سمجھانے کی کوشش سب بیکار ہیں۔ مخلوقات یا کسی مادی ذریعہ کی یہ طاقت نہیں ہے کہ کسی کو خدا تک پہنچا دے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم سے بزرگ تر اور بڑھ کر پُر تاثیر سمجھانے والا اور ابو طالب سے بڑھ کر عقلمند اور زمانہ شناس کون ہو سکتا ہے۔ لیکن ابو طالب کو خداوند تعالیٰ کی معرفت نصیب نہ ہوئی۔ حقیقت یہ ہے کہ عقل واستدلال کا آغاز ہی حق تعالیٰ کی طرف سے منہ موڑ کر کسی اور پر غور اور توجہ کو مرتکز کرنے سے ہوتا ہے۔ دلیل طلب کرنے کے معنی غیر اللہ میں غور کرنا ہے اور معرفت کی حقیقت غیر سے منہ موڑنا ہے۔[1]

معرفت کے بارے میں مشائخ کے اقوال:

معرفت کے احوال میں مشائخ عظام رحمہم اللہ کے اقوال حسب ذیل ہیں:

۱۔ حضرت عبداللہ بن مبارکؒ فرماتے ہیں: "اَلْمَعْرِفَةُ اَنْ لَّا تَتَعَجَّبَ مِنْ شَیْئٍ یعنی معرفت یہ ہے کہ تمھیں کسی شے کو بھی دیکھ کر یا جان کر تعجب نہ ہو۔" فرماتے ہیں، تعجب تو وہاں ہوتا ہے کہ کوئی شخص اپنے مقدور سے بڑھ کر کچھ کرے۔ خدا کی قدرت اور اس کے کمال سے کیا شے بعید ہو سکتی ہے۔ اس لیے جو شخص خدا کا عارف ہوگا اسے اس کے کسی فعل پر بھی تعجب نہیں ہو سکتا۔ وہ جو چاہے کر سکتا ہے اور اسے سب کچھ کرنے کا حق اور اختیار ہے۔ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ (۲۵۵:۲) وَاِذَا قَضٰۤى اَمْرًا فَاِنَّمَا یَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَیَكُوْنُ (۱۱۷:۲۔۴۷:۳) یعنی

[1] درحقیقت یہی وہ بات ہے جو کم فہمی کی وجہ سے ہمارے بعض کم علم مولوی اور پیر صاحبان پرانی کتابوں میں پڑھ کر اس طرح بیان کر دیتے ہیں کہ "دین میں عقل کا کوئی کام نہیں"۔ اور ہمارے نئے تعلیم یافتہ لوگ سن کر ہنستے ہیں۔ ورنہ کون اس بات سے انکار کر سکتا ہے کہ اگر حقیقت کو جاننے اور ماننے کے لیے عقل اور تجرباتی علوم کافی ہوتے تو دنیا کا کوئی فلسفی، کوئی سائنسدان اور کوئی سیاستدان انبیاء علیہم السلام کی تعلیم کردہ راہِ حیات سے سرِ مو ہٹ کر نہ چلتا۔ (مرتب)

زمین اور آسمان میں جو کچھ ہے اسی کا ہے، اور جس بات کے کرنے کا وہ فیصلہ فرماتا ہے اس کے لیے بس یہ حکم دیتا ہے کہ 'ہو جا' اور وہ ہو جاتی ہے۔

۲۔ حضرت ذوالنون مصریؒ فرماتے ہیں: ''حَقِيْقَةُ الْمَعْرِفَةِ اِطِّلَاعُ الْحَقِّ عَلَى الْاَسْرَارِ. یعنی معرفت کی حقیقت یہ ہے کہ آدمی ان اسرار اور حکمتوں کو سمجھنے لگتا ہے جو خدا کے کاموں میں پوشیدہ ہیں۔'' اسے خداوند تعالیٰ کا کوئی کام حکمت اور دانائی سے خالی نہیں نظر آتا۔ وہ فرماتے ہیں کہ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس دنیا کی چیزوں اور اس کی موجودات اور اس کے واقعات کا اس کے دل میں رائی کے برابر بھی وزن نہیں رہتا۔ اسے صرف اس بات سے غرض ہوتی ہے کہ وہ خود بندگی کی حدود سے باہر قدم نہ رکھے۔

۳۔ حضرت شبلیؒ فرماتے ہیں کہ: اَلْمَعْرِفَةُ دَوَامُ الْحَيْرَةِ. یعنی معرفت یہ ہے کہ آدمی ہر آن حیرت میں رہے۔ اور اس کی صراحت یہ ہے کہ حیرت خدا کی ہستی اور اس کے وجود میں نہیں۔ کیونکہ یہ تو صریح کفر ہے۔ بلکہ اُس کیفیت اور صفات میں۔ جس قدر خدا کی کیفیت اور اس کی صفات میں اسے معرفت حاصل ہوگی اسی درجہ میں اسے اپنی کوتاہی عمل اور کم کوشی کا احساس ہوگا۔ اور وہ اپنے آپ کو قصوروار اور قہر کا مستحق دیکھے گا اور یہ چیز اس کی دوامی حیرت کا سبب ہوگی کہ مالک کی بندگی کا حق زیادہ سے زیادہ اور بہتر سے بہتر طریق پر کس طرح اَدا کرے۔

۴۔ حضرت ابویزیدؒ فرماتے ہیں کہ: اَلْمَعْرِفَةُ اَنْ تَعْرِفَ اَنَّ حَرَكَاتِ الْخَلْقِ وَسَكَنَاتِهِمْ بِاللّٰهِ، یعنی معرفت یہ ہے کہ تو یہ جان لے کہ مخلوق کی تمام حرکات وسکنات اللہ کی طرف سے ہیں اور کسی شخص کو اس کے اذن کے سوا اس کے ملک میں تصرف حاصل نہیں ہے۔ اور ہر شے میں بھلا اور برا جو اثر ہے اسی کی طرف سے ہے۔ یہ جان لینے کے بعد انسان میں کامل تفویض الی اللہ کی کیفیت پیدا ہو جائے گی اور پھر اُسے کبھی کوئی شکایت نہ پیدا ہوگی۔ اور بالکل یکسو ہو کر صرف اپنے فرائض کی ادائیگی کی فکر میں لگا رہے گا۔ کیونکہ آخرت میں اسے اپنے فرائض کی ادائیگی کے بارے میں جواب دینا ہوگا، اپنے حقوق کا نہیں۔

۵۔ حضرت محمد بن واسعؒ فرماتے ہیں: مَنْ عَرَفَ اللّٰهَ قَلَّ كَلَامُهُ وَدَامَ تَحَيُّرُهُ، یعنی

عارف وہ ہے جو کلام بہت کم کرے اور ہمیشہ حیرت زدہ (اپنے فرائض کی انجام دہی کے لیے فکر مند رہے۔) کیونکہ اوّل تو کلام و بیان زیادہ وہاں ہوتا ہے جہاں آدمی کسی بات کو بیان کرنے کی قدرت رکھتا ہو اور اُسے بیان میں لا سکے۔ یا پھر وہ اپنے فرائض کی ادائیگی کے سلسلے میں کماحقہٗ فکر مند نہ ہو۔ یہ تقریباً وہی بات ہے جو اوپر شبلی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمائی ہے۔

۶۔ حضرت ابوبکر واسطیؒ فرماتے ہیں: ''مَنْ عَرَفَ اللّٰهَ اِنْقَطَعَ عَنِ الْكُلِّ بَلْ خَرَسَ وَانْقَمَعَ. یعنی جس نے اللہ کو پہچانا وہ دوسری سب چیزوں سے منقطع ہو گیا بلکہ گونگا ہو گیا اور جدا ہو گیا۔'' کیونکہ خود حضورؐ نے اللہ تعالیٰ سے عرض کیا: لَا اُحْصِیْ ثَنَاءً عَلَیْکَ (المصفّٰی، شاہ ولی اللہؒ دہلوی، جلد دوم، ص ۲۸۷)۔ اے خدایا! میں تیرے اوصاف شمار نہیں کر سکتا۔ حالانکہ آپؐ کا اپنا ارشاد ہے کہ: اَنَا اَفْصَحُ الْعَرَبِ وَالْعَجَمِ. یعنی میں تمام عرب و عجم سے زیادہ فصیح البیان ہوں۔'' پھر دوسرے کسی کی کیا ہستی ہے کہ وہ خدا کی ثنا بیان کر سکے۔ اس بارے میں حضرت شبلیؒ کا قول ہے: اَلْعِجْزُ عَنِ الْمَعْرِفَةِ یعنی معرفت آدمی کا یہ شعور و احساس ہے کہ وہ معرفت سے عاجز ہے۔ نہ اس کے احاطہ کرنے کی طاقت رکھتا ہے اور نہ اسے بیان میں لانے کی۔

۷۔ حضرت ابوحفص حدّادؒ فرماتے ہیں: مُذْ عَرَفْتُ اللّٰهَ مَا دَخَلَ فِیْ قَلْبِیْ حَقٌّ وَلَا بَاطِلٌ. یعنی جب سے میں نے اللہ کو پہچانا ہے حق و باطل کی کوئی بحث میرے دل میں نہیں پیدا ہوئی۔'' مطلب یہ ہے کہ جب سے میں نے اللہ کو پہچانا ہے میں اس درجہ اس کی طرف متوجہ اور اس کے خیال میں مگن ہو گیا ہوں کہ کسی اور شے کی طرف توجہ ہی نہیں ہوئی کہ اس کے حق و باطل ہونے کا سوال پیدا ہو۔ آدمی کے دوسری چیزوں اور بحثوں میں منہمک ہونے اور ان کو وزن دینے کا مطلب یہ ہے کہ اسے خدا کی معرفت حاصل نہیں ہوئی۔ ورنہ معرفت کے بعد تو پھر آدمی کو اس سے ہی فرصت نہیں ہو سکتی کہ خداوند تعالیٰ کے صریح احکام کی انجام دہی سے فارغ ہو، وہ کسی دوسری بحث کے لیے فرصت کہاں سے لائے گا۔

پس خدا کی راہ اختیار کرنے اور اس کے تقرب کے حصول کے راستے کی پہلی رُکاوٹ (حجاب) جسے دُور کرنے کی فکر کرنی چاہیے وہ خداوند تعالیٰ سے ناواقفیت ہے۔ اور اس کا علاج اللہ

تعالیٰ کے بارے میں صحیح علم ہے۔ اور اس کا ذریعہ جیسا کہ 'علم کے باب' میں گزر چکا ہے خدا کی کتاب اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات ہیں۔ ان کے سوا خدا کی صحیح معرفت کا کوئی اور ذریعہ نہیں ہے۔ باقی رہی حق تعالیٰ کی عنایت اور نظر کرم، تو وہ بھی درحقیقت سچی طلب اور مخلصانہ کوشش ہی کے نتیجے میں بالعموم عطف ہوتی ہے۔ خداوند تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''یَهْدِیْ اِلَیْهِ مَنْ اَنَابَ (۱۳:۲۷) یعنی اللہ تعالیٰ ہدایت بخشتا ہے اسے جو اس کی طرف متوجہ ہو۔''

☆☆☆☆☆

دوسرا کشف الحجاب:

توحید کے بارے میں

توحید کی اہمیت:

خداوند تعالیٰ کی معرفت کی صحت کے سلسلے میں سب سے اہم اور بنیادی چیز اس کی توحید کا صحیح علم اور تصور ہیں۔ صحتِ علم اور تقرب الی اللہ کی راہ میں جو دوسری شے بندے کی راہ میں رُکاوٹ (حجاب) بن کر حائل ہوتی ہے وہ خدا کی توحید ہی کے بارے میں اس کے تصور کی خرابی ہے۔ جب تک اس کا عقیدۂ توحید کامل نہ ہوگا اس کے عمل میں کجی اور رنگا رنگی باقی رہے گی۔ توحید کا پہلا قدم خدا کے ساتھ ہر حیثیت سے اور زندگی کے ہر گوشے میں ہر شریک کی نفی کرنا ہے۔ مُحدثات (یہ کائنات اور جو کچھ اس میں ہے وہ سب) اور ان کی تمام حرکات زبانِ حال سے توحید کی یہ ناقابل تردید شہادت دے رہے ہیں کہ ان سب کا خالق اور فرمانروا تو بس ایک اور علیم وقدیر خدا ہے۔ پھر اس سے موٹی بات کیا ہو گیا کہ جب اللہ تعالیٰ کو انسان اور ساری کائنات کو نیست سے ہست کرنے میں کسی شریک یا کسی دوسرے کی مدد کی ضرورت لاحق نہیں ہوئی تو یہ کیسے ممکن ہے کہ اس کی پرورش اور فرمانروائی کے لیے وہ کسی دوسرے کا محتاج ہو یا اس کی شراکت کو برداشت کرے۔

اللہ تعالیٰ نے خود بار بار ارشاد فرمایا ہے کہ: اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ (۲:۱۶۳۔ ۱۶:۲۳۔ ۴۱:۶) یعنی تمھارا معبود ایک ہی معبود ہے۔ نیز فرمایا: اِنَّ اِلٰهَكُمْ لَوَاحِدٌ (۳۷:۴) یعنی حقیقت یہ ہے کہ تمھارا معبود صرف ایک ہے۔ قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ (۱۱۲:۱) یعنی اے محمدؐ! ان کو بتادو کہ معبود ایک ہی ہے۔ مزید وضاحت کرتے ہوئے فرمایا: قَالَ اللّٰهُ لَا تَتَّخِذُوْٓا اِلٰهَيْنِ اثْنَيْنِ اِنَّمَا هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ (۱۶:۵۱) یعنی اللہ کا فرمان ہے کہ دو خدا بھی نہ بناؤ، خدا تو بس ایک ہی ہے۔ چنانچہ لَآ اِلٰهَ

اِلَّا اللّٰہُ پر سچا ایمان ہی اسلام کی جڑ ہے اور اس کی بنا ہے۔ اور جہاں یہ جڑ موجود نہ ہو، وہاں اسلام میں سے کچھ بھی باقی نہیں رہتا۔ توحید موجود ہو تو عمل میں کوتاہی سے درگزر کا امکان ہے لیکن توحید کے بغیر تو کوئی عمل بھی مقبول نہیں ہے۔

توحید کی قسمیں:

توحید کی تین قسمیں ہیں:

۱۔ ایک توحید خدا کی خدا کے لیے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا اپنی خدائی میں کسی دوسرے کی کسی نوع کی کوئی شرکت تسلیم نہیں کرتا اور نہ کسی کو اس میں کسی طرح کی دخل اندازی کا مجاز گردانتا ہے۔ چنانچہ قیامت کے روز جبکہ اس کائنات پر سے پردہ اٹھایا جائے گا اور حقیقت کھل کر سامنے آ جائے گی۔ میدانِ حشر میں پکار کر پوچھا جائے گا: "لِمَنِ الْمُلْکُ الْیَوْمَ؟ (۱۶:۴۰) بتاؤ آج کس کی بادشاہی ہے؟" اور پورا عالم بیک آواز پکار اٹھے گا: "لِلّٰہِ الْوَاحِدِ الْقَھَّارِ (۱۶:۴۰) فقط اللہ واحد قہار کی"۔ اور مستقبل کے مستقل فیصلے اسی روز ہوں گے۔

۲۔ دوسرے توحید خدا کی مخلوق کے لیے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خداوند تعالیٰ اس بات کو بھی برداشت نہیں فرماتا کہ مخلوق میں سے بھی کوئی اس کے سوا کسی اور کو خدا یا اس کی خدائی میں کسی نوع کا شریک مانے یا اپنے طرزِ عمل سے کسی کو ایسا تسلیم کرے۔ چنانچہ فرمایا: "اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ وَیَغْفِرُ مَادُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَآءُ (۴:۴۸، ۱۱۶)۔ یعنی اللہ کے ہاں شرک کے لیے بخشش نہیں ہے۔ اس کے سوا اور سب کچھ معاف ہو سکتا ہے جسے وہ معاف کرنا چاہے۔" پس بندوں کو ہر حیثیت سے اور اپنی پوری زندگی میں صرف ایک خدا ہی کے بندے اور فرمانبردار بن کر رہنا چاہیے اور وہ صرف لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ والا ایک اللہ ہے۔

۳۔ تیسرے توحید مخلوق کی خدا کے لیے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا کی سب مخلوق اس کے لیے یکساں ہے۔ اس کا اپنی مخلوق میں سے کسی کے ساتھ کوئی ایسا رشتہ نہیں ہے جو دوسروں سے نہ ہو۔ ہر شخص ہر وقت یکساں اس سے رجوع کر سکتا ہے۔ اس کے ہاں کوئی حاجب و دربان نہیں

ہے۔ چنانچہ فرمایا: ''اذا سالک عبادی عنی فانی قریب اجیب دعوۃ الداع اذا دعان (۲:۱۸۶) یعنی اے نبیؐ! میرے بندے اگر تم سے میرے متعلق پوچھیں تو انھیں بتادو کہ میں ان سے (ہر آن) قریب ہوتا ہوں۔ پکارنے والا جب بھی مجھے پکارتا ہے، میں اُس کی پکار کو سنتا اور جواب دیتا ہوں۔''

توحید کے تصور کی صحت میں یہ بات کس قدر اہم ہے اس کا تصور اس امر سے کیا جاسکتا ہے کہ اس بات کو نماز کا جز بنا دیا گیا ہے اور آدمی سے دن رات میں بار بار کہلوایا جاتا ہے کہ سمع اللّٰہ لمن حمدہ یعنی جو بھی اللہ کی حمد کرے (اور اسے پکارے) وہ اسے سنتا ہے۔ اس کے ہاں نہ کسی وکیل اور تعارف کرانے کی ضرورت ہے اور نہ وہ پکارنے والوں میں اس طرح کا کوئی فرق کرتا ہے کہ کسی کی پکار کو سنے اور کسی کی نہ سنے۔

توحید کے معنی:

خدا کی توحید کے معنی یہ ہیں کہ عارف یہ جان لے کہ خداوند تعالیٰ ایک ہے۔ اس کے ہاں حاضر و غائب، وصل اور فصل، جہت اور مکان، اور حرکت اور سکون کوئی چیز نہیں۔ وہ محدود نہیں ہے کہ ان میں کسی چیز کا کوئی سوال پیدا ہو۔ کسی چیز کے ساتھ اس کا پیوند نہیں۔ وہ نہ کوئی عرض ہے نہ حال، اور نہ روح اور نہ جسم۔ کیونکہ عرض کو جوہر کی، حال کو محل کی، روح کو جسم کی اور جسم کو اجزاء کی ضرورت ہوتی ہے، اور خدا ان سب سے بے نیاز اور پاک ہے۔ نہ اس کا کوئی باپ ہے جو اسے دبا سکے، نہ بیٹا جو اسے مجبور کر سکے اور نہ کوئی ہمسر جسے اسے ممنون کرنے کی ضرورت لاحق ہو۔ نہ اس کی ذات میں کوئی تغیر ہے نہ صفات میں اور نہ قوت اور اختیارات میں کہ اسے کسی وارث یا مددگار کی ضرورت پیش آئے۔ اس کی سب صفات قدیم ہیں۔ کوئی شے اس کے علم سے باہر نہیں۔ سب کچھ اس کے ارادے کے تابع ہے۔ جو کچھ وہ چاہتا ہے کرتا ہے اور جو کچھ چاہتا ہے اس کو جانتا ہے۔ حکم اس کے سوا کسی کا نہیں اور اس کا حکم سب حق اور سب کا سب حکمت و دانائی ہے۔ اس کے سوا سب مخلوق ہیں اور مخلوق کا اس پر کوئی تصرف نہیں۔ نفع اور ضرر، عزت اور ذلت، زندگی اور موت

اور نیکی اور بدی سب اسی کی طرف سے مقدر ہے۔ اس لیے امید اور خوف کے لائق اس کے سوا کوئی نہیں۔ وہ علیم اور خبیر، سمیع اور بصیر، حیی اور قیوم، رؤف اور رحیم اور ہر شے پر قادر ہے۔ وہ تمام آفتوں سے پاک اور سب عیبوں سے بالا ہے۔ اس کی کوئی مثل نہیں۔

توحید کے بارے میں مشائخ ؒ کے اقوال:

حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ توحید کے بارے میں فرماتے ہیں: ''اَلتَّوْحِیْدُ اِفْرَادُ الْقِدَمِ عَنِ الْحَدْثِ، یعنی توحید حادث سے قدیم کو جدا کرنا ہے۔'' اللہ تعالیٰ قدیم ہے اور اس کے سوا سب کچھ حادث ہے۔ گویا توحید کے معنی یہ ہیں کہ نہ تو خدا کی کوئی صفت کسی حادث شے (مخلوق) کی طرف منسوب کرے اور نہ مخلوق کی کوئی صفت (کمزوری) خدا کی طرف منسوب کرے۔ خداوند تعالیٰ حوادث کے وجود میں آنے سے پہلے موجود تھا۔ اور ان میں سے کسی کا محتاج نہ تھا۔ ان کے وجود میں آنے کے بعد بھی وہ ان میں سے کسی کا محتاج نہیں ہے۔ جب اسے تمھیں نیست سے ہست میں لانے کے لیے کسی شریک و مددگار کی ضرورت نہیں پیش آئی تو یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ تمھیں پرورش یا پھر نیست کرنے کے لیے اسے کسی شریک و مددگار کی ضرورت ہو۔ اس لیے بندے کے لیے جائز نہیں ہے کہ کسی حادث کو اس کے ساتھ یا اسے کسی حادث کے ساتھ ملائے، اُس ذات کے سوا اور کو چاہے اور اس کی یاد اور فرماں برداری کے بغیر آرام پائے۔

حضرت حسین بن منصور رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں: اَوَّلُ قَدَمٍ فِی التَّوْحِیْدِ فَنَاءُ التَّفْرِیْدِ. یعنی توحید کی راہ کا سب سے پہلا قدم ہر اُس کو فنا کرنا ہے جو خدا سے الگ اپنے آپ کو منوانے کا داعی ہو۔'' کیوں کہ توحید نفی کرنے والی شے ہے۔ اس لیے اس کا پہلا قدم شرک کی نفی ہی ہونا چاہیے کہ کلمۂ اسلام شروع ہی لَا اِلٰہَ سے ہوتا ہے۔

حضرت حصری رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: اُصُوْلُنَا فِی التَّوْحِیْدِ خَمْسَةُ اَشْیَاءَ: رَفْعُ الْحَدْثِ وَاِثْبَاتُ الْقِدَمِ وَهَجْرُ الْاَوْطَانِ وَمُفَارَقَةُ الْاِخْوَانِ وَنِسْیَانُ مَا عَلِمَ وَجَهِلَ. یعنی توحید میں ہمارے نزدیک پانچ چیزیں بنیادی ہیں: ایک حدث (یعنی ماسوا اللہ) کی

نفی۔ دوسرے قدیم (یعنی اللہ) کا ثبات۔ تیسرے اوطان[1] سے ہجرت یعنی خواہشات اور مرغوباتِ نفس کا ترک کہ انہی کے ذریعے آدمی کا نفس اس کو خدا کی نافرمانی کی طرف لے جاتا ہے۔ چوتھے بھائیوں کی مفارقت اور ان سے جدائی، یعنی خدا سے غافل لوگوں سے الگ اور بے پروا و بے نیاز ہو کر خدا کی طرف یکسو اور متوجہ ہو جانا اور پانچویں معلوم اور نا معلوم سب کو بھول جانا ہے۔ یعنی دنیا اور اس کے متعلقات کو بالکل بے وزن اور بے وقعت سمجھنا۔ چنانچہ انہی باتوں کی کمی بیشی کے لحاظ سے یہ اندازہ ہو گا کہ کسی شخص میں توحید کا کس درجہ کا اور کس قدر فہم و ادراک پایا جاتا ہے اور خدا سے اس کے تعلق کی نوعیت کیا ہے؟

☆☆☆☆☆

---

[1] یہاں پر 'اوطان' کی اصطلاح بہت پُر معنی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اپنی جن غلط خواہشات اور مرغوبات کو گویا اپنا وطن سمجھ کر نفس نے وہاں پر مستقل ڈیرہ ڈال دیا ہے۔ ان کو چھوڑنے پر اسے مجبور کیا جائے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے لوگوں نے سوال کیا کہ اے اللہ کے رسولؐ! سب سے بہتر ہجرت کون سی ہے؟ آپؐ نے فرمایا: اَنْ تَھْجُرَ مَا کَرِہَ رَبُّکَ یعنی سب سے اچھی ہجرت یہ ہے کہ تم ان چیزوں کو چھوڑ دو جو اللہ تعالیٰ کے نزدیک ناگوار ہوں۔ امام بخاریؒ نے اسی روایت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے: اَلْمُھَاجِرُ مَنْ ھَجَرَ مَا نَھَی اللّٰہُ عَنْہُ، یعنی اصل مہاجر وہ ہے جو ان چیزوں کو چھوڑ دے جن سے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے۔

دراصل انسان کا نفس بھی کُڑک مرغی اور بچوں والی کتیا کی طرح ہے یہ سوچے بغیر کہ یہ جگہ اس کے لیے مناسب اور جائز بھی ہے یا نہیں، محض اسے دل پسند دیکھ کر وہاں اپنا ڈیرہ ڈال دیتا ہے۔ اور پھر اگر اسے وہاں سے اٹھانے اور نکالنے کی کوشش کی جاتی ہے تو اسی طرح سے جز بز ہوتا ہے گویا کہ اسے اس کے وطن سے نکالا جا رہا ہے۔ یہی تصور ہے جو 'ہجر الاوطان' میں دیا گیا ہے۔ (مرتب)

تیسرا کشف الحجاب:

ایمان کے بارے میں

ایمان کی اہمیت:

خداوند تعالیٰ کی معرفت اور اس کی توحید کا علم حاصل ہونے کے باوجود جو چیز خداوند تعالیٰ کی راہ پر چلنے میں انسان کے راستے میں رُکاوٹ (حجاب) بنتی ہے وہ ایمان کا موجود نہ ہونا یا اس کا ناقص اور کمزور ہونا ہے۔ جب تک آدمی اس معرفت اور توحید پر سچے دل کے ساتھ پختہ ایمان نہ لائے اس کا یہ علم اسے کچھ فائدہ نہیں دے سکتا۔ اور وہ ایمان بھی جو آدمی کو اپنے تقاضوں کے مطابق متحرک نہ کر سکے کافی نہیں ہے۔ چنانچہ ایسے ہی لوگوں کو مخاطب کر کے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ''یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَالْکِتٰبِ الَّذِیْ نَزَّلَ عَلٰی رَسُوْلِہٖ (۴:۱۳۶) یعنی اے ایمان لانے والو! سچے دل سے ایمان لاؤ، اللہ پر اور اس کے رسولؐ پر اور اس کتاب پر جو اللہ نے اپنے رسولؐ پر نازل کی ہے۔'' نیز فرمایا: ''قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ط قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰکِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا یَدْخُلِ الْاِیْمَانُ فِیْ قُلُوْبِکُمْ (۴۹:۱۴) یعنی یہ اعرابی لوگ کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے۔ ان سے کہو کہ تم ایمان نہیں لائے، بلکہ یہ کہو کہ تم نے زبان سے تسلیم کر لیا ہے۔ ورنہ ایمان ابھی تمہارے دلوں میں اُترا نہیں۔'' کیونکہ اس کے بعد تو پھر آدمی کی ایک ایک بات اور حرکت ایمان کی ترجمان اور شاہد بن جاتی ہے۔ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اَلْاِیْمَانُ اَنْ تُؤْمِنَ بِاللّٰہِ وَمَلٰٓئِکَتِہٖ وَکُتُبِہٖ وَرُسُلِہٖ..... یعنی ایمان یہ ہے کہ تو اللہ کو، اس کے فرشتوں کو اور اس کی کتابوں کو اور اس کے رسولوں کو سچے دل سے مانے.....'' آپؐ نے یہ بھی فرمایا کہ: ''لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی یَکُوْنَ ھَوَاہُ تَبَعًا لِّمَا جِئْتُ بِہٖ. یعنی تم میں

سے کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ اس کی خواہش نفس بھی اس کے تابع نہ ہو جائے جسے میں لے کر آیا ہوں۔''

ایمان کے معنی:

لغت کی رُو سے بھی ''ایمان'' کے معنی کسی بات کی دل و جان سے تصدیق کرنے اور اس کے بارے میں یقین محکم رکھنے کے ہیں۔ اور خدا کے ہاں مقبولیت اور تقرب کے سلسلے میں ''ایمان'' بنیادی شے ہے۔ ایمان کے بغیر بندے کی کوئی عبادت، اس کا کوئی عمل اور اس کی طرف سے کوئی بڑی سے بڑی جانی و مالی قربانی قبول نہیں ہے۔

کیا ایمان کے لیے اطاعت شرط ہے؟

فقہاء کی طرح صوفیائے کرام کے درمیان بھی اس بارے میں اختلاف ہے کہ آیا ایمان کے لیے اطاعت بھی شرط ہے یا صرف زبان سے اقرار اور دل سے تصدیق کافی ہے۔ ایک گروہ جس میں فقہاء میں سے امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمد بن حنبلؒ وغیرہ اور صوفیاء میں سے فُضیل بن عیاضؒ، بشر حافیؒ، خیر النساجؒ، ہمنون المحبؒ، ابوحمزہ بغدادیؒ اور ابو محمد بن حسنی حریریؒ وغیرہم رحمہم اللہ شامل ہیں، کہتا ہے کہ ایمان کے معنی زبان سے اقرار، دل سے اس کی تصدیق اور اس کے مطابق عمل کرنے کے ہیں۔ دوسرا گروہ جس میں امام ابوحنیفہؒ، حسن بن بلخیؒ، امام محمدؒ، امام ابویوسفؒ اور داؤد طائیؒ اور صوفیاء میں سے ابراہیم بن ادھم، ذُوالنون مصری، ابویزید بُسطامی، سلیمان دُرّانی، حارث محاسبی اور جنید بغدادی اور سہل بن عبداللہ تستریؒ اور شقیق بلخی اور حاتم اصم رحمہم اللہ شامل ہیں، کہتا ہے کہ ایمان زبان سے اقرار اور دل سے صدیق کرنے کا نام ہے۔

قول فیصل:

اس اختلاف کے بارے میں حضرت علی ہجویریؒ فرماتے ہیں کہ اختلاف فی الحقیقت صرف عبارت اور الفاظ کا اختلاف ہے۔ معنی اور اصل حقیقت کے لحاظ سے دونوں گروہوں میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اہل معرفت اور اہل سنت والجماعت دونوں اس بات پر متفق ہیں کہ ایمان کی

ایک اصل ہے اور ایک فرع۔ ایمان کی اصل زبان سے اقرار اور اس کی دل سے تصدیق ہے۔ اور ایمان کی فرع معاملات میں اس ایمان کے تقاضوں کو ملحوظ رکھنا ہے۔ اور اہلِ عرب کا عرف اور ان کی عادت یہ ہے کہ کسی چیز کی فرع کو الگ نہیں بلکہ اصل سے پکارتے تھے۔ اس لیے ایمان کا ذکر آ جانے کے بعد عمل واطاعت کے الگ ذکر وصراحت کی ضرورت نہیں رہتی۔ یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ جس شخص کے دل میں جس قدر خدا کی محبت ہوگی اتنا ہی وہ خدا کی اطاعت وفرمانبرداری کرنے والا ہوگا۔ کیونکہ محبت کی علامت فرمانبرداری ہے۔ اگر کسی کا دل خدا کا محل ہو، آنکھ خدا کو دیکھنے والی ہو تو یہ ناممکن ہے کہ وہ خدا کے حکم کو ترک کرنے والا ہو۔ جس شخص کا بدن امر الٰہی سے بے پروا ہو وہ اگر خدا کی معرفت کا دعویٰ کرتا ہے تو اپنے دعوے میں جھوٹا ہے۔ جو دل خدا کو پہچان لے وہ تو اس کے شوق کا محل بن جاتا ہے اور اس میں اس کے فرمان کی تعظیم زیادہ ہو جاتی ہے۔ گرویدہ ہونے کی علامت ہی یہ ہے کہ دل میں توحید کا عقیدہ جاگزیں ہو، آنکھیں ہر طرف پھیلی ہوئی خدا کی نشانیوں سے عبرت وموعظت حاصل کریں، کان اسی کا کلام سنیں، زبان سے قول صدق جاری ہو، معدہ اس کے حرام سے خالی ہو اور سارا بدن اس کی منہیات سے پرہیز کرے۔ حقیقت میں ایمان نام ہی اس چیز کا ہے کہ بندے کے تمام اوصاف خدا کی طلب اور جستجو اور اس کی رضا جوئی میں لگے ہوئے ہوں۔ کیونکہ ''معرفت'' کے بادشاہ کے کسی دل پر غالب آ جانے (یعنی ایمان) کا لازمی تقاضہ یہ ہے کہ وہ تمام برے اوصاف اور نافرمانی کو مغلوب کر لے۔ جہاں ایمان ہوتا ہے برے اوصاف وہاں سے جدا ہو جاتے ہیں۔ جہاں سورج موجود ہو وہاں اندھیرے اور ظلمت کے لیے کیا گنجائش ہو سکتی ہے۔ قرآن مجید نے اس حقیقت کو اس طرح بیان فرمایا ہے کہ: ''اِنَّ الْمُلُوْکَ اِذَا دَخَلُوْا قَرْیَۃً اَفْسَدُوْھَا (۲۷:۳۴) یعنی بادشاہ جس کسی بستی میں داخل ہوتے ہیں تو جو کچھ پہلے وہاں موجود ہوتا ہے اس کو تہ وبالا کر دیتے ہیں۔'' اس لیے یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ''معرفت'' بادشاہ (یعنی ایمان) کسی دل کی بستی میں فاتحانہ داخل ہو اور پھر بھی اس کے منافی کوئی چیز اس بستی میں باقی رہ جائے۔ ایسی سب چیزوں کی ولایت اور حکمرانی وہاں سے لازماً ختم ہوگی۔ ایمان کے فاتحانہ داخلہ کے بعد تو ایسا دل جو کچھ دیکھتا ہے، جو کچھ سنتا اور سوچتا

ہے اور جو کچھ کرتا ہے، سب امرِ الٰہی کے دائرے کے اندر ہوتا ہے۔[1]

حضرت ابراہیم خواص رحمۃ اللہ علیہ توکّل کو بھی ایمان کے لوازم میں سے فرماتے ہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے: ''وعلی اللّٰہ فتوکّلوا ان کنتم مؤمنین (۵-۲۳) یعنی اللہ پر توکل کرو اگر تم مومن ہو۔'' ظاہر ہے کہ جس شخص میں توکل موجود ہوگا وہ ہر معاملہ اور ہر کام میں ہر وقت اللہ ہی پر بھروسہ کرے گا۔ رزق، رہنمائی، مدد اور کارسازی کسی معاملہ میں بھی اس کی نظر کسی اور طرف نہیں اٹھے گی۔

☆☆☆☆☆

چوتھا کشف الحجاب:

طہارت کے بارے میں

طہارت کی اہمیت:

ایمان کے بعد طہارت بندے کے لیے فرض ہو جاتی ہے۔ خدا کی بندگی کی راہ کے مقامات طے کرنے اور اس کا تقرب حاصل کرنے کے لیے طہارت (ہر قسم کی نجاست سے پاکیزگی) ایک لازمی شرط ہے۔ نماز طہارت کے بغیر نہیں ہوتی۔ نماز کے لیے طہارت شرط ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ (۲:۲۲۲) یعنی اللہ تعالیٰ توبہ کرنے والوں کو اور طہارت (پاکیزگی) اختیار کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔'' اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

يُطِيْلُ السَّفَرَ، اَشْعَثُ، اَغْبَرُ، يَمُدُّ يَدَيْهِ اِلَى السَّمَآءِ يَارَبِّ وَمَطْعَمُهٗ حَرَامٌ وَّمَشْرَبُهٗ حَرَامٌ وَّمَلْبَسُهٗ حَرَامٌ وَّغُذِىَ بِالْحَرَامِ فَاَنّٰى يُسْتَجَابُ لِذٰالِكَ؟

''ایک شخص بہت پراگندہ حال وغبار آلود ایک لمبا سفر[1] طے کر کے آتا ہے، اور آسمان کی طرف ہاتھ پھیلا کر پکارتا ہے: اے میرے رب! اے میرے رب! مگر اس کا کھانا حرام کا ہوتا ہے، اس کا پینا حرام کا ہوتا ہے، لباس حرام کا ہوتا ہے۔ اور حرام کی کمائی سے وہ پرورش پا رہا ہوتا ہے۔ بھلا ایسے شخص کی اللہ تعالیٰ کے ہاں کیسے شنوائی ہوگی؟''

طہارت کی قسمیں:

حق تعالیٰ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ان ارشادات سے واضح ہے کہ طہارت کی دو قسمیں ہیں: ایک طہارتِ ظاہری اور دوسری طہارتِ باطنی، اور یہ دونوں یکساں ضروری ہیں۔

---

[1] بیت اللہ آنا مراد ہے۔ (مرتب)

جس طرح سے ظاہری طہارت کے بغیر ظاہر میں نماز دُرست نہیں ہوتی اُسی طرح سے باطنی طہارت کے بغیر یہ باطن میں دُرست نہیں ہوتی۔ بلکہ اُس کے بغیر نہ خدا کی معرفت حاصل ہوتی ہے اور نہ خدا کے ساتھ بندے کا تعلق دُرست ہوسکتا ہے۔ نیز جس طرح سے نجس اور مستعمل پانی سے وضو دُرست نہیں ہوتا، اُس کے لیے پانی مطلق اور صاف اور نجاستوں سے پاک ہونا چاہیے، اسی طرح سے باطنی طہارت بھی توحیدِ مطلق کے اعتقاد کے بغیر ممکن نہیں۔ اگر یہ اعتقاد خالص اور بے آمیز نہ ہو اور اس میں کسی نوع کی کوئی ملاوٹ موجود ہو اور یہ خلط ملط یا ڈانواں ڈول ہو تو باطنی طہارت حاصل نہیں ہوسکتی۔ پس اہل اللہ کے لیے ضروری ہے کہ وہ ظاہری طہارت کا بھی التزام رکھیں اور ان کا دل اور باطن بھی توحید خالص سے معمور رہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ: ''فَادْعُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ (۱۴:۴۰) یعنی اللہ کو پکارو، دین کو اس کے لیے خالص کرتے ہوئے۔''

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ظاہری طہارت کے بارے میں فرمایا: ''دُمْ عَلَى الْوُضُوْءِ يُحِبُّكَ حَافِظَاكَ، یعنی ہمیشہ وضو سے رہو، تمھارے دونوں محافظ فرشتے تم سے محبت رکھیں گے۔'' اور باطنی طہارت کے لیے حضورؐ خود یہ دعا فرمایا کرتے تھے: ''اَللّٰهُمَّ طَهِّرْ قَلْبِيْ مِنَ النِّفَاقِ. یعنی اے اللہ! میرے دل کو نفاق سے پاک رکھ۔''

مشائخ صوفیاء رحمہم اللہ بھی مریدوں کو ہمیشہ ظاہری اور باطنی دونوں قسم کی طہارت کا حکم فرماتے ہیں کہ خدا کی بارگاہ میں جانے کے لیے جب کوئی ظاہری طہارت سے آراستہ ہوکر جائے تو اس کو چاہیے کہ باطنی طہارت سے بھی آراستہ ہوکر جائے۔

ظاہری اور باطنی طہارت کو باہم ایک دوسرے کے موافق کرنا ضروری ہے۔ اس لیے جب استنجا کرو تو تمھارے لیے لازم ہے کہ جس طرح اپنے ظاہری بدن کو نجاست سے پاک وصاف کرتے ہو اسی طرح اپنے باطن کو غیر کی دوستی سے خلاصی دلانے کی کوشش کرو۔ جب اپنے ہاتھ دھوؤ تو تمھارے لیے لازم ہے کہ ان کے ساتھ اپنے دل کو بھی دنیا کی محبت سے دھوؤ۔ جب کُلّی سے منہ کو صاف کرو تو اپنے منہ کو غیر کے ذکر سے بھی پاک کرو۔ جب ناک صاف کرو تو تمام

شہوتوں کو اپنے اوپر حرام کر دینے کا قصد کرو۔ جب اپنا منہ دھوؤ تو ساتھ ہی تمام مرغوباتِ نفس سے منہ موڑ لو۔ اور پوری یکسوئی کے ساتھ اسے خدا کی طرف متوجہ کرو۔ جب سر کا مسح کرو تو اپنی تمام سوچوں کو بھی خدا کے منشاء کے تابع کر دو۔ اور جب پاؤں دھوؤ تو پھر اُن کو خداوند کریم کی موافقت کی راہ کے سوا اور کسی راہ پر نہ چلنے دینے کا عہد کرو۔ اس طرح سے جو وضو کیا جائے گا اس سے ظاہری اور باطنی دونوں طہارتیں حاصل ہوں گی۔

ظاہری طہارت:

جنابت کی صورت میں ظاہری غسل سے حاصل ہوتی ہے اور عام حالات میں یہ وضو کرنے سے حاصل ہو جاتی ہے۔ پانی نہ ملنے کی صورت میں اور بیماری کی حالت میں اگر پانی کے استعمال سے ضرر کا اندیشہ ہو تو غسل اور وضو دونوں کے بجائے محض تیمم سے طہارت حاصل ہو جاتی ہے۔

طہارت کے بارے میں شک اور وسوسہ لاحق ہونے کی صورت میں راہِ عمل:

حضرت سعید ابن المسیب رضی اللہ عنہ سے ایک شخص نے سوال کیا کہ میں نماز پڑھ رہا ہوتا ہوں اور تری محسوس کرنے لگتا ہوں۔ کیا اس حالت میں نماز چھوڑ کر پھر وضو کروں؟ حضرت سعیدؓ بن مسیب نے جواب دیا کہ میں تو اگر تری نکل کر میری ران پر بھی بہہ جائے۔ تو اپنی جگہ سے نہیں ہلتا ہوں بلکہ اپنی نماز پوری کرتا ہوں۔[1]

چونکہ آگے یا پیچھے سے کسی شے کا اخراج بالاتفاق ناقضِ وضو ہے۔ اس لیے امام بغویؒ نے حضرت سعیدؓ بن مسیب کی اس روایت کی تاویل یہ بتائی ہے کہ آپؓ کے پیشِ نظر دراصل اس بات کو پورے زور کے ساتھ بیان کرنا تھا کہ محض یہ شک اور وسوسہ کہ پیشاب گاہ سے تری برآمد ہوگئی ہے ناقضِ وضو نہیں ہے۔ اس حالت میں آدمی کو شک کی پرواہ نہ کرتے ہوئے اپنی نماز پوری کرنی چاہیے۔ جب تک اسے یہ یقین نہیں ہو جائے کہ وضو ٹوٹ گیا ہے یا درست نہیں ہوا ہے آدمی کو نماز

---

[1] روایت کے اصل الفاظ یہ ہیں مالک عن یحیٰی بن سعید عن سعید ابن المسیب انہ سمعہ ورجل یسئلہ فقال انی لاجد البلل وانا اصلی فانصرف؟ فقال لہ سعید لو سال علی فخذی ماانصرفت حتی اقضی صلوتی۔ (موطا امام مالک کتاب الصلوۃ)

نہیں توڑنی چاہیے۔ امام بغویؒ فرماتے کہ حضرت سعیدؒ نے سائل کے دل سے شبے اور وسوسے کا بالکل قلع قمع کرنے کے لیے اپنے طرز بیان میں یہ مبالغے کا طریقہ اختیار فرمایا ہے[1] کہ مجھے تو اگر اس حد تک بھی وسوسہ لاحق ہو جائے کہ تری خارج ہو کر میری ران پر بہہ گئی ہے تو بھی میں اپنی نماز پوری کیے بغیر اپنی جگہ سے نہیں ہلتا۔ ورنہ آپ کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مجھے واقعی یہ یقین بھی ہو جائے کہ کوئی شے خارج ہو گئی ہے تو میں پرواہ نہیں کرتا۔

حضرت ابوعلی رودباری رحمۃ اللہ علیہ بھی کچھ عرصہ وسوسہ کی مصیبت میں مبتلا رہے۔ طہارت کے بعد آپ کو یہ شک اور وسوسہ لاحق ہو جاتا کہ آپ پاک نہیں ہوئے۔ جب وضو فرماتے تو وسوسہ میں پڑ جاتے کہ وضو نہیں ہوا یا ٹوٹ گیا ہے۔ آپؒ فرماتے ہیں کہ میری یہ حالت ہو گئی کہ ایک دن فجر کے وقت طہارت کے لیے دریا پر گیا لیکن سورج طلوع ہونے تک طہارت کے وسوسہ سے فارغ نہ ہوا۔ جب سورج طلوع ہوتے دیکھا تو اس قدر صدمہ ہوا کہ میں آبدیدہ ہو کر پکار اٹھا: ''اَلْعَافِيَة، اَلْعَافِيَة. یعنی اے اللہ! اس حالت میں مجھے عافیت عطا فرما۔'' حضرت رودباریؒ فرماتے ہیں کہ جواب میں آواز آئی: ''اَلْعَافِيَةُ فِي الْعِلْمِ یعنی عافیت علم میں ہے۔'' مطلب یہ کہ اگر عافیت چاہتے ہو تو اپنے عمل کی بنا وسوسوں پر نہیں علم پر رکھو۔ جب تم نے اپنے علم کے مطابق طہارت کر لی تو اس پر یقین رکھو۔ جب تک کہ تمہیں یہ علم نہ ہو جائے کہ طہارت کی حالت باقی نہیں رہی۔

باطنی طہارت:

ظاہری طہارت پانی سے اور باطنی طہارت توبہ اور رجوع الی اللہ اور تدبّر و تفکّر سے حاصل ہوتی ہے۔ توبہ کا ذکر ابھی ہم تفصیل کے ساتھ بیان آگے کریں گے۔ یہاں تدبّر و تفکّر کے بارے میں یہ بات ذہن نشین کر لیجئے کہ تدبّر و تفکّر اس اَمر پر غور کرنے کا نام ہے کہ یہ دنیا غدار اور بے وفا ہے۔ یہ سرتاپا آفت اور آزمائش کا محل ہے۔ اور اس میں سب کچھ فنا ہو جانیوالا ہے۔ اس سے دل لگانا دانشمندی نہیں ہے۔ دل کو اس سے خالی کر کے اُسے اُس خالق و مالک اور پروردگار سے لگانا

---

[1] المصفّٰی، شاہ ولی اللہ، ص ۳۱۔

چاہیے۔ جس کے انعامات وعنایات کی نہ کوئی حد ہے اور نہ شمار۔ حق تعالیٰ نے فرمایا: ''وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اَمْوَالُكُمْ وَاَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ (۸:۲۸) یعنی خوب جان لو کہ تمھارے مال اور تمھاری اولاد سب حقیقت میں ابتلا و آزمائش کا سامان ہیں۔'' اور یہ بھی فرمایا: ''كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ۝ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلٰلِ وَالْاِكْرَامِ (۵۵:۲۶۔۲۷) یعنی اس دنیا میں جو کچھ بھی ہے سب فنا ہو جانے والا ہے اور صرف ایک تیرے صاحبِ جلال و اکرام رب کی ذات ہی باقی رہ جائے گی۔'' نیز فرمایا: ''وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ لَا تُحْصُوْهَا ط اِنَّ اللّٰهَ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ (۱۶:۱۸) یعنی اگر تم اللہ کی نعمتوں کا شمار کرنا چاہو تو تم ان کا شمار نہیں کر سکتے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ بڑا ہی درگزر کرنے والا اور رحیم ہے۔''

لیکن تدبّر و تفکّر اور رجوع الی اللہ جیسی چیزیں مجاھدوں کی کثرت (پیہم کوشش اور جدوجہد) کے بغیر حاصل نہیں ہوتی ہیں۔ اور سب مجاھدوں سے مشکل ترین مجاھدہ یہ ہے کہ آدمی ظاہری آداب (احکامِ شریعت) کی محافظت کرے، اور ہر حال اور ہر معاملہ میں گرد و پیش کی دنیا کے علی الرغم ان کا التزام کرے۔ حضرت ابراہیم خواص رحمۃ اللہ علیہ سے روایت ہے کہ آپؒ نے فرمایا کہ میں خداوند تعالیٰ سے اس کا حق بجالانے کے لیے ابدی عمر کی درخواست کرتا ہوں تاکہ باقی تمام مخلوق بھی اگر دنیا کی نعمت میں مشغول ہو جائے اور خدا کا حق بھول جائے تو میں تنہا دنیا کی بلاؤں اور آزمائشوں کے علی الرغم اُس شریعت کے آداب کی محافظت کے ساتھ اس کے حق کو یاد رکھوں اور اسے قائم رکھوں۔

باطنی طہارت میں آدابِ شریعت کی اہمیت:

جان لو کہ جس قدر کوئی شخص ظاہری آدابِ شریعت اور شعائرِ الٰہی کا احترام کرنے والا ہوگا اسی قدر اسے اللہ تعالیٰ کی طرف توجہ، باطنی طہارت و پاکیزگی اور خدا کے ہاں درجہ میں بلندی حاصل[1] ہوگی۔ حکایات میں آیا ہے کہ حضرت ابو طاہر حرمی رحمۃ اللہ علیہ چالیس برس تک مکہ معظمہ

[1] حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ کے زمانے میں ایک شخص نے سنا کہ آپ بڑے صاحبِ ولایت و کرامت بزرگ ہیں اور وہ لمبا سفر طے کر کے بڑے شوق و عقیدت کے ساتھ آپ کی زیارت کے لیے آیا۔ کچھ روز قیام کے بعد اس نے واپسی کے لیے اجازت طلب کی تو حضرت جنیدؒ نے اس سے دریافت کیا کہ آپ اتنے دن یہاں رہے لیکن کچھ نہیں بتایا کہ آپ کس غرض (بقیہ حواشی اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)۔

میں بیت اللہ کی مجاوری کرتے رہے۔ لیکن آپ نے حدود مکہ میں طہارت نہیں کی۔ ہر دفعہ طہارت کے لیے آپ حرم شریف سے باہر تشریف لے جاتے۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ جس سرزمین کو اللہ عزوجل نے اپنی طرف منسوب فرمایا میں اس جگہ طہارت کیسے کروں اور اس پر اپنے وضو کا گناہ آلود پانی کیسے گراؤں۔ اور حضرت ابراہیم خواص رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں روایت ہے کہ آپؒ رےؔ کی جامع مسجد میں مقیم تھے کہ آپ اسہال (دستوں) کی بیماری میں مبتلا ہو گئے۔ اس بیماری میں بھی آپ ہر مرتبہ فراغت کے بعد مسجد میں داخل ہونے سے پہلے غسل فرماتے۔ یہاں تک کہ آخری روز آپ نے ایک دن رات میں تقریباً ساٹھ مرتبہ غسل کیا اور آخر پانی ہی میں آپ کی وفات ہوئی۔ لیکن آپ کے دل نے یہ گوارا نہ کیا کہ دست کرنے کے بعد اپنا پورا جسم دھوئے بغیر خدا کے گھر میں داخل ہوں۔

حضرت ابوبکر شبلی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں کسی وقت بھی بے وضو نہیں رہا اور وضو کے آداب کو میں نے کبھی ترک نہیں کیا۔ اس کے بعد میرے باطن میں ایک نصیحت ظاہر ہوئی۔ آپ کے متعلق یہ بھی روایت ہے کہ ایک دن وضو کر کے مسجد کے لیے نکلے تو آپ نے ہاتف کی یہ آواز سنی کہ ابوبکر! تو نے اپنے ظاہر کو تو آراستہ کیا مگر تیرے باطن کی صفائی کہاں گئی؟ آپ نے فوراً محسوس کیا کہ آپ کا دل گھر کی کسی چیز میں لگا ہوا ہے۔ وہیں سے فوراً واپس ہوئے اور گھر کا سب اثاثہ خدا کی راہ میں دے دیا۔ اور ایک سال تک اتنے کپڑوں کے سوا جتنے میں نماز ہو جاتی ہے، کچھ بھی اپنے پاس نہ رکھا۔ اس کے بعد آپ حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ کے پاس آئے تو انھوں نے آپ سے کہا: اے ابوبکر! وہ طہارت بہت اچھی اور نفع بخش تھی جو تو نے کی۔ انشاء اللہ اب اللہ تعالیٰ تجھے ہمیشہ طہارت سے رکھے گا۔ اور حضرت شبلیؒ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد واقعی میں کبھی بے

(بقیہ حواشی گزشتہ صفحہ)

سے آئے تھے اور اب کیسے واپس جا رہے ہیں۔ اُس شخص نے جواب دیا کہ میں تو دراصل یہ سن کر آیا تھا کہ آپ بڑے صاحب ولایت وکرامت بزرگ ہیں لیکن میں نے اتنے روز میں آپ کی ولایت وکرامت کچھ بھی نہیں دیکھی، اس لیے اب واپس جا رہا ہوں۔ آپؒ نے اس سے پوچھا کہ کیا آپ نے مجھ میں کوئی چیز خدا اور رسولؐ کے احکام کے خلاف پائی ہے؟ اس شخص نے کہا کہ نہیں، ایسی تو کوئی چیز میں نے نہیں پائی۔ حضرت جنید بغدادیؒ نے فرمایا کہ بس پھر جنیدؒ کی ولایت وکرامت تو یہی ہے۔ (مرتب)

طہارت نہیں ہوا، بلکہ ہمیشہ باوضو رہا۔

اب توبہ اور اس کے متعلقات کو قدرے تفصیل سے بیان کیا جاتا ہے:

باطنی طہارت:

توبہ اور اُس کے متعلقات

توبہ کی اہمیت:

توبہ کے لغوی معنی خدا کے خوف سے اس کی نافرمانی سے پشیمان و دست کش ہو کر خدا کی طرف رجوع کرنے کے ہیں۔ اور خدا کے راستے پر چلنے والوں کے لیے اس راہ کا سب سے پہلا قدم توبہ ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْٓا اِلَی اللّٰہِ تَوْبَۃً نَّصُوْحًا ط عَسٰی رَبُّکُمْ اَنْ یُّکَفِّرَ عَنْکُمْ سَیِّاٰتِکُمْ وَیُدْخِلَکُمْ جَنّٰتٍ ط (۸:٦٦) یعنی اے ایمان والو! نافرمانی کی راہ چھوڑ کر سچے دل سے اور پورے اخلاص کے ساتھ خدا کی طرف رجوع کرو، اس طرح امید ہے کہ تمھارا رب تمھاری برائیاں تم سے دُور کر دے گا اور تمھیں جنت میں داخل کرے گا۔'' دوسری جگہ فرمایا: ''تُوْبُوْٓا اِلَی اللّٰہِ جَمِیْعًا اَیُّھَا الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّکُمْ تُفْلِحُوْنَ (۳۱:۲۴) یعنی اے اہل ایمان! نافرمانی کی روش چھوڑ کر سب خدا کی طرف رجوع کرو تو توقع ہے کہ فلاح پاؤ گے۔'' اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مَامِنْ شَیْئٍ اَحَبُّ اِلَی اللّٰہِ مِنْ شَابٍ تَائِبٍ. یعنی جوانی میں توبہ کرنے والے شخص سے بڑھ کر اللہ کو کوئی شے محبوب نہیں ہے۔'' اور توبہ کے بارے میں آپؐ نے فرمایا: ''اَلنَّدَمُ التَّوْبَۃُ یعنی توبہ اپنے کیے پر پشیمان ہونا ہے۔''

توبہ کی شرطیں:

پس توبہ کی تین شرطیں ہیں:

۱۔ نافرمانی اور گناہ پر افسوس اور پشیمانی کا اظہار کرنا۔

۲۔ نافرمانی اور گناہ کو فوراً ترک کر دینا، اور

۳۔ پھر نافرمانی اور گناہ کی طرف لوٹنے کا کوئی ارادہ اپنے اندر نہ رکھنا۔

یہ تینوں باتیں پشیمانی میں شامل ہیں۔ ان میں سے کوئی ایک بھی باقی ہو تو توبہ نہیں ہو گی۔ نیز ندامت تین سبب سے پیدا ہوتی ہے: اوّل یہ کہ اللہ تعالیٰ کی گرفت اور اس کی سزا کا خوف دل پر غالب ہو جائے۔ دوسرے اُس کی نعمت اور اُس کا انعام پانے کی طلب اور نافرمانی کی وجہ سے اس سے محرومی کا ڈر۔ اور تیسرے خداوند تعالیٰ کی شرم کہ وہ اس کے حال سے واقف ہے اور ایک روز اس کے روبرو اسے بالمشافہ حاضر ہونا ہے۔

اگر بندہ اپنے برے افعال اور گناہوں میں تفکر کرے اور ان سے خلاصی حاصل کرنے کی جستجو کرے تو اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے توبہ کی راہ اس کے لیے ہموار اور اس کے اسباب اس کے لیے مہیا اور آسان کر دیتا ہے۔

توبہ کرنے والوں کی قسمیں:

نیز توبہ کرنے والے کے بھی تین درجے ہیں: ایک تائب، دوسرا انیب، اور تیسرا اوّاب۔ جو شخص فواحش اور ان باتوں سے جن پر اللہ تعالیٰ نے تنبیہ فرمائی ہے، اللہ کی طرف رجوع کرے وہ تائب ہے۔ یہ ابتدائی اور عوام کا مقام ہے۔ جو شخص صغائر اور فاسد افکار و خیالات سے خدا کی محبت کی طرف رجوع کرے وہ انیب ہے۔ اور جو شخص اپنی ذات اور اپنی خودی سے خدا کی طرف رجوع کرے وہ اوّاب ہے۔ حضرت ذوالنون مصریؒ فرماتے ہیں: ''تَوْبَةُ الْعَوَامِ مِنَ الذُّنُوْبِ وَتَوْبَةُ الْخَوَاصِ مِنَ الْغَفْلَةِ. یعنی عوام کی توبہ گناہ سے ہوتی ہے اور خواص کی توبہ غفلت سے ہوتی ہے۔'' نیز فرماتے ہیں: ''اَلتَّوْبَةُ تَوْبَتَانِ، تَوْبَةُ الْاَنَابَةِ وَتَوْبَةُ الْاِسْتِحْيَاءِ فَتَوْبَةُ الْاَنَابَةِ اَنْ يَتُوْبَ الْعَبْدُ خَوْفًا مِنْ عُقُوْبَةٍ وَتَوْبَةُ الْاِسْتِحْيَاءِ اَنْ يَتُوْبَ حَيَاءً مِنْ كَرَمِهٖ. یعنی توبہ کی دو قسمیں ہیں۔ ایک توبہ انابت اور دوسری توبہ استحیاء۔ توبہ انابت یہ ہے کہ بندہ خداوند تعالیٰ کے عذاب کے خوف سے توبہ کرتا ہے اور توبہ استحیاء یہ ہے کہ وہ خدا کی عنایات اور اس کے کرم سے شرما کر توبہ کرتا ہے۔''

کئی گناہوں میں مبتلا شخص کی توبہ:

اگر کوئی شخص کئی گناہوں میں مبتلا ہو تو ضروری نہیں کہ وہ اس وقت تک توبہ کو مؤخر کرتا رہے جب تک کہ وہ سب سے توبہ کرنے کے قابل نہ ہو۔ جس اور جتنے گناہوں سے توبہ کر سکتا ہے اُن سے توبہ کرے۔ اس کا اُسے ثواب حاصل ہوگا اور اس سے اُسے دوسرے گناہوں سے بھی توبہ کی توفیق حاصل ہوگی۔ ایمان کے بعد جتنے فرائض کو وہ ادا کرے گا اور جتنے گناہوں سے الگ رہے گا ان کا اسے ثواب حاصل ہوگا۔ اس سلسلے میں اس بات کو بھی یاد رکھنا چاہیے کہ گناہ کا ارتکاب ہی گناہ نہیں ہے اس کا ذکر بھی گناہ ہے۔

توبہ ٹوٹنے کا اندیشہ:

توبہ کرنے سے آدمی کو اس وجہ سے اجتناب نہ کرنا چاہیے کہ اسے اس پر قائم رہنا مشکل دکھائی دیتا ہے۔ جتنی مدت وہ نافرمانی سے باز رہے گا اس کا اجر و ثواب تو بہر حال اسے حاصل ہو گا۔ توبہ کی شرط یہ ہے کہ انسان کا اپنا پختہ ارادہ ہو کہ وہ پھر اس گناہ میں ملوث نہیں ہوگا۔ مبتدی توبہ کرنے والوں کو اس سے سابقہ پیش آتا ہے کہ انھوں نے توبہ کی اور پھر کچھ مدت بعد غفلت میں مبتلا ہو کر وہی کام کر بیٹھے جس سے توبہ کی تھی۔ اس حالت میں ہونا یہ چاہیے کہ جونہی غلطی کا احساس ہو فوراً توبہ اور ندامت کا اظہار کرے اور آئندہ اس کام سے باز رہنے کا ازسرِ نو پکا ارادہ کر لے۔

ایک شیخ کا بیان ہے کہ میں نے جس گناہ سے توبہ کی اس کا مجھ سے بار بار ارتکاب ہوتا رہا۔ یہاں تک کہ ستر مرتبہ میری توبہ ٹوٹی اور اکہترویں مرتبہ توبہ کرنے کے بعد مجھے استقامت نصیب ہوئی۔ ۔ اگر صد بار توبہ شکستی باز آ۔ توبہ کرنے والوں کے لیے حق تعالیٰ کا دروازہ ہمیشہ کھلا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''قُلْ يٰعِبَادِيَ الَّذِيْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ط اِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا ط اِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ○ (۳۹:۵۳)'' یعنی اے نبیؐ! میری یہ بات میرے بندوں تک پہنچا دو کہ اے میرے وہ بندو جنھوں نے گناہ اور سرکشی کی کوئی حد

نہیں چھوڑی ہے اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہوں، اللہ تو (بندہ اخلاص کے ساتھ توبہ کر کے اس کی طرف رجوع کرے تو) سارے ہی گناہ معاف کر دیتا ہے۔ وہ تو وہ ذات کریم ہے کہ جو بڑا ہی درگزر اور رحم فرمانے والا ہے۔''

حضرت ابو عمر جنیدؒ فرماتے ہیں کہ میں نے ابتداء میں حضرت ابو عثمان حیری کی مجلس میں توبہ کی۔ لیکن تھوڑے ہی دن گزرے کہ دل میں گناہ کی خواہش پیدا ہوئی اور توبہ توڑ دی اور معصیت میں مبتلا ہو گیا۔ اس کے بعد اپنے پیر کی صحبت سے رُوگردانی کرنے لگا۔ یہاں تک کہ ان کو بھی آتے ہوئے دور سے دیکھتا تو بھاگ جاتا کہ وہ مجھے دیکھ نہ لیں۔ ایک دن اچانک ان سے ملاقات ہو گئی۔ انھوں نے فرمایا: بیٹا! اپنے دشمنوں سے صحبت نہ رکھ۔ وہ چاہتے ہیں کہ تو بد سے بدتر ہوتا چلا جائے۔ اس لیے جب تو عیب کرتا ہے تو وہ خوش ہوتے ہیں اور تو اس سے بچتا ہے تو ان کو غم ہوتا ہے۔ تو میرے پاس آ کہ میں تیری بلائیں اٹھاؤں، اور تو اپنے دشمن کے مقصد کو پورا کرنے سے بچ جائے۔ جنیدؒ فرماتے ہیں کہ اس کے بعد میرا دل گناہ سے سیر ہو گیا اور میری توبہ پختہ ہو گئی۔

☆☆☆☆☆

پانچواں کشف الحجاب:

نماز کے بارے میں

نماز کی اہمیت:

قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے بار بار ارشاد فرمایا ہے: ''وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ (۲:۱۱۰، ۲۲:۷۸، ۲۴:۵۶، ۷۳:۲۰) یعنی قائم کرو نماز اور ادا کرو زکوٰۃ۔'' نیز فرمایا: ''وَاْمُرْ اَھْلَکَ بِالصَّلٰوۃِ وَاصْطَبِرْ عَلَیْھَا (۲۰:۱۳۲) یعنی اپنے گھر والوں کو بھی نماز کا حکم دو اور خود بھی اس پر قائم اور اس کے پابند رہو۔'' اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز کو مومن اور کافر کے درمیان فرق کرنے والی چیز قرار دیا[1]۔ اور اپنی حیاتِ مبارک کے آخری لمحات میں جن دو باتوں کی تاکید فرمائی ان میں سے ایک نماز تھی۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا: ''الصَّلٰوۃُ وَمَا مَلَکَتْ اَیْمَانُکُمْ، یعنی لوگو! میرے پیچھے نماز اور لونڈی غلاموں کے حقوق کی حفاظت کرنا۔''

نماز کے معنی:

نماز کے لغوی معنی ذکر اور فرمانبرداری کے ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فرمایا: ''اَقِمِ الصَّلٰوۃَ لِذِکْرِیْ (۲۰:۱۴) یعنی قائم کر نماز کو میری یاد کے لیے۔'' اور جو لوگ نماز میں بھی اللہ تعالیٰ سے غافل رہیں، اُن کے بارے میں فرمایا: ''فَوَیْلٌ لِّلْمُصَلِّیْنَ الَّذِیْنَ ھُمْ عَنْ صَلَاتِھِمْ سَاھُوْنَ (۱۰۷:۴۔۵) یعنی بڑی تباہی ہے ان نمازیوں کے لیے جو اپنی نماز سے بے خبر ہیں۔'' اور ظاہر بات ہے کہ جو شخص خدا کے روبرو دست بستہ کھڑا ہو کر بھی خدا سے بے خبر اور غافل رہے اس کی خرابی احوال کا کیا پوچھنا۔ پھر اور کس جگہ وہ خدا کی طرف متوجہ ہوگا۔

---

[1] صحیح مسلم میں حضرت جابرؓ سے روایت ہے: قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ بَیْنَ الْعَبْدِ وَبَیْنَ الْکُفْرِ تَرْکُ الصَّلٰوۃِ. یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ترکِ صلوٰۃ آدمی اور کفر کے درمیان حدِ فاصل ہے۔

نماز کی شرطیں اور طریقہ:

نماز دین کے پانچ ارکان میں سے اہم ترین رُکن ہے اور یہ پابندیٔ وقت اور مقرر تعداد کے ساتھ فرض ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''اِنَّ الصَّلٰوۃَ کَانَتْ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ کِتَابًا مَّوْقُوْتًا (۴:۱۰۳) یعنی نماز ایسا فرض ہے جو پابندیٔ وقت کے ساتھ اہل ایمان پر لازم کیا گیا ہے۔'' نیز نماز کی کچھ شرائط ہیں جن کو پورا کرنا ضروری ہے:

......پہلی شرط طہارت ہے:

(۱) جسم کی طہارت ظاہری نجاست سے اور باطنی طہارت شہواتِ نفس کی غلامی اور غیر اللہ کی محبت سے۔

(۲) کپڑوں کا پاک ہونا ظاہری نجاست سے اور اور باطنی طہارت یہ کہ کپڑے حلال کمائی کے ہوں۔

(۳) جگہ کا پاک ہونا ظاہری نجاست سے اور باطنی طہارت یہ کہ جگہ غصب وظلم سے حاصل کردہ نہ ہو۔

......دوسری شرط قبلہ رُو ہونا:

اس کا ظاہر یہ ہے کہ آدمی کا منہ ظاہری طور پر خانہ کعبہ کی طرف ہو اور باطن یہ ہے کہ اس کا دل عرش الٰہی کی طرف متوجہ ہو۔

......تیسری شرط قیام ہے:

اس کا ظاہر یہ ہے کہ آدمی کھڑے ہونے کی قدرت رکھنے کی صورت میں سیدھا کھڑا ہو اور باطن یہ ہے کہ اپنے آپ کو خدا کے روبرو کھڑا سمجھے۔

......چوتھی شرط نیت ہے:

اس کا ظاہر اسے زبان سے اُدا کرنا ہے اور باطن اس کو خدا کے لیے خالص کرنا ہے۔

...... پانچویں شرط تکبیر ہے:

اس کا ظاہر یہ ہے کہ زبان سے اللہ اکبر کہے اور باطن یہ ہے کہ دل خدا کے جلال اور ہیبت و کبریائی سے کانپ رہا ہو۔

پھر قرأت کرے آہستگی اور ترتیب اور کلام الٰہی کی عظمت کے ساتھ، رکوع کرے خشوع کے ساتھ، سجدہ کرے عاجزی کے ساتھ، قعدہ (التحیات) کرے خداوند تعالیٰ سے اجتماع کی حالت میں کہ گویا اس کے دربار میں بیٹھا ہے۔ اور سلام ہو فنا کی صفت کے ساتھ کہ اس کا وجود ساری مخلوق کے لیے خیر و سلامتی کا سرچشمہ ہو۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور بزرگان دین کی نماز:

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں مذکور ہے کہ: ''كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يُصَلِّيْ وَفِيْ جَوْفِهٖ اَزِيْزٌ كَاَزِيْزِ الْمِرْ جَلِ، یعنی جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھتے تو آپ کا سینہ اس طرح جوش مارتا جیسا کہ پکتی ہوئی دیگ جوش کھاتی ہے۔'' اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں روایت ہے کہ آپ نماز کا ارادہ فرماتے تو آپ کے جسم پر لرزہ طاری ہو جاتا۔ حضرت حاتم اصم رحمۃ اللہ علیہ سے ایک شخص نے ان کی نماز کی کیفیت کے بارے میں سوال کیا تو آپ نے فرمایا: کہ جب نماز کا وقت آتا ہے تو میں ایک وضو ظاہری کرتا ہوں اور ایک باطنی۔ ظاہری وضو پانی سے کرتا ہوں اور باطنی توبہ سے۔ پھر مسجد میں آتا ہوں تو نماز کے لیے اس طرح کھڑا ہوتا ہوں کہ مسجد حرام میری آنکھوں کے سامنے ہوتی ہے۔ بہشت کو اپنے دائیں طرف اور دوزخ کو اپنے بائیں طرف اور اپنے قدموں کو پل صراط پر دیکھتا ہوں اور اپنی پشت پر ملک الموت کو کھڑا یقین کرتا ہوں۔ تکبیر کہتا ہوں تعظیم کے ساتھ، قیام کرتا ہوں ادب کے ساتھ، قرأت کرتا ہوں ہیبت کے ساتھ، رکوع کرتا ہوں خشوع اور تواضع کے ساتھ، اور سجدہ کرتا ہوں مقام ابراہیمؑ کو اپنی دونوں ابروؤں کے درمیان سمجھتے ہوئے، جلسہ (قعدہ) کرتا ہوں حلم اور وقار کے ساتھ اور سلام پھیرتا ہوں شکر کے ساتھ۔

نماز کی حقیقت:

صوفیاء کے ایک گروہ نے نماز کو حضوری کا آلہ کہا ہے، اور دوسرے نے اس کے برعکس اس کو غیبت کا آلہ قرار دیا ہے۔ لیکن حضرت علی ہجویریؒ فرماتے ہیں کہ "نماز امر ہے جو کہ حضور اور غیبت کا آلہ نہیں بن سکتا۔ کیوں کہ امر کسی چیز کا آلہ نہیں بن سکتا۔ حضور میں صرف حاضری ہوتی ہے اور غیبت میں صرف غیر موجودگی ہوتی ہے۔ نماز ان میں بند نہیں ہے۔ نماز تعمیل ارشاد کا نام ہے۔ نماز ایک عادت (حکم کی تعمیل کا بار بار اعادہ) ہے۔ جس میں انسان ابتدا سے انتہا تک خدا کا راستہ پاتا ہے اور بندے کی نماز کی کیفیت ہی سے دراصل اس کے خداوند تعالیٰ سے تعلق اور اس کے ہاں اس کے مقام کا انکشاف ہوتا ہے۔ بعض مشائخ مریدوں کو دن اور رات میں چار چار سو رکعت نماز پڑھنے کا حکم فرماتے تھے تا کہ بدن کو نماز پڑھنے کی عادت ہو۔ اور یہ خدا کی بندگی میں کسل اور سستی سے محفوظ ہو۔

نماز سے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو کس درجہ محبت تھی۔ آپؐ کے اس ارشاد سے ظاہر ہے کہ آپؐ نے فرمایا: "جُعِلَتْ قُرَّةُ عَيْنِيْ فِيْ الصَّلٰوةِ یعنی میری آنکھوں کی ٹھنڈک نماز میں رکھی گئی ہے۔" جب نماز کا وقت آتا، حضورؐ بلال رضی اللہ عنہ کو فرماتے: "اَرِحْنَا يَابَلَالُ بِالصَّلٰوةِ یعنی اے بلالؓ! نماز کے لیے اذان دے کر ہمیں راحت پہنچاؤ۔" دراصل جب حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم معراج کے موقع پر بارگاہ رب العزت میں تشریف لے گئے اور آپؐ قربت کے محل میں پہنچے تو نفس کی سب قیدیں منقطع ہو گئیں۔ آپؐ کی نفسانیت کا مادہ جل گیا، قوتِ طبعی نیست ہو گئی، شواہد ربانی آپؐ کے سامنے عیاں ہوئے اور آپؐ مشاہدۂ حق میں محو ہوئے تو بے اختیار ہو کر آپؐ نے عرض کیا: بارِ خدایا! مجھے پھر اس مصیبت کے گھر میں نہ پہنچا اور طبیعت اور ہوا کی قید میں نہ ڈال۔ اُدھر سے فرمان آیا۔ ہمارا فیصلہ آپؐ کو واپس ہی کر دینے کا ہے۔ تمہارا کام دنیا میں ہماری شریعت کو قائم کرنا ہے۔ جا کر دنیا میں ہماری شریعت کو قائم کرو۔ جو کچھ ہم نے تمہیں یہاں پر دیا ہے وہی کچھ تمہیں وہاں پر نماز میں ملے گا۔ چنانچہ اس کے بعد جس وقت آپ کا دل اس مقامِ معلّٰی

کامشتاق ہوتا تو آپ فرماتے: اَرِحْنَا یَابَلَالُ بِالصَّلٰوۃِ، اسی سے یہ بات اچھی طرح سے سمجھ میں آجاتی ہے کہ حضورؐ پچاس نمازوں کا فرمان لے کر اطمینان سے کیونکر چل دیے تھے۔

حسین بن منصور رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں روایت ہے کہ آپ رات دن میں چار سو رکعت نماز فرض نماز سے زاید پڑھا کرتے تھے۔ کچھ لوگوں نے آپ سے عرض کیا کہ جس درجہ پر آپ ہیں اتنی تکلیف کیوں اٹھاتے ہیں۔ آپ نے جواب دیا کہ فنا کی حالت میں دوست کی تکلیف کوئی اثر نہیں دکھاتی۔ جب دوستی دل میں قوی ہوتی ہے تو دوست کا فرمان دوست پر آسان ہوجاتا ہے۔ دیکھو، کاہلی کا نام خدارسیدگی نہ رکھ لینا اور حرص کو طلب کا نام نہ دے لینا۔

جنید رحمۃ اللہ علیہ بوڑھے ہوگئے مگر جوانی کے اَوراد میں سے کوئی ورد آپ نے نہ چھوڑا۔ مریدوں نے عرض کیا: اے شیخ! آپ بہت کمزور ہوگئے ہیں۔ نوافل میں کچھ تخفیف فرمادیجیے۔ آپ نے فرمایا کہ جن چیزوں کی وجہ سے میں اس درجہ کو پہنچا، اب انتہا میں انہی کو چھوڑ دوں؟

حضرت عبداللہ بن مبارکؒ فرماتے ہیں کہ اپنے بچپن کے زمانے میں میں نے ایک عابدہ عورت کو دیکھا۔ نماز کی حالت میں ایک بچھو نے اسے تقریباً چالیس مرتبہ ڈنگ مارا۔ لیکن اس نے ذرا سی جنبش نہ کی۔ جب وہ نماز سے فارغ ہوئی تو میں نے کہا: ماں! آپ نے بچھو کو اپنے سے الگ کیوں نہ کیا؟ اس نے کہا: بیٹا! تو بچہ ہے، خدا کے کام میں میں اپنا کام کیسے شروع کردیتی۔

حضرت ابوالخیر اقطعؒ کے پاؤں میں گوشت خورہ لگ گیا۔ طبیبوں نے پاؤں کاٹنے کا مشورہ دیا۔ لیکن آپ راضی نہ ہوئے۔ مریدوں نے مشورہ کیا کہ نماز کی حالت میں ان کا پاؤں کاٹ دیا جائے۔ چنانچہ انھوں نے ایسا ہی کیا۔ آپ ایک روز نماز سے فارغ ہوئے تو پاؤں کٹا ہوا پایا۔

سہل بن عبداللہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ صدقِ ایمان کی ایک علامت یہ ہے کہ جب نماز کا وقت آتا ہے تو ایک فرشتہ اسے نماز کے لیے اٹھا دیتا ہے۔ اور اگر وہ سویا ہوا ہو تو اسے جگا دیتا ہے۔

کیا آدمی نماز کی پابندی سے آزاد ہو سکتا ہے؟

صوفیاء کا ایک گروہ یہ کہتا ہے کہ بندہ ترقی کرتے کرتے خدا کی دوستی میں ایک ایسے مقام پر پہنچ جاتا ہے کہ اطاعت اس پر سے ساقط ہو جاتی ہے اور وہ شریعت کے احکام کا مکلف نہیں رہتا اور نماز اور دوسری عبادات کی تکلیف اور پابندی سے وہ آزاد ہو جاتا ہے۔

ان لوگوں کے بارے میں حضرت علی ہجویریؒ فرماتے ہیں کہ یہ صریح بے دینی ہے۔ کیونکہ یہ ممکن نہیں ہے کہ عقل و ہوش کی حالت میں شریعت کی تکلیف اور پابندی آدمی پر سے ساقط ہو جائے۔ کیونکہ اس امر پر اجماع ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت کبھی منسوخ نہیں ہو گی۔ البتہ دیوانگی اور عذر شرعی کا حکم دوسرا ہے۔ اور وہ بھی درحقیقت شریعت سے بالا یا اس سے آزاد کوئی شے نہیں ہے بلکہ شریعت ہی کے اس حکم کی پیروی ہے کہ فاتر العقل لوگوں پر احکام شریعت کا اطلاق نہیں ہوتا۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے کسی بندے کو اپنی دوستی کے اس درجہ تک پہنچا دے کہ خدا کی اطاعت و فرماں برداری میں اسے نہ صرف یہ کہ کوئی رنج اور تکلیف محسوس نہ ہو بلکہ اس کے برعکس اُسے اس میں راحت محسوس ہو اور اس کے بغیر اسے چین نہ آئے۔ امر کی تعمیل میں تکلیف اور رنج محسوس کرنے یا نہ کرنے کا انحصار اس تعلق اور محبت پر ہے جو بندے کو اپنے آقا اور صاحب امر سے ہوتی ہے۔ جس قدر محبت زیادہ ہو گی اسی کے لحاظ سے محبوب کی فرمانبرداری کی تکلیف اٹھانا آسان ہوتا چلا جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم رات دن میں اس کثرت سے نماز پڑھتے کہ آپؐ کے پاؤں سُوج جاتے۔ لیکن آپؐ کے شوق میں اضافہ ہی ہوتا چلا جاتا۔

فرض اور نفل نمازیں:

بزرگوں کا طریقہ یہ ہے کہ اور یہی دین کا منشاء بھی ہے کہ فرائض کو آشکارا کر کے پڑھتے ہیں اور نوافل کو پوشیدہ طور پر پڑھتے ہیں تا کہ ریاء سے خلاصی حاصل کریں۔ لیکن یاد رکھو کہ فرض عبادت کی ادائیگی کے بغیر نوافل اور دوسری نفل عبادات فائدہ نہیں دے سکتی ہیں۔ فرائض کو پورا کیے بغیر نوافل کوئی شخص خداوند تعالیٰ کے ہاں باریابی نہیں پا سکتا۔ فرائض کی تکمیل کے بعد نوافل

بلندیٔ درجات اور مزید عنایات کا ذریعہ ہیں۔ محض نفلی عبادات خواہ ان کی کتنی ہی کثرت ہو معمولی فرض کا بدل بھی نہیں بن سکتیں۔ حدیث قدسی میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: مَا تَقَرَّبَ اِلَیَّ عَبْدِیْ بِشَیْءٍ اَحَبُّ اِلَیَّ مِنْ اَدَاءِ مَا افْتَرَضْتُ عَلَیْهِ وَلَا یَزَالُ عَبْدِیْ یَتَقَرَّبُ اِلَیَّ بِالنَّوَافِلِ حَتّٰی اُحِبُّهٗ فَاِذَا اَحْبَبْتُهٗ کُنْتُ لَهٗ سَمْعًا وَّبَصَرًا وَّیَدًا وَّرِجْلًا وَّلِسَانًا...... یعنی اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جس چیز کو میں نے بندے پر فرض کیا ہے اس کی ادائیگی کے بغیر میرا بندہ میرا قرب حاصل نہیں کر سکتا۔ ہاں (فرائض ادا کرنے کے بعد پھر) نوافل کے ذریعے وہ میرا تقرب حاصل کرتا چلا جاتا ہے، یہاں تک میں بھی اس سے محبت کرنے لگتا ہوں، اور جب میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں تو پھر میں ہی اس کے کان اور آنکھیں اور ہاتھ اور پاؤں اور زبان بن جاتا ہوں......الخ

ایمان، محبت الٰہی اور نماز:

اللہ تعالیٰ سے محبت ایمان کا لازمی جز ہے۔ اللہ عزّ وجلّ نے فرمایا: وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِلّٰهِ (۲:۱۶۵) یعنی ایمان رکھنے والے لوگ سب سے بڑھ کر اللہ سے محبت رکھتے ہیں۔ کیونکہ اس کے بغیر اللہ تعالیٰ سے تعلق میں اخلاص اور اس کی اطاعت میں مداومت اور استقلال کا پیدا ہونا ممکن نہیں ہے۔ پھر چونکہ خداوند تعالیٰ سے تعلق و محبت اور اس کی اطاعت ہے۔[1] اس لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی اَکُوْنَ اَحَبَّ اِلَیْهِ مِنْ وَّالِدِهٖ وَوَلَدِهٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ (متفق علیہ، باب کتاب الایمان، مشکوٰۃ شریف) یعنی یہ کہ تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ میں اسے اس کے ماں باپ اور اولاد سمیت دنیا کے تمام لوگوں سے بڑھ کر محبوب نہ ہو جاؤں۔''

اللہ تعالیٰ کو اپنے مومن بندوں سے جو محبت ہے اور اُسے جو اُن کا لحاظ ہے اس کے بارے

[1] اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰهُ وَیَغْفِرْ لَکُمْ ذُنُوْبَکُمْ (۳:۳۱) یعنی اے نبیؐ! لوگوں سے کہہ دو کہ اگر تم فی الحقیقت اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی اختیار کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمھاری خطاؤں سے درگزر فرمائے گا۔'' نیز فرمایا: ''مَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ (۴:۸۰) یعنی جس نے رسولؐ کی اطاعت کی اس نے دراصل خدا کی اطاعت کی۔''

میں حدیث قدسی میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "مَا تَرَدَّدْتُ فِیْ شَیْئٍ کَتَرَدُّدِیْ فِیْ قَبْضِ نَفْسِ عَبْدٍ مُؤْمِنٍ یَکْرَہُ الْمَوْتَ وَاَکْرَہُ سَاءَتَہٗ وَلَا بُدَّ لَہٗ مِنْہُ۔ یعنی میں اتنا متردد کبھی کسی کام میں نہیں ہوتا جتنا اس بندۂ مومن کی جان لینے میں متردد ہوتا ہوں جو موت سے گھبراتا ہو۔ کیونکہ میں اس کی ناگواری نہیں چاہتا۔ لیکن موت بہر حال ایک ناگزیر شے ہے جس کے متبادل کوئی اور صورت موجود نہیں۔"

محبت کا لازمی تقاضا محبوب سے ملاقات کا شوق ہے اور اللہ تعالیٰ سے بندے کی ملاقات کی بہترین صورت نماز ہے۔ حدیث قدسی میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "مَنْ اَحَبَّ لِقَاءَ اللّٰہِ اَحَبَّ اللّٰہُ لِقَاءَہٗ وَمَنْ کَرِہَ لِقَاءَ اللّٰہِ کَرِہَ اللّٰہُ لِقَاءَہٗ۔ یعنی جو شخص اللہ تعالیٰ سے ملاقات کو محبوب رکھتا ہے اللہ تعالیٰ بھی اس سے ملاقات کو محبوب رکھتا ہے اور جو شخص اللہ تعالیٰ سے ملاقات کو ناپسند کرتا ہے، اللہ تعالیٰ بھی اس سے ملاقات کو ناپسند فرماتا ہے۔" نماز کو اللہ تعالیٰ سے ملاقات کا ذریعہ جان لینے کے بعد ہی دراصل حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کی پوری حقیقت آدمی کی سمجھ میں آتی ہے کہ نماز کا وقت آتا تو کیوں آپ بیقرار ہو ہو کر فرماتے: "اَرِحْنَا یَا بَلَالُ بِالصَّلٰوۃِ، بلال! مجھے نماز سے راحت پہنچاؤ۔" نیز جو شخص خداوند تعالیٰ کا محبوب اور پسندیدہ ہو جاتا ہے اس کے متعلق حدیث میں آیا ہے کہ: "اِذَا اَحَبَّ اللّٰہُ عَبْدًا قَالَ لِجِبْرِیْلَ: یَا جِبْرِیْلُ! اِنِّیْ اُحِبُّ فُلَانًا فَاَحِبَّہٗ فَیُحِبُّہٗ جِبْرِیْلُ، ثُمَّ یَقُوْلُ جِبْرِیْلُ لِاَھْلِ السَّمَآءِ اِنَّ اللّٰہَ تَعَالٰی قَدْ اَحَبَّ فُلَانًا فَاَحِبُّوْہُ فَیُحِبُّہٗ اَھْلُ السَّمَآءِ ثُمَّ یَضَعُ لَہُ الْقُبُوْلَ فِی الْاَرْضِ فَیُحِبُّہٗ اَھْلُ الْاَرْضِ۔ (مؤطا امام مالکؒ، کتاب الرقاق)۔ یعنی جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کو پسند فرما لیتے ہیں تو جبریلؑ سے فرماتے ہیں کہ اے جبریل! میں فلاں شخص سے محبت کرتا ہوں تو بھی اس سے محبت رکھ۔ چنانچہ جبریلؑ بھی اس سے محبت کرنے لگتے ہیں۔ پھر جبریلؑ اہلِ آسمان میں منادی کرتا ہے کہ اے آسمان کے رہنے والو! اللہ تعالیٰ فلاں شخص سے محبت کرتا ہے تم بھی اس سے محبت کرو۔ چنانچہ تمام اہلِ آسمان بھی اس شخص سے محبت کرنے لگتے ہیں۔ اس کے بعد اس کی مقبولیت زمین میں پھیلتی ہے اور اہلِ زمین بھی اس سے محبت کرنے لگتے ہیں۔"

چھٹا کشف الحجاب:

زکوٰۃ کے بارے میں

زکوٰۃ کی اہمیت:

ایمان کے بعد نماز کے علاوہ جو اور فرائض انسان پر عاید ہوتے ہیں ان میں سے ایک زکوٰۃ ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتُوا الزَّکٰوۃَ، یعنی قائم کرو نماز کو اور ادا کرو زکوٰۃ۔'' (۲:۱۱۰۔۲۲:۷۸۔۲۴:۵۶۔۷۳:۲۰)۔ دوسری جگہ فرمایا: ''وَالَّذِیْنَ یَکْنِزُوْنَ الذَّھَبَ وَالْفِضَّۃَ وَلَا یُنْفِقُوْنَھَا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ فَبَشِّرْھُمْ بِعَذَابٍ اَلِیْمٍ o یَوْمَ یُحْمٰی عَلَیْھَا فِیْ نَارِ جَھَنَّمَ فَتُکْوٰی بِھَا جِبَاھُھُمْ وَجُنُوْبُھُمْ وَظُھُوْرُھُمْ ط ھٰذَا مَا کَنَزْتُمْ لِاَنْفُسِکُمْ فَذُوْقُوْا مَا کُنْتُمْ تَکْنِزُوْنَ. (۹:۳۴۔۳۵)، یعنی جو لوگ سونے اور چاندی کے خزانے جمع کرتے ہیں اور انھیں خدا کی راہ میں خرچ نہیں کرتے (فرض زکوٰۃ بھی ادا نہیں کرتے) انھیں دردناک سزا کی خوش خبری سنادو۔ جس روز ان کے جمع کردہ اس سونے چاندی پر جہنم کی آگ دھکائی جائے گی اور پھر اُسی سے ان لوگوں کی پیشانیوں اور پہلوؤں اور پیٹھوں کو داغا جائے گا (اور ان سے کہا جائے گا، لو) یہ ہے وہ خزانہ جو تم نے اپنے لیے جمع کیا تھا، اب اپنی سمیٹی ہوئی دولت کا مزہ چکھو۔'' نیز فرمایا: ''وَلَا یَحْسَبَنَّ الَّذِیْنَ یَبْخَلُوْنَ بِمَآ اٰتٰھُمُ اللّٰہُ مِنْ فَضْلِہٖ ھُوَ خَیْرًا لَّھُمْ ط بَلْ ھُوَ شَرٌّ لَّھُمْ ط سَیُطَوَّقُوْنَ مَا بَخِلُوْا بِہٖ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ (۳:۱۸۰) یعنی جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے نوازا ہے اور پھر وہ بخل سے کام لیتے ہیں، وہ اس خیال میں نہ رہیں کہ یہ بخیلی ان کے لیے اچھی ہے، نہیں، یہ بخیلی ان کے حق میں نہایت بری ہے۔ جو کچھ وہ اپنی کنجوسی سے جمع کر رہے ہیں وہی قیامت کے روز طوق بنا کر ان کے گلے میں پہنا دیا جائے گا۔''

اور احادیث میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ: ''مَنْ کَانَ عِنْدَہٗ مَالٌ لَمْ یُؤَدِّ

زَکٰوۃَمُثِّلَ لَہٗ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ شُجَاعًا، اَقْرَعُ لَہٗ زَبِیْبَتَانِ یَطْلُبُہٗ حَتّٰی یُمْکِنَہٗ یَقُوْلُ اَنَا کَنْزُکَ (موطا امام مالکؒ، کتاب الزکوٰۃ) یعنی جس شخص کے پاس ایسا مال موجود ہو جس کی اس نے زکوٰۃ ادا نہیں کی اُس کے اس مال کو قیامت کے روز ایک گنجے سانپ کی صورت (یعنی اس قدر سخت زہریلے سانپ کی صورت جس کے زہر کے سبب اس کے اپنے سارے بال جھڑ گئے ہوں گے) دے دی جائے گی۔ اور ان کے منہ میں زہر کی دو تھیلیاں ہوں گی، اور وہ اس شخص کی تلاش میں نکلے گا یہاں تک کہ وہ اس پر مسلط ہو جائے گا۔ اور اس سے کہے گا کہ میں تیرا خزانہ ہوں (جو تو نے جمع کیا تھا)''۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے ''کنز'' کے لفظ کے جو مذکورہ آیات اور حدیث میں استعمال ہوا ہے معنی دریافت کیے گئے تو آپؓ نے فرمایا: ''ھُوَالْمَالُ الَّذِیْ لَا تُوْدِّیْ مِنْہُ الزَّکٰوۃَ (موطا امام مالکؒ، کتاب الزکوٰۃ) یعنی ''کنز'' وہ مال ہے جس میں سے زکوٰۃ نہ ادا کی گئی ہو''۔

زکوٰۃ کی ادائیگی سے جو انکار کرے وہ بالاتفاق خارج از اسلام ہے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے ایسے لوگوں کے خلاف جہاد فرمایا اور تمام صحابہ رضی اللہ عنہم نے آپ سے اتفاق فرمایا۔ حضرت ابوبکرؓ نے یہاں تک فرمایا: ''لَوْ مَنَعُوْنِیْ عِقَالًا لَجَاھَدْتُھُمْ عَلَیْہِ (ایضاً) یعنی اگر یہ لوگ زکوٰۃ میں سے اونٹ باندھنے کی ایک رسی بھی مجھے دینے سے انکار کریں گے تو میں اس کے لیے بھی ان کے خلاف جہاد کروں گا''۔

لیکن زکوٰۃ اتمامِ نعمت پر واجب ہوتی ہے۔ اتمام نعمت یہ ہے کہ کسی کے پاس دو سو درہم ہوں اور وہ ایک سال اس کی ملکیت میں رہیں تو ان پر پانچ درہم زکوٰۃ واجب ہو گی یا بیس دینار ہوں تو ان میں سے نصف دینار ادا کرنا واجب ہو گا۔ پانچ اونٹ بھی کامل نعمت کے حکم میں ہیں۔ ان پر ایک بکری زکوٰۃ واجب ہو گی۔ اسی طرح دوسرے مویشیوں اور اموال اور پیداوار زمین پر بھی زکوٰۃ واجب ہے۔

زکوٰۃ کی حقیقت:

زکوٰۃ کی حقیقت نعمت پر شکر گزاری کا اظہار ہے، اس لیے زکوٰۃ صرف سونے چاندی، مال مویشی اور پیداوار زمین تک ہی محدود نہیں ہے، بلکہ ہر نعمت پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ چنانچہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اِنَّ اللّٰہَ تَعَالٰی قَدْ فَرَضَ عَلَیْکُمْ زَکٰوۃَ جَاھِکُمْ کَمَا فَرَضَ عَلَیْکُمْ زَکٰوۃَ مَالِکُمْ، یعنی اللہ تعالیٰ نے تم پر تمہارے مرتبہ کی زکوٰۃ بھی اسی طرح فرض فرمائی ہے جس طرح سے تمہارے مال پر زکوٰۃ فرض فرمائی ہے۔'' آپؐ نے یہ بھی فرمایا: ''اِنَّ لِکُلِّ شَیْئٍ زَکٰوۃٌ وَزَکٰوۃُ الدَّارِ بَیْتُ الضِّیَافَۃِ، یعنی زکوٰۃ ہر شے پر ہے اور گھر کی زکوٰۃ مہمانداری ہے۔'' انسان کی تندرستی اور اس کے اعضاء جسمانی میں سے ہر عضو خدا کی عظیم نعمت ہے۔ ان کی زکوٰۃ یہ ہے کہ آدمی اپنے تمام اعضاء کو خدا کی بندگی میں مشغول رکھے اور کسی فضول کام یا خدا کی نافرمانی کے کام میں ان کو مشغول نہ کرے۔

جودوسخاوت:

صوفیاء اور مشائخ کا ایک گروہ آدمی کے زکوٰۃ کی حد کو پہنچنے کو بخل کی علامت قرار دیتا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اس سے بڑھ کر بخل کیا ہوسکتا ہے کہ آدمی کے اردگرد ضرورت مند لوگ موجود ہوں اور وہ سال بھر تک مال کو اپنے پاس سمیٹے بیٹھا ان کو اس حال میں دیکھتا رہے اور پھر سال کے بعد دو سو درہم میں سے صرف پانچ نکال کر ان کو دے دے اور یہ سمجھے کہ اس نے نعمت کا حق ادا کر دیا۔ مومن کی صفت سخی ہونا ہے اور سخیوں کی عادت مال کو خرچ کرنا ہے۔ سخی سال بھر تک اتنا مال اپنے پاس روکے گا ہی کب کہ اس پر زکوٰۃ واجب ہو۔ چنانچہ روایت ہے کہ ایک ظاہری عالم نے حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا کہ زکوٰۃ کتنے مال پر واجب ہوتی ہے؟ انھوں نے جواب دیا کہ دو سو درہم پر جب ایک سال گزر جائے تو پانچ درہم زکوٰۃ ادا کرنی چاہیے اور بیس دینار پر جب ایک سال گزر جائے تو ان پر نصف دینار زکوٰۃ ادا کرنی چاہیے مگر یہ مسئلہ تیرے مذہب کا ہے۔ میرے مذہب کے مطابق تو تجھے کوئی چیز اپنی مِلک میں رکھنی ہی نہیں چاہیے تاکہ زکوٰۃ کا مسئلہ پیدا ہی نہ

ہو۔ اس ظاہری عالم نے پوچھا کہ اس مسلک میں تیرا امام کون ہے؟ حضرت شبلیؒ نے فرمایا کہ اس بارے میں میرے امام حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں۔ غزوہ تبوک کے موقع پر جب انھوں نے اپنا پورا اثاثہ خدا کی راہ میں پیش کر دیا اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا کہ ابوبکر! کہو، اپنے گھر والوں کے لیے کیا چھوڑ کر آئے، تو آپ نے عرض کیا کہ ان کے لیے اللہ اور اس کا رسول کافی ہے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا اسی سلسلے میں ایک شعر ہے، فرماتے ہیں:

فَمَا وَجَبَتْ عَلَيَّ زَكٰوةُ مَالٍ وَهَلْ يَجِبُ الزَّكٰوةُ عَلَى الْجَوَادِ

''یعنی مجھ پر مال کی زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی، کیا سخیوں پر بھی زکوٰۃ واجب ہوا کرتی ہے؟''

مطلب یہ ہے کہ چونکہ سخیوں کا سارا مال آنے کے ساتھ ہی خرچ ہو جاتا ہے اور ان کے ہاں اس کی نوبت ہی نہیں آتی کہ اتنا مال سال بھر ان کے پاس جمع پڑا رہے، جس پر زکوٰۃ واجب ہو، اس لیے ان پر زکوٰۃ واجب ہونے کی صورت پیدا ہی نہیں ہوتی۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ جو لوگ نفلی خیرات اور لوگوں کی عام مدد کرتے رہتے ہوں ان پر سے فرض زکوٰۃ ساقط ہو جاتی ہے۔ یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ نفلی عبادات کی کوئی بڑی سے بڑی مقدار بھی فرض اور واجب کا بدل نہیں ہو سکتی۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں حدیث میں آیا ہے کہ حبشہ کے بادشاہ نے آپؐ کے پاس دو من کستوری بطور ہدیہ بھیجی اور آپؐ نے اسے اُسی وقت لوگوں میں تقسیم کر دیا۔

حضرت انسؓ بیان کرتے ہیں کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا اور اس وقت ایک جنگل جو دو پہاڑوں کے درمیان تھا سب بکریوں سے پُر تھا اور یہ سب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ملکیت تھیں۔ آپؐ نے وہ سب بکریاں اس شخص کو عطا فرما دیں۔ جب وہ شخص اپنی قوم کے پاس واپس گیا تو اس نے کہا: اے میری قوم! مسلمان ہو جاؤ کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) تو اتنی بخشش کرتا ہے کہ اسے اپنے مفلس ہو جانے کا بھی کچھ خیال نہیں ہوتا۔

حضرت انسؓ ہی سے دوسری روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اسی (۸۰) ہزار درہم کہیں سے آئے۔ آپؐ نے ان کو گودڑی پر ڈلوا لیا اور جب تک ان سب کو تقسیم نہ فرما لیا

اپنی جگہ سے نہ اٹھے۔ اور حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جب حضورؐ نے یہ سب مال تقسیم کیا اُس وقت آپؐ کے اپنے پیٹ پر بھوک کی وجہ سے پتھر بندھا ہوا تھا۔

حضرت حسن بن علی رضی اللہ عنہما کے بارے میں روایت ہے کہ ایک شخص ان کے دروازے پر آیا اور اس نے کہا: اے فرزندِ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم مجھے چار سو درہم کی ضرورت ہے۔ آپؓ نے فوراً چار سو درہم گھر سے منگوا کر اسے دے دیے اور رونے لگے۔ لوگوں نے رونے کی وجہ دریافت کی تو فرمایا کہ میں اس بات پر رو رہا ہوں کہ مجھے چاہیے تھا کہ سوال سے پہلے ہی اس کی حاجت اس سے پوچھتا اور پوری کر دیتا۔ اس کی نوبت کیوں آنے دی کہ وہ میرے روبرو آ کر سوال کرے اور مدد کے لیے ہاتھ پھیلائے۔

عبداللہ بن جعفرؓ بیان کرتے ہیں کہ میرا ایک چراگاہ پر سے گزر ہوا۔ میں نے دیکھا کہ ایک حبشی غلام بکریوں کی رکھوالی کر رہا ہے۔ ایک کتا آیا اور اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ حبشی غلام نے ایک روٹی نکال کر اس کو دے دی۔ پھر دوسری اور اس کے بعد تیسری بھی اس کے سامنے ڈال دی۔ عبداللہ بن جعفرؓ کہتے ہیں کہ میں نے اس سے پوچھا کہ اے غلام! تجھے روز کتنی روٹی ملتی ہے؟ اس نے جواب دیا، وہی جو آپ نے دیکھی۔ اس پر میں نے پوچھا کہ پھر تو نے ساری اٹھا کر کیوں کتے کو دے دی؟ غلام نے جواب دیا کہ یہ کتوں کی جگہ نہیں ہے، یہ کتا کہیں دُور سے امید لے کر آیا ہے۔ اس لیے میں نے یہ گوارا نہیں کیا کہ اس کی محنت ضائع کی جائے۔ عبدؓاللہ کہتے ہیں کہ اس کی یہ بات مجھے اتنی پیاری لگی کہ میں نے اس غلام سمیت اس چراگاہ اور بکریوں کو ان کے مالک سے خرید لیا۔ غلام کو آزاد کر دیا اور اس سے کہہ دیا کہ یہ سب بکریاں اور چراگاہ تیری مِلک ہیں۔ میں نے یہ سب کچھ تمہیں بخش دیا۔ غلام نے مجھے دعا دی۔ بکریاں اور چراگاہ سب کچھ صدقہ کر دیا اور وہاں سے چلا گیا۔

ابو سہل سعولؒ کے بارے میں روایت ہے کہ وہ صدقہ و خیرات کبھی کسی محتاج کے ہاتھ پر نہ رکھتے بلکہ زمین پر رکھ دیتے کہ محتاج خود اسے اٹھالیں۔ مریدوں نے آپ سے اس کا سبب دریافت کیا تو فرمایا کہ میں نہیں چاہتا کہ میرا ہاتھ کسی مسلمان کے ہاتھ سے اونچا اور اس کے اوپر ہو

اور نہ درہم و دینار کو میں ایسی باعظمت شے سمجھتا ہوں کہ کسی مسلمان کا ہاتھ ان کے نیچے ہو۔

آپ کو چاہیے کہ سخاوت میں اللہ تعالیٰ کی شان کریمی کو سامنے رکھے۔ چنانچہ اس میں اپنے اور بیگانے کی تمیز بھی نہیں ہونی چاہیے۔ صحیح حدیث میں آیا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام مہمان کے بغیر کھانا نہ کھاتے تھے۔ ایک مرتبہ تین روز تک کوئی مہمان نہ آیا۔ پھر ایک بوڑھے آتش پرست کافر کا آپ کے دروازے پر سے گزر ہوا۔ آپؑ نے اس سے پوچھا کہ تو کون ہے؟ جب اس نے بتایا کہ وہ ایک آتش پرست ہے تو حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا کہ تو میرے ہاں مہمانی کے لائق نہیں ہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے عتاب کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا کہ اے ابراہیمؑ! میں تو ستر برس سے اس کی پرورش کر رہا ہوں اور تجھ سے اتنا نہیں ہو سکتا کہ ایک وقت ہی روٹی کا ایک ٹکڑا اسے دے دے؟

زکوٰۃ اور صدقہ سے مدد لینا:

جن لوگوں کو قرآن مجید میں زکوٰۃ و صدقات کے حقدار قرار دیا گیا ہے ان کے لیے زکوٰۃ لے لینا کوئی عار کی بات نہیں ہے۔ ان کا یہ حق ہے اور کسی حقدار کے لیے اپنا حق لینا کوئی عیب کی بات نہیں ہے۔ بلکہ حقیقتاً حقدار لوگ تو صاحب مال لوگوں پر ایک طرح سے یہ احسان کرتے ہیں کہ ان سے زکوٰۃ اور صدقات قبول کر کے ان کی گردن پر سے بوجھ اتارتے اور ان کے مال کو پاک کر دیتے ہیں۔ لیکن جو شخص زکوٰۃ و صدقات سے مدد پانے کا حقیقت میں حقدار نہیں ہے اور وہ اپنے آپ کو ایسا ظاہر کر کے یہ مال وصول کر لیتا ہے تو وہ دوسرے حقداروں کا حق غصب کرتا ہے اور اُس کے اس مال کے کھانے کو حدیث شریف میں اس سے تشبیہ دی گئی ہے کہ گویا وہ ایک نہایت فربہ اور گرمی میں شرابور آدمی کے استنجا کا پانی پی رہا ہے

(مؤطا امام مالکؒ، کتاب الرقاق، باب لایأخذ الصدقۃ الّا باضطرار)۔

☆☆☆☆☆

ساتواں کشف الحجاب:

روزے کے بارے میں

روزوں کی اہمیت:

خداوندتعالیٰ کا ارشاد ہے: ''یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصِّیَامُ کَمَا کُتِبَ عَلَی الَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ (۲:۱۸۳) یعنی اے ایمان لانے والو! تم پر روزے فرض کردیے گئے ہیں جس طرح تم سے پہلے انبیاؑ کی امتوں پر فرض کیے گئے تھے۔'' پھر فرمایا: ''شَھْرُ رَمَضَانَ الَّذِیْٓ اُنْزِلَ فِیْہِ الْقُرْاٰنُ ھُدًی لِّلنَّاسِ وَبَیِّنٰتٍ مِّنَ الْھُدٰی وَالْفُرْقَانِ ج فَمَنْ شَھِدَ مِنْکُمُ الشَّھْرَ فَلْیَصُمْہُ (۲:۱۸۵)۔ یعنی رمضان وہ مہینہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا جو انسانوں کے لیے سراسر ہدایت ہے اور ایسی واضح تعلیمات پر مشتمل ہے جو راہِ راست دکھانے والی اور حق و باطل کا فرق کھول کر رکھ دینے والی ہیں۔ لہٰذا اب جو شخص اس مہینے کو پائے اس کو لازم ہے کہ اس پورے مہینے کے روزے رکھے.....'' اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ لَخُلُوْفُ فَمِ الصَّائِمِ اَطْیَبُ عِنْدَاللّٰہِ مِنْ رِیْحِ الْمِسْکِ. اِنَّمَا یَذَرُ شَھْوَتَہٗ وَطَعَامَہٗ وَشَرَابَہٗ مِنْ اَجْلِیْ فَالصِّیَامُ لِیْ وَاَنَا اَجْزِیْ بِہٖ. کُلُّ حَسَنَۃٍ بِعَشْرِ اَمْثَالِھَا اِلٰی سَبْعِمِاۃِ ضِعْفٍ اِلَّا الصِّیَامُ فَھُوَلِیْ وَاَنَا اَجْزِیْ بِہٖ (مؤطا امام مالکؒ، کتاب الصیام) یعنی حضورؐ نے فرمایا کہ مجھے قسم ہے اُس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے کہ روزہ دار کے منہ کی بو خداوندتعالیٰ کے نزدیک مشک کی خوشبو سے بھی زیادہ پسندیدہ ہے اور اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ میرا روزہ دار بندہ صرف میری خاطر اپنی شہوت اور اپنے کھانے اور اپنے پینے کو چھوڑتا ہے۔ پس جب وہ صرف میرے لیے روزہ رکھتا ہے تو میں خود ہی اسے اس کے روزے کی جزا دوں گا۔ میرے ہاں دوسری تمام نیکیوں کا بدلہ دس سے لے کر سات سو گنا دیا جاتا ہے، لیکن روزہ اس سے

مستثنیٰ ہے (اس کی جزا بے حساب ہے)۔ چونکہ روزہ خالصۃً میرے لیے رکھا جاتا ہے لہٰذا اس کی جزا میں خود ہی دوں گا۔'' روزے کی اس خصوصیت کی وجہ یہ ہے کہ تمام فرض عبادات میں صرف روزہ ہی ایک ایسی عبادت ہے جو سرتا سر سرّی و پوشیدہ اور کلیۃً خفیہ ہے۔ جس کا ظاہر سے کوئی تعلق نہیں۔ جس میں غیر اللہ کا سرے سے کوئی حصہ نہیں۔ روزہ ایک ایسی عبادت ہے کہ اگر کسی کے دل میں خداوند تعالیٰ کا خوف نہ ہو وہ بڑی آسانی کے ساتھ سب کچھ کھا پی کر بھی لوگوں کے سامنے روزہ دار اور نہایت متقی بنا رہ سکتا ہے۔ روزے کی چوری خدا کے سوا کوئی نہیں پکڑ سکتا۔ چنانچہ حضرت جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: ''اَلصَّوْمُ نِصْفُ الطَّرِيْقَةِ یعنی روزہ آدھی طریقت ہے۔'' کیونکہ روزہ میں ریاء اور نمائش کو دخل نہیں ہے۔ اخلاص کے بغیر آدمی روزہ رکھ ہی نہیں سکتا۔

روزوں کا زمانہ:

روئیتِ ہلال رمضان سے روئیتِ ہلال شوال تک پورے ایک مہینے کے روزے ہر عاقل و بالغ اور مقیم باصحت مسلمان پر ہمیشہ فرض ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد اوپر نقل ہوا ہے کہ: ''فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ یعنی تم میں سے جو اس مہینے کو پائے وہ اس پورے مہینے کے روزے رکھے۔'' اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ آپ ؐ نے فرمایا: ''لَا تَصُوْمُوْا حَتّٰى تَرَوُا الْهِلَالَ وَلَا تُفْطِرُوْا حَتّٰى تَرَوْهُ فَإِنْ غُمَّ عَلَيْكُمْ فَاكْمِلُوا الْعِدَدَ ثَلٰثِيْنَ. (مؤطا امام مالکؒ، کتاب الصیام) یعنی روزے رکھنا شروع نہ کرو جب تک کہ رمضان کا چاند نظر نہ آ جائے اور روزے رکھنا بند نہ کرو جب تک کہ شوال کا چاند نظر نہ آ جائے۔ لیکن اگر بادل وغیرہ کی وجہ سے صحیح صورت کا پتہ نہ چل سکے تو تیس کی گنتی پوری کرلو۔'' اگر رمضان کے چاند میں یہ صورت پیش آئے تو شعبان کے تیس دن پورے کر کے روزہ شروع کرلو۔ اور اگر عید کے چاند میں یہ صورت واقع ہو تو تیس روزے پورے کر کے عید کرلو۔

روزے کی شرطیں:

ہر روزے کے لیے نیت شرط ہے۔ فرض روزے کی نیت قبل فجر کرنی چاہیے۔ مؤطا مذکورہ میں حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ کے بارے میں روایت ہے کہ "کَانَ یَقُوْلُ لَاصَوْمَ اِلَّا مَنْ اَجْمَعَ الصِّیَامَ قَبْلَ الْفَجْرِ یعنی آپ فرمایا کرتے کہ جو شخص فجر سے پہلے روزے کی نیت نہ کرے اس کا روزہ نہیں ہے۔" اسی مضمون کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اور حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا نے بھی بیان کیا ہے۔ اور نفل روزے کی نیت کے بارے میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا بیان فرماتی ہیں کہ: "دَخَلَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ عَلَیْهَا ذَاتَ یَوْمٍ فَقَالَ هَلْ عِنْدَکِ شَیْئٌ؟ قَالَتْ لَا، قَالَ فَاِنِّیْ اِذًا اَصُوْمُ. یعنی ایک روز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس تشریف لائے اور دریافت فرمایا کہ عائشہؓ تمھارے پاس کچھ کھانے کے لیے ہے؟ انھوں نے جواب دیا کہ میرے ہاں تو کچھ نہیں ہے۔ آپؐ نے فرمایا کہ اچھا تو پھر میں روزہ رکھ لیتا ہوں۔" (مؤطا امام مالکؒ، کتاب الصیام)۔ اس سے اہل علم نے یہ اخذ کیا ہے کہ نفل روزہ کی نیت دن کے دوران بھی کی جا سکتی ہے۔

لیکن روزے کی نیت کے بغیر اگر کوئی شخص سارا دن بھی بھوکا پیاسا رہے تو یہ روزہ شمار نہیں ہوگا۔

<u>روزے کی دوسری شرطیں</u>: پیٹ کو کھانے پینے، آنکھوں کو شہوانی نظاروں سے، کان کو غیبت اور جھوٹ اور لغویات کے سننے سے، زبان کو لغو اور فضول باتوں سے اور <u>سارے بدن کو شریعت کی مخالفت اور نفس کی موافقت سے باز رکھنا ہے</u>۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: "اِذَا صُمْتَ فَلْیَصُمْ سَمْعُکَ وَبَصَرُکَ وَلِسَانُکَ وَیَدُکَ وَکُلُّ عُضْوٍ مِنْکَ. یعنی جب تو روزہ رکھے تو چاہیے کہ اپنے کانوں، اپنی آنکھوں، اپنی زبان، اپنے ہاتھوں اور اپنے جسم کے تمام اعضاء کو اللہ تعالیٰ کی ناپسندیدہ باتوں اور اس کے منع کردہ کاموں سے باز رکھے۔" نیز آپؐ نے فرمایا: "رُبَّ صَائِمٍ لَیْسَ لَهٗ مِنْ صَوْمِهٖ اِلَّا الْجُوْعُ وَالْعَطَشُ. یعنی

بہت سے روزہ دار ایسے ہوتے ہیں جن کے پلے روزہ سے بھوک اور پیاس سے مرنے کے سوا کچھ نہیں پڑتا۔'' اور حقیقت یہ ہے کہ مجھے اس شخص پر بڑا تعجب ہوتا ہے جو نفلی روزے رکھ رکھ کر اپنے آپ کو سکھاتا مگر فرض کی پروا نہیں کرتا۔ حالانکہ گناہ اور خدا کی ناپسندیدہ باتوں سے بچنا (اور دوسروں کو بچانا) فرض ہے اور نفلی روزے رکھنا محض ایک سنت۔ فَنَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ قَسْوَةِ الْقَلْبِ. پس ہم خدا کی پناہ مانگتے ہیں دل کی ایسی سختی سے کہ آدمی دیناروں کو ضائع کرے اور درہموں کو جمع کرے۔

روزے کی حقیقت:

روزے کی حقیقت 'اِمساک' ہے یعنی اپنی خواہشاتِ نفس کو روکنا اور قابو میں رکھنا۔ اور ساری طریقت اسی میں پوشیدہ ہے۔ اسی لیے حضرت جنیدؒ نے روزے کو نصف طریقت فرمایا۔ اور میں (علی بن عثمان جلابی) نے ایک مرتبہ سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا تو آپؐ سے عرض کیا: ''یَارَسُوْلَ اللّٰهِ اَوْصِنِیْ یعنی اے اللہ کے رسولؐ! مجھے کوئی نصیحت فرمایئے۔'' آپؐ نے فرمایا: ''اِحْبَسْ حَوَاسَکَ یعنی اپنے حواس خمسہ کو قابو میں رکھ۔'' کیونکہ انسان سے تمام نیکیوں اور برائیوں کا ظہور انہی پانچ حواس کے ذریعہ سے ہوتا ہے۔ آنکھ جو دیکھنے کا آلہ ہے، کان جو سننے کا آلہ ہے، ناک جو سونگھنے کا آلہ ہے، منہ جو ذائقہ کا آلہ ہے اور پورا جسم جو چھونے کا آلہ ہے، یہ پانچوں فرمانبرداری اور معصیت کے مشترک اور یکساں آلات ہیں۔ اور آدمی کے نیک اور بد اور خداوند تعالیٰ کے فرمانبردار اور نافرمان ہونے کا سارا انحصار انہی پانچ آلات کے استعمال پر ہے۔ ایک طرف علم اور عقل اور رُوح کو اور دوسری طرف نفس کو اور ھوا کو ان آلات پر یکساں تصرف کا اختیار اور موقع حاصل ہے۔ اب یہ آدمی کے اپنے ارادہ پر منحصر ہے کہ وہ ان آلات کو اپنے قابو میں رکھنے اور علم و عقل اور روح کے تصرّف میں دینے کی کوشش کرتا ہے یا انھیں نفس اور ھوا کے ہاتھ میں چھوڑ دیتا ہے۔ ان کو قابو میں رکھنے کے لیے روزہ سے بڑھ کر مؤثر ذریعہ کوئی نہیں ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور بزرگانِ دین کا طریقہ:

روزے کی اسی تاثیر کی وجہ سے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کی متابعت میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بہت روزے رکھتے۔ حضورؐ خود رمضان تک کے علاوہ بھی ناغہ کیے بغیر مسلسل روزے رکھتے اور بعض اوقات کئی کئی روز تک کھانا پینا چھوڑ دیتے۔ لیکن جب صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس میں آپؐ کی پیروی کرنی چاہی تو آپؐ نے فرمایا: ''اِیَّاکُمْ وَالْوِصَالَ..... قَالُوْا فَاِنَّکَ تُوَاصِلُ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ. قَالَ اِنِّی لَسْتُ کَھَیْئَتِکُمْ اِنِّی اَبِیْتُ عِنْدَ رَبِّکُمْ[1] یُطْعِمُنِیْ رَبِّیْ وَیَسْقِیْنِیْ (موطا امام مالکؒ، کتاب الصیام، باب النہی عن الوصال)۔ یعنی وصال (درمیان میں کچھ کھائے پیئے بغیر مسلسل روزے رکھتے چلے جانے) سے پرہیز کرو۔ صحابہؓ نے عرض کیا کہ اے اللہ کے رسولؐ! آپؐ خود تو وصال پر عامل ہیں۔ آپؐ نے فرمایا: میں تمھاری طرح نہیں ہوں، میرا معاملہ تم سے مختلف ہے۔ میں رات تمھارے رب کے پاس گزارتا ہوں اور وہ مجھے کھلاتا بھی ہے اور پلاتا بھی ہے۔'' اس سے ایک گروہ نے یہ حکم اخذ کیا ہے کہ 'وصال' ممنوع اور خلافِ سنت ہے۔ اور دوسرے گروہ کا کہنا یہ ہے کہ یہ نہی تحریم کی نہی نہیں ہے بلکہ صرف بیانِ حقیقت کی نوع سے تعلق رکھتی ہے۔ مزید برآں یہ حضرات کہتے ہیں کہ اگر آدمی درمیان میں ایک قطرہ پانی بھی حلق سے نیچے اتار لے تو وصال کی صورت باقی نہیں[2] رہے گی۔ چنانچہ اکثر مشائخ اور صوفیاء رحمہم اللہ بہت روزے رکھتے اور ان میں سے بہت سے ہمیشہ روزے سے رہتے۔

حضرت سہل بن تستریؒ کے بارے میں روایت ہے کہ آپ ہر ماہ کی پندرہ تاریخ کو ایک دفعہ کھانا کھاتے اور رمضان کے مہینے میں شروع مہینہ سے عید تک کچھ نہ کھاتے۔ اور اس کے باوجود ہر رات چار سو رکعت نماز ادا کرتے۔ لیکن ایسا اللہ تعالیٰ کی خاص تائید کے بغیر ممکن نہیں۔

---

[1] ''عِنْدَ رَبِّکُمْ'' کے الفاظ موطا میں نہیں ہیں لیکن حضرت علی ہجویریؒ نے نقل کیے ہیں۔ شاید انھوں نے یہ روایت کسی اور کتاب سے لی ہو

[2] اوپر جو حدیث بیان کی گئی ہے۔ اس کی تشریح کرتے ہوئے شاہ ولی اللہؒ مصفّٰی میں فرماتے ہیں: ''وصال زائل می شود بیک قطرۂ آب و یک لقمۂ طعام زیرا کہ حقیقت مذ الصوم است فی غیر وقتہ و آنچہ مبطل صوم است مبطل آں نیز باشد''۔ یعنی وصال کی صورت پانی کے ایک قطرے یا کھانے کے ایک لقمے سے زائل ہو جاتی ہے۔ کیونکہ وصال دراصل روزے ہی کے آگے توسیع ہے اور جس چیز سے روزہ ختم ہو جاتا ہے اس سے 'وصال' بھی ختم ہو جائے گا۔

حضرت ابراہیم ادہمؒ کے بارے میں بھی بیان کرتے ہیں کہ آپ نے رمضان شریف کا پورا مہینہ کچھ نہ کھایا اور رمضان کا یہ مہینہ گرمی کے موسم میں تھا۔ روزانہ گیہوں مزدوری پر کاٹتے اور جو کچھ مزدوری میں ملتا، حاجت مندوں میں بانٹ دیتے اور ساری رات نماز پڑھتے رہتے۔ لوگوں نے آپ پر خوب پہرے لگا کر دیکھا۔ لیکن آپ کا کھانا پینا کسی پر ثابت نہ ہوا اور نہ کسی نے آپ کو سوتے دیکھا۔

شیخ ابونصر طاؤس الفقراء رحمۃ اللہ علیہ رمضان کے مہینہ میں بغداد پہنچے۔ آپ کو مسجد شونیزیہ میں ایک حجرہ دے دیا گیا اور تراویح پڑھانے کی خدمت آپ کے سپرد ہوئی۔ آپ نے عید تک پانچ مرتبہ قرآن مجید ختم کیا۔ ہر رات آپ کا خادم ایک روٹی آپ کو دے جاتا۔ عید کے روز جب آپ نماز کے لیے گئے اور خادم نے حجرے میں جا کر دیکھا تو پوری تیس روٹیاں اسی طرح حجرے میں رکھی تھیں۔

علی بن بکاء رحمۃ اللہ علیہ بیان کرتے ہیں کہ حفص مصیصی رحمۃ اللہ علیہ کو میں نے دیکھا کہ رمضان شریف میں پندرہ روز گزرے بغیر کھانا نہ کھاتے تھے۔

میں (علی بن عثمان جلابی) نے بہت سے بزرگوں کو ایامِ بیض (قمری مہینے کی تیرھویں، چودھویں اور پندرھویں تاریخوں) کے روزے رکھتے دیکھا ہے۔ اور بعض صوم داؤدی (ایک روز بیچ چھوڑ کر ہر تیسرے روز روزہ رکھنے کے طریقہ) پر عامل ہیں۔ اس لیے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے صومِ داؤدی کو 'خیر الصیام' فرمایا ہے۔ میں نے ایسے مشائخ بھی دیکھے ہیں جو اکثر روزہ رکھتے ہیں مگر کبھی کسی کو اس کی خبر نہیں ہوتی۔ روزے کی حالت میں اگر کھانا ان کے سامنے لایا جائے تو کھا لیتے ہیں تا کہ ان کا روزے سے رہنے کا راز دوسروں پر افشا نہ ہو۔ ان کا یہ طریقہ سنت کے موافق ہے۔ کیونکہ حضرت عائشہ اور حضرت حفصہ رضی اللہ عنہما بیان کرتی ہیں کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم گھر میں تشریف لائے اور انھوں نے آپؐ سے کہا: ''اَنَا قَدْ خَبَزْنَا لَکَ حَیْسًا قَالَ عَلَیْہِ السَّلَامُ اَمَّا اِنِّیْ کُنْتُ اُرِیْدُ الصَّوْمَ لٰکِنْ قَرِّبِیْہِ سَاَصُوْمُ یَوْمًا مَکَانَہٗ. یعنی حضرت عائشہؓ اور حضرت حفصہؓ نے آپؐ سے کہا کہ ہم نے آپ کے لیے حَیس (ایک قسم کا کھانا

جو گھی، کھجور اور ستو کو ملا کر پکاتے ہیں) پکایا ہے۔ حضورؐ نے فرمایا کہ میں تو آج روزے کا ارادہ کرلیا تھا۔ چلو، لاؤ، اس کے بجائے کسی اور دن روزہ رکھ لوں گا۔''

لیکن یاد رہے کہ یہ معاملہ نفل روزے کا ہے فرض روزہ کسی شرعی عذر کے سوا نہیں چھوڑا جا سکتا۔ ورنہ کفارہ لازم آئے گا۔

انسانوں کی دو قسمیں:

دنیا میں دو طرح کے لوگ ہیں۔ ایک وہ جو عمر بھر باطن اور عقبیٰ کی آبادی میں لگے رہتے ہیں تا کہ ہمہ تن خدا کے ہو جائیں۔ اور دوسرے وہ جو تمام عمر بدن کی تیاری اور اسی کی خدمت میں مشغول رہتے ہیں اور اسی کی خواہشات کو پورا کرنے میں اپنی ساری محنت اور جان کھپاتے رہتے ہیں۔ چنانچہ ایک کو تو طعام اپنے بدن کو خدا کی بندگی اور اس کے تفویض کردہ کام بجالانے کے لیے درکار ہوتا ہے اور دوسرے کی زندگی ہی کھانے کے لیے ہوتی ہے۔ ان دونوں گروہوں میں ہر لحاظ سے زمین و آسمان کا فرق ہے۔

اپنے زمانے کے لوگوں کو مخاطب کر کے حضرت علی ہجویریؒ فرماتے ہیں: ''وَکَانَ الْمُتَقَدِّمُوْنَ یَأْکُلُوْنَ لِیَعِیْشُوْا وَاَنْتُمْ تَعِیْشُوْنَ لِتَأْکُلُوْا. یعنی متقدمین حضرات تو اس لیے کھاتے تھے تا کہ زندہ رہیں لیکن تمھارا مقصود زندگی ہی یہ ہے کہ کھاؤ پیو۔''

☆☆☆☆☆

آٹھواں کشف الحجاب:

حج کے بارے میں

حج کی اہمیت:

اہل ایمان پر جو چیزیں فرضِ عین ہیں ان میں ایک فرض عین حج بھی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''وَلِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ اِلَيْهِ سَبِيْلاً (۹۷:۳) یعنی جو لوگ اس گھر تک پہنچنے کی استطاعت رکھتے ہوں ان پر اس گھر کا حج لازم ہے۔'' اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اَلْحَاجُّ وَفْدُ اللّٰهِ يُعْطِيْهِمْ مَاسَأَلُوْا وَيَسْتَجِيْبُ لَهُمْ مَادَعَوْا، یعنی حاجی اللہ کا گروہ ہیں، جو کچھ وہ خدا سے مانگتے ہیں وہ انھیں عطا فرماتا ہے، اور جو دُعا وہ کرتے ہیں اُسے وہ قبول فرماتا ہے۔'' نیز فرمایا: ''مَنْ لَمْ يَمْنَعْهُ مِنَ الْحَجِّ حَاجَةٌ ظَاهِرَةٌ اَوْ سُلْطَانٌ جَابِرٌ اَوْمَرَضٌ حَابِسٌ فَمَاتَ وَلَمْ يَحُجَّ فَلْيَمُتْ اِنْ شَاءَ يَهُوْدِيًا وَاِنْ شَاءَ نَصْرَانِيًا. یعنی جس شخص کے حج کرنے کی راہ میں نہ محتاجی حائل ہو، نہ کوئی سلطان جابر، اور نہ اُسے کوئی ایسا مرض لاحق ہو جس کی وجہ سے وہ سفرِ حج نہ کر سکتا ہو اور پھر بھی وہ حج کیے بغیر مر جائے، ایسے شخص کے لیے برابر ہے کہ وہ یہودی بن کر مرے یا نصرانی بن کر۔''

لہٰذا حج ہر عاقل و بالغ اور صاحبِ استطاعت مسلمان پر فرض ہے۔

حج کی حقیقت:

حج کا مقصود یہ ہے کہ آدمی اپنے آپ کو کامل طور پر خداوند تعالیٰ کے سپرد کر دے۔ جیسا کہ اس گھر کے بانی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنے آپ کو خدا کے سپرد کر دیا تھا۔ قرآن مجید میں ان کے بارے میں ہمیں بتایا گیا ہے کہ: ''وَاِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗ اَسْلِمْ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ (۱۳۱:۲) یعنی جس وقت ابراہیمؑ سے اس کے رب نے کہا کہ کاملاً ہمارے تابع فرمان ہو

جاتو اس نے فوراً جواب دیا کہ میں سرتاپا پروردگارِ عالم کا تابع فرمان ہوگیا۔'' اور اس کے بعد انھوں نے اللہ کے سوا دوسرے ہر ایک سے اپنا تعلق منقطع کر کے اپنا مستقل رشتہ اپنے پروردگار سے جوڑ لیا، یہاں تک کہ جب باپ، برادری، قوم اور بادشاہ سب نے انھیں آگ میں ڈالنے کا بالاتفاق فیصلہ کر کے اور گائے کے چمڑے میں سی کر آگ میں پھینکنے کے لیے گوپیے میں بھی رکھ دیا تو جبریل علیہ السلام تشریف لائے اور گوپیے کا رسہ تھام کر آپ سے عرض کیا: ''هَلْ لَکَ اِلَیَّ مِنْ حَاجَةٍ؟ یعنی ابراہیم! میرے لائق کوئی خدمت ہو تو بتایئے۔'' حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جواب دیا: ''اَمَّا اِلَیْکَ فَلَا یعنی اگر مدد دینے والا تو ہے تو مجھے آپ سے کسی مدد کی کوئی حاجت نہیں۔'' جبرئیل علیہ السلام نے بے قرار ہو کر عرض کیا تو پھر اپنی حاجت خدا سے ہی مانگیے۔ آپ نے جواب دیا: ''حَسْبِیْ مِنْ سُؤَالِیْ عِلْمُهٗ بِحَالِیْ. یعنی اُس سے عرض کرنے کی ضرورت نہیں ہے، اُس کو علم ہے کہ میں کس حال میں ہوں۔'' حج کی ساری حقیقت حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اسی اسوہ میں مضمر ہے اور اس کا اصل مقصود بندے کے اندر اسی جذبے اور خداوند تعالیٰ سے اسی طرح کا تعلق پیدا کرنا ہے۔[1]

حج کی اصل حقیقت کیا ہے وہ حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ کے حسب ذیل واقعہ سے بھی ظاہر ہے:

ایک شخص آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور آپ نے اس سے پوچھا کہ تم کہاں سے آئے ہو؟ اس نے عرض کیا کہ حج کر کے آیا ہوں۔ حضرت جنیدؒ نے حیرت سے دریافت کیا: کیا تو نے حج کیا ہے؟[2] اسنے کہا: جی ہاں، حضرت جنیدؒ نے اس سے پوچھا کہ جب تم نے حج کے ارادہ سے گھر سے کوچ کیا تو کیا تُو نے اُس وقت اپنے گناہوں سے بھی کنارہ کیا یا نہیں؟ اس شخص نے جواب دیا کہ نہیں، میں نے اس کا تو خیال نہیں کیا۔ حضرت جنیدؒ نے فرمایا کہ پھر تو تم حج کے لیے نکلے ہی

---

[1] چنانچہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: قَدْ کَانَتْ لَکُمْ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ فِیْ اِبْرٰهِیْمَ وَالَّذِیْنَ مَعَهٗ (۶۰:۴) "یعنی تمھارے لیے ابراہیم اور ان کے ساتھیوں کے طرزِ عمل میں بہترین نمونہ ہے۔"

[2] معلوم ہوتا ہے کہ اس کی حرکات و سکنات ایسی تھیں جو حضرت جنیدؒ کے نزدیک ایک حاجی کی نہیں ہونی چاہئیں تھیں۔ (مرتب)

نہیں۔ پھر پوچھا کہ اس سفر میں تو نے جو منزلیں طے کیں اور راتوں کو جو مقام کیے تو کیا خدا کے تقرب کی منزلیں اور اس راہ کے مقامات طے کرنے کا بھی اہتمام کیا؟ اس نے جواب دیا کہ اس کا تو میں نے اہتمام نہیں کیا۔ حضرت جنیدؒ نے فرمایا کہ پھر تو تم نے خدا کے گھر کی طرف سفر نہیں کیا اور نہ اس کی طرف کوئی منزل طے کی۔ پھر آپ نے پوچھا کہ جب تم نے احرام باندھا اور اپنے روزمرہ کے کپڑے اتارے تو ان کے ساتھ تم نے اپنی بری صفات اور عادات سے بھی علیحدگی اختیار کی یا نہیں؟ اس نے کہا کہ اس طرف تو میں نے توجہ نہیں کی۔ آپ نے فرمایا کہ پھر تو تم نے احرام بھی نہیں باندھا۔ اس کے بعد حضرت جنیدؒ نے پوچھا کہ جب تو عرفات میں کھڑا ہوا تو کیا تجھے مشاہدے کا کشف حاصل ہوا یا نہیں؟ یعنی تو نے اپنے اندر یہ کیفیت پائی یا نہیں کہ گویا تو نے اللہ تعالیٰ کو اپنے سامنے موجود دیکھ رہا ہے۔ اس نے جواب دیا کہ نہیں ایسا نہیں ہوا۔ آپ نے فرمایا کہ پھر تو تُو گویا عرفات میں گیا ہی نہیں۔ اس کے بعد آپ نے اس سے پوچھا کہ جب تو مزدلفہ گیا تو کیا تو نے نفسانی خواہشات کو چھوڑا یا نہیں؟ اس نے جواب دیا کہ میں نے اس طرف دھیان نہیں دیا۔ آپ نے فرمایا کہ بس تو پھر تُو مزدلفہ بھی نہیں گیا۔ آپ نے پوچھا کہ جب تو نے خانہ کعبہ کا طواف کیا تو کیا اس وقت تو نے جمالِ خداوندی کے لطائف دیکھے یا نہیں؟ اس نے کہا کہ نہیں، میں نے تو ایسی کوئی شے نہیں دیکھی۔ آپ نے فرمایا کہ پھر تو نے طواف بھی نہیں کیا۔ پھر آپ نے پوچھا کہ جب تو نے صفا اور مروہ کے درمیان سعی کی تو کیا اس وقت تو نے صفا اور مروہ اور ان کے درمیان سعی کی حقیقت اور اس کے مقصود کا بھی ادراک کیا یا نہیں؟ اس شخص نے عرض کیا کہ نہیں میں ان کے مقصود کو نہیں سمجھا۔ آپ نے فرمایا کہ پھر ابھی تک تو نے سعی بھی نہیں کی۔ آپ نے پوچھا کہ جس وقت تو نے نحر کرنے کی جگہ قربانی کی تو اس جگہ اپنے نفس اور اس کی خواہشات کو بھی تو نے خدا کی راہ میں قربان کیا یا نہیں۔ اس نے جواب دیا کہ نہیں، اس طرف بھی میری توجہ نہیں گئی۔ آپ نے فرمایا کہ بس پھر تو نے قربانی بھی نہیں کی۔ پھر آپ نے اس سے پوچھا کہ جب تو نے جمرات پر سنگریزے پھینکے تو کیا تو نے اپنے ہمنشیں برے ساتھیوں اور بری خواہشات کو بھی اپنے سے دُور

پھینکا یا نہیں۔ اس نے عرض کیا کہ نہیں۔ آپ نے فرمایا کہ تو نے تو پھر رمی بھی نہیں کی، واپس جاؤ اور اس صفت کے مطابق پھر حج کرو۔ یہاں تک کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے مقام تک پہنچ جاؤ، اس ابراہیمؑ کے مقام تک جس کے بارے میں ارشاد ہوا: "وَاِبْـرَاهِیْـمَ الَّـذِیْ وَفّٰـی (۵۳:۳۷) یعنی وہ ابراہیمؑ جس نے (اپنے رب سے) وفاداری کا حق ادا کر دیا۔"

بزرگانِ دین کا حج:

حضرت ابو یزید رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے پہلی مرتبہ حج کرنے کے وقت بجز گھر کے کوئی چیز نہ دیکھی۔ دوسری مرتبہ گھر کو بھی دیکھا اور صاحب خانہ کو بھی دیکھا اور تیسری دفعہ جب حج کے لیے گیا تو گھر کو نہیں دیکھا صرف صاحبِ خانہ ہی کو دیکھا۔

حضرت فضیل بن عیاض رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے عرفات میں ایک جوان کو سر نیچا کیے ہوئے خاموش دیکھا جب کہ دوسرے سب لوگ دُعا میں مشغول تھے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ اے جوان! تو کیوں دُعا نہیں مانگتا؟ اس نے کہا کہ میں پریشان ہوں کہ میں نے اصل وقت کو ضائع کر دیا۔ شرم کے مارے میرا ہاتھ دعا کے لیے نہیں اٹھتا۔ میں نے اس سے کہا کہ تو دعا مانگ تا کہ خداوند تعالیٰ تجھے ان سب لوگوں کی برکت سے اپنی مراد کو پہنچا دے۔ اس پر اُس نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے۔ اس کے منہ سے ایک چیخ نکلی اور ساتھ ہی اس کی رُوح تن سے جدا ہو گئی۔

اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ.

☆☆☆☆☆

نواں کشف الحجاب:

صحبت یعنی معاشرتی زندگی کے آداب واحکام کے بارے میں

اَدب کے معنی اور آداب کی اہمیت:

'ادب' سیکھنے کے معنی اپنے اندر نیک خصلتوں کو جمع اور پرورش کرنا ہے: فَالَّذِی اجْتَمَعَ فِیْہِ خِصَالُ الْخَیْرِ فَھُوَ اَدِیْبٌ، یعنی جس شخص میں عمدہ خصلتیں جمع ہوں وہ ادیب ہے۔ سورۂ تحریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا قُوْآ اَنْفُسَکُمْ وَاَھْلِیْکُمْ نَارًا (۶۶:۶) یعنی اے وہ لوگو جو ایمان لائے ہو! اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو آگ سے بچاؤ'' اس کے معنی ہیں: اَدِّبُوْھُمْ یعنی انھیں ایسا ادب سکھاؤ جو اُن کو آگ سے بچائے۔ چنانچہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''حُسْنُ الْاَدَابِ مِنَ الْاِیْمَانِ یعنی آدمی کے آداب کا عمدہ ہونا اس کے ایمان کا ضروری حصہ ہے۔'' نیز آپؐ نے فرمایا: ''اَدَّبَنِیْ رَبِّیْ فَاَحْسَنَ تَادِیْبِیْ یعنی میرے رَب نے مجھے ادب سکھایا اور بہت ہی اچھا ادب سکھایا۔''

حقیقت یہ ہے کہ ہر کام میں (خواہ وہ دینی ہو یا دنیوی) حُسن اس کے آداب کو ملحوظ رکھ کر کرنے سے ہی پیدا ہوتا ہے۔ اور مسلمان اور کافر اور مُوَحِّد اور مُلحِد سب اس امر پر متفق ہیں کہ معاملات اور تعلّقات میں پاسِ ادب خوبی کی چیز ہے۔ بلکہ دنیا کی تمام رسوم دراصل نام ہی متعلقہ امور میں ضروری آداب بجالانے کا ہے۔

دین میں ادب ملحوظ رکھنے کے معنی سنت کی حفاظت کرنا ہے، لوگوں سے ادب برتنے کے معنی ان کے ساتھ حُسنِ سلوک اور مروّت سے پیش آنا ہے۔ اور دنیوی معاملات میں ادب ملحوظ رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی ہر معاملہ کرتے وقت اپنی عزت کی حفاظت کرے یعنی کوئی ایسی صورت نہ

اختیار کرے، جس سے کبھی اس کی عزت وآبرو پر حرف آئے۔

خدا کا ادب اور اُس کی تعظیم کرنے سے مراد یہ ہے کہ اس کے شعائر اور اس کے احکام کی تعظیم اور تکریم کی جائے اور یہ چیز تصوف کی راہ میں تقوے کی روش اختیار کرنے سے حاصل ہوتی ہے۔ جس کی صورت یہ ہے کہ صرف ممنوع ہی سے نہیں بلکہ مشکوک سے بھی اجتناب کیا جائے۔ جو شخص خداوند تعالیٰ کے شعائر اور شواھد کی تعظیم سے بے پرواہ ہو اس کا طریقت میں کوئی حصہ نہیں۔ اور یہ چیز سکر اور غلبہ کسی حال میں بھی ساقط نہیں ہوتی۔ جو شخص یہ کہتا ہے کہ جب بندہ محبت میں مغلوب ہوتا ہے تو متابعت کا حکم اس سے ساقط ہو جاتا ہے، وہ ملحد ہے، اس پر خدا کی لعنت ہو۔ کیونکہ تارک الادب کسی صورت میں ولی نہیں ہوتا۔ جب تک کوئی انسان اپنے ہوش وحواس میں قائم ہے ہر حال میں آداب کی پیروی کرنا اس کے لیے لازم ہے۔ ہاں یہ دُرست ہے کہ کبھی یہ پیروی تکلّف کے ساتھ ہوگی اور کبھی تکلّف کے بغیر۔ اس کا انحصار خدا کے ساتھ انسان کے تعلق کی کیفیت پر ہے۔ یہ تعلق جتنا کم اور سطحی ہوگا۔ خدا کا فرمان بجالانے میں آدمی تکلیف محسوس کرے گا۔ اور جس قدر گہرا اور مخلصانہ ہوتا جائے گا تکلیف کم ہوتی چلی جائے گی۔ یہاں تک کہ اس فرمان کو بجالانا ہی اس کے لیے راحت کا سامان بن جائے گا، اور اس کے بغیر اسے چین نہ آئے گا۔

آداب کی قسمیں:

آداب کی تین قسمیں ہیں:

ایک قسم خداوندِ ارض وسما کے ساتھ اس کی توحید سے متعلق ہے۔ خداوند تعالیٰ کے ادب کا تقاضا یہ ہے کہ آدمی اپنے اوپر ہر آن اس نکتۂ نظر سے نگاہ رکھے کہ وہ کوئی ایسی حرکت نہ کر بیٹھے جب سے خداوند تعالیٰ کی بے حرمتی ہوتی ہو۔ اس کا رویہ کم سے کم وہ ہونا چاہیے جو کہ بادشاہوں کے درباروں میں ان کے درباریوں اور خادمیوں کا ہوتا ہے۔ صحیح حدیثوں میں مذکور ہے کہ ایک دن حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پاؤں پھیلا کر بیٹھے ہوئے تھے کہ حضرت جبرئیل علیہ السلام تشریف لائے اور انھوں نے آپؐ سے کہا: "**یَامُحَمَّدُ اِجلِس جَلسَةَ العَبدِ** یعنی اے محمدؐ! اس طرح سے بیٹھو جس طرح ایک غلام کو بیٹھنا چاہیے۔" حضرت حارث محاسبیؒ کے بارے میں روایت

ہے کہ چالیس برس تک ایک مرتبہ بھی دیوار سے ٹیک لگا کر نہیں بیٹھے۔ جب بیٹھے تو دوزانو ہو کر بیٹھے۔ لوگوں نے پوچھا کہ آپ اتنی تکلیف کیوں اٹھاتے ہیں ٹیک لگا کر آرام سے کیوں نہیں بیٹھتے؟ فرمایا کہ خداوند تعالیٰ کے مشاہدہ میں (یعنی اس کی بارگاہ میں اُس کے سامنے) اگر میں اس طرح سے نہ بیٹھوں جیسے کہ غلام اپنے آقا کے روبرو بیٹھتے ہیں تو مجھے شرم آتی ہے۔

میں (علی ہجویری بن عثمان جلابی) نے خراسان میں خدا کے ایک بندے کو دیکھا جو بہت ہی مشہور تھا اور لوگ اسے مُلندی کے نام سے پکارتے تھے۔ یہ بزرگ بیس برس سے کھڑا ہے اور نماز میں قعدہ (التحیات) کے سوا وہ نہیں بیٹھا۔ میں نے اس سے اس کی وجہ پوچھی تو اس نے جواب دیا کہ میرا ابھی یہ مرتبہ نہیں کہ خداوند تعالیٰ کے مشاہدہ میں بیٹھوں۔ یعنی یہ کہ خداوند تعالیٰ مجھے دیکھ رہا ہو اور میں اُس کی غلامی کا دعویدار اس کے سامنے بیٹھا ہوا ہوں۔

حضرت ابویزید سے لوگوں نے پوچھا کہ بِمَ وَجَدْتَ مَاوَجَدْتَ یعنی آپ نے جو کچھ پایا کیسے پایا؟ قَالَ بِحُسْنِ الصُّحْبَةِ مَعَ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ. آپ نے جواب دیا کہ میں نے جو کچھ پایا اللہ عزوجل کے ساتھ حسنِ صحبت (ادب ملحوظ رکھنے) سے پایا۔

دوسری قسم اَدب کی باہم کاروبار اور معاملات سے متعلق ہے۔ اس ادب کو ملحوظ رکھنے کی صورت یہ ہے کہ آدمی سوا سچائی کے کچھ نہ کہے۔ اس سے تمام معاملات خود بخود ٹھیک ہو جائیں گے۔

تیسری قسم ادب کی یہ ہے کہ خود بھی اپنی ان چیزوں پر نظر نہ ڈالے جو اس کے سوا غیر کو نہ دیکھنی چاہئیں۔ یعنی اپنے ستر کی دوسروں ہی سے نہیں اپنے آپ سے بھی حفاظت کرے۔

آداب سیکھنے کی صورت: اچھی صحبت

صحبت کی اہمیت:

آداب سیکھنے کی صورت خدا کے نیک اور بزرگ بندوں کی صحبت اختیار کرنا ہے۔ تنہا رہنے سے نہ آدمی آداب سیکھ سکتا ہے اور نہ آداب کو برت سکتا ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ مرید کے لیے تنہا

رہنے سے بڑھ کر کوئی آفت نہیں۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اَلشَّیْطَانُ مَعَ الْوَاحِدِ وَھُوَ مِنَ الْاِثْنَیْنِ اَبْعَدُ یعنی جب آدمی تنہا ہوتا ہے تو اس کے ساتھ شیطان ہوتا ہے اور دو سے وہ دُور بھاگتا ہے۔'' اور اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا: ''مَایَکُوْنُ مِنْ نَّجْوٰی ثَلٰثَۃٍ اِلَّا ھُوَ رَابِعُھُمْ وَلَا خَمْسَۃٍ اِلَّا ھُوَ سَادِسُھُمْ وَلَآ اَدْنٰی مِنْ ذٰلِکَ وَلَا اَکْثَرَ اِلَّا ھُوَ مَعَھُمْ (۵۸:۷) یعنی کوئی سرگوشی تین آدمیوں کی ایسی نہیں ہوتی جس میں چوتھا خدا موجود نہ ہو اور نہ پانچ آدمیوں میں کوئی سرگوشی ایسی ہوتی ہے کہ جس میں چھٹا خدا موجود نہ ہو اور نہ اس سے کم یا زیادہ تعداد افراد میں کوئی سرگوشی ایسی ہوتی ہے جس میں وہ (خدا) موجود نہ ہو۔'' دیکھیے اللہ تعالیٰ نے بھی دو یا اس سے زائد آدمیوں کے ساتھ اپنی معیت کا ذکر فرمایا ہے، کیونکہ دو سے کم میں سرگوشی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ پس آدمی کے لیے کوئی آفت تنہائی کے برابر نہیں ہے۔ چنانچہ میں (علی بن عثمان جلابی) نے بزرگوں کی روایات میں پایا ہے کہ جنید رحمۃ اللہ علیہ کے ایک مرید کو خیال ہوا کہ میں نے درجۂ کمال حاصل کر لیا ہے اس لیے اب میرے لیے صحبت کی نسبت یکسوئی اور گوشہ نشینی بہتر ہے۔ چنانچہ اس نے صحبت ترک کر کے گوشہ نشینی اختیار کر لی۔ جب رات کا وقت آتا تو کچھ لوگ اس کے پاس اونٹ لاتے اور اس سے کہتے کہ آپ کو بہشت میں جانا چاہیے۔ چنانچہ وہ اونٹ پر سوار ہو جاتا۔ کافی دیر تک سفر کرنے کے بعد ایک نہایت خوش نما اور دلکش جگہ ظاہر ہوتی۔ جہاں بہت خوبصورت آدمی، نہایت لذیذ اور عمدہ کھانے، پھل، باغ اور نہریں ہوتیں۔ صبح کے وقت تک وہ وہاں رہتا۔ پھر سو جاتا اور جب بیدار ہوتا تو اپنے آپ کو اپنے حجرے کے دروازے پر پڑا پاتا۔ یہ سلسلہ اس کے ساتھ جاری رہا یہاں تک کہ اس کے دل میں رعونت اور غرور نے جڑ پکڑ لی اور اس نے اپنی بزرگی کے بڑے بڑے دعوے کرنے شروع کر دیے کہ میں یہ ہوں اور وہ ہوں اور مجھ پر ایسی اور ایسی حالت گزرتی ہے۔ جب یہ اطلاع حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ تک پہنچی تو آپ اس کے پاس تشریف لائے اور آپ نے دیکھا کہ تکبر اور غرور سے اس کی حالت کچھ سے کچھ ہو رہی ہے۔ آپ نے اس سے حال دریافت کیا تو اس نے سارا حال بیان کیا۔ حضرت جنیدؒ نے فرمایا کہ اگر آج کی رات وہاں جاؤ تو تین مرتبہ لاحول ولا قوۃ الا باللہ پڑھ کر

پھونک مارنا۔ جب رات آئی تو پھر وہی واقعہ پیش آیا۔ یہ شخص اپنی بزرگی اور اپنے ان واردات کے حقیقت ہونے کا پکا یقین رکھتا تھا اور حضرت جنیدؒ کی روحانیت اور خدارسیدگی کا بھی دل سے منکر ہو چکا تھا۔ لیکن پھر بھی محض تجربہ کی خاطر اس نے تین مرتبہ لاحول پڑھ کر پھونک ماردی۔ وہ مرید بیان کرتا ہے کہ جونہی میں نے پھونک ماری وہ سب لوگ جو اس جنت میں تھے چیخیں مارتے ہوئے بھاگ گئے۔ اور میں نے اپنے آپ کو غلاظت کے ایک ڈھیر پر بیٹھے ہوئے پایا اور میرے اردگرد مردار کی کچھ ہڈیاں پڑی تھیں۔ چنانچہ میں اپنی غلطی پر متنبہ ہوا۔ اپنی تنہائی اور گوشہ نشینی سے توبہ کی اور صحبت میں دوبارہ شامل ہو گیا۔

چھوٹوں کی صحبت:

صحبت کے لیے یہ کوئی شرط نہیں ہے کہ اپنے سے بڑے اور بہتر ہی کی صحبت اختیار کرے۔ اپنے سے چھوٹوں کی صحبت بھی اختیار کی جا سکتی ہے۔ فرق صرف یہ ہوگا کہ اگر آدمی اپنے سے بڑے اور بہتر لوگوں کی مجلس میں رہے گا تو اُن سے خود فائدہ اٹھائے گا اور اگر اپنے سے چھوٹوں کی مجلس میں ہوگا تو وہ اس سے فائدہ حاصل کریں گے۔ علم سیکھنا اور سکھانا دونوں یکساں ضروری اور فائدہ مند ہیں۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''**اِنَّ مِنْ تَمَامِ التَّقْوٰی تَعَلُّمُ مَنْ لَا یَعْلَمُ**، یعنی پرہیزگاری کا کمال[1] یہ ہے کہ ایسے شخص کو علم سکھا جو علم نہ رکھتا ہو۔''

احباب کا انتخاب اور ان کی اہمیت:

لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ صحبت ہر حال میں اختیار کی جائے اور اگر اچھے اور بھلے لوگوں کی صحبت میسر نہ آئے تو برے لوگوں کی صحبت اختیار کر لی جائے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''**اَلْمَرْءُ عَلٰی دِیْنِ خَلِیْلِهٖ فَلْیَنْظُرْ اَحَدُکُمْ مَنْ یُخَالِلُ**، یعنی آدمی کا دین اور طور طریق دراصل وہی ہوتے ہیں جو اس کے دوستوں کے ہوں۔ اس لیے آدمی کو اس بات پر

---

[1] پرہیزگاری کا کمال اس لیے کہ جس قدر کوئی شخص خدا سے ڈرنے والا ہوگا اسی قدر جانفشانی اور کثرت کے ساتھ وہ خدا کی باتیں اس کے زیادہ سے زیادہ بندوں تک پہنچانے کی سعی کرے گا۔ اور اس لیے بھی کہ اپنی علمیت کے زعم میں مبتلا اکثر لوگ اَن پڑھ اور مبتدی قسم کے طالبان علم کو تعلیم دینا اپنے لیے کسر شان تصور کرتے ہیں۔ (مرتب)

نگاہ رکھنی چاہیے کہ وہ کن لوگوں سے دوستی اور صحبت رکھتا ہے۔'' اس انتخاب میں سب سے مقدم چیز دین اور اخلاق ہیں۔ نیز اچھے لوگوں میں سے زیادہ سے زیادہ افراد کے ساتھ دوستی اور محبت کے تعلقات بڑھانے کی کوشش کرنی چاہیے۔ کیونکہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ: ''اَکْثِرُوْا مِنَ الْاِخْوَانِ فَاِنَّ رَبَّکُمْ حَیٌّ کَرِیْمٌ یَسْتَحْیِ اَنْ یُعَذِّبَ عَبْدَہٗ بَیْنَ اِخْوَتِہٖ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ، یعنی بہت سے لوگوں کو اپنے بھائی بناؤ کیونکہ تمھارا رب جو حیّ و کریم ہے اس بات سے شرماتا ہے کہ اپنے کسی بندے کو قیامت کے روز اس کے بھائیوں کے روبرو سزا دے۔'' لیکن یہ بات واضح رہنی چاہیے کہ یہ دوستی اور برادرانہ تعلق خدا کی خاطر ہونا چاہیے نہ کہ کسی دنیوی غرض اور مطلب برآری کے لیے۔

صحبت اور اس کے اچھا ہونے کی اہمیت کا احساس جن لوگوں کو ہو جاتا ہے وہ اپنی اور اپنے سے بڑھ کر اپنے دوستوں اور احباب کی فکر رکھتے ہیں۔ حکایات میں آیا ہے کہ ایک شخص کعبہ کے گرد طواف کر رہا تھا اور یہ دعا کر رہا تھا: ''اَللّٰھُمَّ اَصْلِحْ اِخْوَانِیْ اے اللہ! میرے بھائیوں اور دوستوں کو نیک بنا دے۔'' اس سے پوچھا گیا: ''لِمَ لَا تَدْعُوْا لَکَ فِیْ ھٰذَا الْمُقَامِ، اس مقدس مقام پر پہنچ کر اپنے لیے کیوں نہیں دعا کرتا؟ اپنے بھائیوں اور دوستوں ہی کے لیے کیوں دعا کر رہا ہے؟'' اس نے جواب دیا: ''اِنَّ لِیْ اِخْوَانًا اَرْجِعُ اِلَیْھِمْ فَاِنْ صَلَحُوْا صَلَحْتُ مَعَھُمْ وَاِنْ فَسَدُوْا فَسَدْتُ مَعَھُمْ. میرے جو بھائی ہیں میں انہی کے پاس لوٹ کر جاؤں گا، اگر وہ نیک و صالح ہوئے تو میں بھی ان کی صحبت میں نیک و صالح بن جاؤں گا اور اگر وہ مفسد و بدکار ہوئے تو ان کے ساتھ میں بھی ویسا ہی ہو جاؤں گا۔''

صحبت (معاشرت) کے عام آداب

صحبت کے آداب اور شرائط یہ ہیں کہ ہر ایک کے ساتھ اس کے درجے اور مرتبے کے مطابق پیش آئے۔ بوڑھوں کو باپ کے درجے میں سمجھے اور ان کی عزت کرے۔ ہم عمروں کو اپنے بھائیوں کے درجے میں تصور کرے اور ان کے ساتھ احسان اور مروّت کا سلوک کرے۔ اور چھوٹوں اور بچوں کو اپنے فرزندوں کی حیثیت میں سمجھے اور ان کے ساتھ شفقت اور محبت کا برتاؤ

کرے۔ صحبت ورفاقت صرف خدا کے لیے اختیار کرے۔ چغلی، غیبت[1]، حسد، عداوت، کینہ اور خیانت سے پرہیز کرے اور ہر ایک کی خیر خواہی پیش نظر رکھے اور کسی کسی شخص کو بھی نصیحت کرنے سے دریغ نہ کرے۔

قرآن مجید میں غیبت کو اپنے مردہ بھائی کا گوشت کھانے سے تشبیہ دی گئی ہے اور یہ غیبت، چغلی، حسد، کینہ اور خیانت وہ چیزیں ہیں جو آپس میں پھوٹ ڈال دینے والی ہیں۔

باہمی محبت کو بڑھانے والی چیزیں:

باہم دوستی اور تعلقات کو بہتر اور پاکیزہ بنانے کے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: ثَلٰثٌ لَکَ وُدُّ اَخِیْکَ لِتُسَلِّمَ عَلَیْہِ اِنْ لَقِیْتَہٗ وَتُوَسِّعَ لَہٗ فِی الْمَجْلِسِ وَتَدْعُوْہُ بِاَحَبِّ اَسْمَائِہٖ، یعنی تین چیزیں جن سے بھائی اور دوستوں کے تعلقات بہتر اور پاکیزہ ہوتے ہیں وہ یہ ہیں کہ جب تو اسے سے ملے تو اسے سلام کہے۔ جب وہ مجلس میں آئے تو اس کے لیے جگہ پیدا کرے اور اُسے اس نام سے پکارے جو اسے سب سے زیادہ پسند ہو۔'' نیز حضورؐ نے فرمایا: ''تَصَافَحُوْا یَذْھَبُ الْغِلُّ وَتَھَادَوْا تَحَابُّوْا وَتَذْھَبُ الشَّحْنَاءُ، یعنی ایک دوسرے سے مصافحہ کیا کرو، اس سے کینہ دُور ہوتا ہے، اور ایک دوسرے کو تحائف دیا کرو کہ اس سے محبت پیدا ہوتی ہے اور بغض وعداوت دُور ہوتے ہیں (مؤطا امام مالکؒ، کتاب الاحکام)۔

میں (علی ہجویری بن عثمان جلابی) نے شیخ ابوالقاسم گرگانی رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا کہ صحبت کی شرط کیا ہے؟ تو آپ نے فرمایا کہ آدمی اپنے ساتھی کے حظ اور فائدے کا اہتمام کرے۔ صحبت

---

[1] ایک مرتبہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا: یارسول اللہ ﷺ! غیبت کیا ہے؟ تو آپؐ نے فرمایا کہ غیبت یہ ہے کہ کوئی شخص اپنے بھائی کا اس کی غیر حاضری میں اس طرح ذکر کرے کہ اگر وہ سنے تو اسے ناگوار ہو۔ سائل نے عرض کیا کہ یارسول اللہؐ! اگر وہ بات حق ہو تو تب بھی؟ آپؐ نے فرمایا کہ اگر اس میں وہ بات پائی جاتی ہو تو تو نے اس کی غیبت کی اور اگر اس میں وہ موجود نہ ہو تو نے اس پر بہتان لگایا۔ اس سلسلے کی ایک روایت کے الفاظ یہ ہیں: اَنَّ رَجُلًا سَاَلَ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ مَا الْغِیْبَۃُ؟ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اَنْ تَذْکُرَ مِنَ الْمَرْءِ مَایَکْرَہُ اِنْ یَّسْمَعَ. قَالَ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ وَاِنْ کَانَ حَقًّا؟ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ اِذَ قُلْتَ بَاطِلًا فَذٰلِکَ الْبُھْتَانُ (مؤطا امام مالکؒ، کتاب الاحکام)۔ دوسری روایت کے الفاظ یہ ہیں: ذِکْرُکَ اَخَاکَ بِمَا یَکْرَہُ. قِیْلَ اَفَرَأَیْتَ اِنْ کَانَ فِیْ اَخِیْ مَا اَقُوْلُ؟ قَالَ اِنْ فِیْہِ مَاتَقُوْلُ فَقَدِ اغْتَبْتَہٗ وَاِنْ لَّمْ یَکُنْ فِیْہِ مَاتَقُوْلُ فَقَدْ بَھَتَّہٗ (مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی)

کی تمام آفتیں اس امر میں پوشیدہ ہیں کہ آدمی دوسرے کی صحبت کو اپنے حظ اور فائدہ کے لیے اختیار کرے۔ صحبت سے فائدہ اور ثواب اس وقت حاصل ہو گا جب کہ وہ اپنے رفیق کے حظ اور اس کے فائدے اور آرام کو مقدم رکھے گا۔ چنانچہ ایک درویش کہتا ہے کہ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ میں کوفہ سے مکہ معظمہ جا رہا تھا کہ راستے میں حضرت ابراہیم خواصؒ سے ملاقات ہو گئی۔ میں نے آپ سے صحبت میں رہنے کی اجازت کے لیے درخواست کی۔ آپ نے فرمایا کہ صحبت کے لیے اس بات کی ضرورت ہوتی ہے کہ ایک امیر ہو اور دوسرا فرمانبردار۔ تو امیر بننا چاہتا ہے یا فرمانبردار؟ میں نے عرض کیا کہ آپ امیر بن جائیں میں فرمانبرداری کروں گا۔ حضرت ابراہیم خواصؒ نے فرمایا کہ اچھا تو اب تجھے میرے حکم سے باہر نہیں ہونا چاہیے۔ میں نے عرض کیا کہ انشاء اللہ ایسا نہیں ہو گا۔ اس کے بعد جب ہم پہلی منزل پر ٹھیرے تو آپ نے مجھے حکم دیا کہ بیٹھ جا۔ میں نے تعمیلِ ارشاد کی۔ آپ نے کنوئیں سے ٹھنڈا پانی نکالا، لکڑیاں جمع کیں، چولھے میں آگ جلائی اور مجھے گرم کیا۔ جب میں کوئی کام کرنے کا ارادہ کرتا تو آپ فرماتے بیٹھ اور اپنی شرط کو نگاہ میں رکھ۔ رات کو سخت بارش شروع ہو گئی۔ آپ نے اپنی گودڑی اتار کر مجھ پر ڈال دی اور صبح تک میرے سر پر کھڑے رہے۔ جب گودڑی مجھ پر سے ذرا سرکتی آپ اسے ٹھیک کر کے مجھ پر ڈال دیتے۔ میں سخت شرمندگی محسوس کر رہا تھا، مگر آپ فرماتے کہ اپنی شرط پر نگاہ رکھو۔ چنانچہ میں کچھ نہ کر سکتا تھا۔

جب صبح ہوئی تو میں نے عرض کیا: اے شیخ! آج میں امیر بنوں گا۔ آپ نے فرمایا بہت اچھا۔ چنانچہ جب رات کو منزل پر اترے تو آپ نے پھر اسی طرح سے کام شروع کر دیا جس طرح سے گزشتہ رات کیا تھا۔ میں نے کہا کہ میں امیر ہوں، آپ میرا حکم مانیں اور بیٹھ جائیں۔ آپ نے فرمایا کہ فرمان سے باہر وہ شخص جاتا ہے جو اپنے امیر کو خدمت کی زحمت دے۔ اپنے امیر کی خدمت کرنا میرا فرض ہے۔ چنانچہ مکہ معظمہ پہنچنے تک یہی صورت رہی۔ مکہ معظمہ پہنچ کر میں شرم کے مارے آپ کی صحبت چھوڑ کر بھاگ گیا۔ لیکن منیٰ میں آپ نے مجھے پکڑ لیا اور فرمایا: بیٹا! اسی طرح سے درویشوں کی خدمت کرنا لازم ہے۔ ان کی صحبت اسی طرح سے اختیار کرو جس طرح سے میں نے تمھارے ساتھ صحبت اختیار کی۔

حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: ''صَحِبْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ عَشْرَ سِنِیْنَ خدمتہ فو اللّٰہ ماقال لیْ اُفٍ قطُّ وَمَا قالِ لی بشَیْئٌ فعلتُ لِمَ فَعَلْتَ کذا، ولا بشیْئٌ لم افعلہ لم لا فعلتَ کذا. یعنی میں دس برس خادم کی حیثیت سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں رہا اور آپؐ کی خدمت کی۔ لیکن خدا کی قسم، آپؐ نے کبھی مجھے اُف تک نہیں فرمایا۔ اور جو کام بھی میں کرتا تھا آپؐ کبھی مجھ سے نہ پوچھتے کہ تو نے یہ کیوں کیا ہے اور جو کام میں نہ کرتا آپؐ اس کے متعلق بھی نہ پوچھتے کہ یہ تو نے کیوں نہیں کیا۔''

درویشوں کی قسمیں اور اُن کے فرائض

درویشوں[1] کی دو قسمیں ہیں۔ ایک وہ جو یکسو ہو کر خدا کے کام میں لگ گئے ہیں اور اس کی ملازمت کی وجہ سے ایک جگہ سے بندھ گئے ہیں اور اب وہاں پر مقیم ہیں۔ دوسرے وہ جو مسافر ہیں اور طلب و جستجو میں پھرتے اور جگہ جگہ جاتے ہیں۔ مشائخ نے پہلی قسم کے درویشوں کی خدمت کی فضیلت[2] دی ہے۔ کیونکہ وہ زمین میں چل پھر کر اپنے روزگار کے لیے دوڑ دھوپ نہیں کر سکتے۔ لیکن ان مقیموں کا فرض ہے کہ وہ مسافروں کو اپنے سے بڑھ کر جانیں اور ان کی خدمت کریں۔ اس لیے کہ مقیم اپنے مقام پر بہرحال کچھ تعلقات اور مراسم رکھتے ہیں اور مسافر اجنبی اور بے سہارا ہوتے ہیں۔

اسی طرح سے جو بوڑھے ہوں اُن کو چاہیے کہ جوانوں کو اپنے آپ پر فضیلت دیں کہ اُن کی عمر تھوڑی اور گناہ کم ہیں اور جو جوان ہوں اُن کے لیے لازم ہے کہ وہ بوڑھوں کو اپنے آپ پر فضیلت دیں اور ان کو اپنا بزرگ سمجھیں کہ اُن کا زمانہ عبادت ان سے زیادہ ہے اور وہ خدا کے دین کی خدمت میں ان سے مقدم ہیں۔

اب ہم ان آداب کا ذکر کرتے ہیں جو مختلف صورتوں میں آدمی پر عاید ہوتے ہیں اور جن کو ملحوظ رکھنا اُس کے لیے ضروری ہے:

---

[1] درویش سے مراد دراصل سچے اور صادق العہد مومن ہیں۔

[2] چنانچہ قرآن مجید میں آیا ہے: "وَمَا تُنفِقُوا مِنْ خَيْرٍ يُوَفَّ إِلَيْكُمْ وَأَنتُمْ لَا تُظْلَمُونَ ٥ لِلْفُقَرَاءِ الَّذِينَ أُحْصِرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ لَا يَسْتَطِيعُونَ ضَرْبًا فِي الْأَرْضِ يَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ أَغْنِيَاءَ مِنَ التَّعَفُّفِ ج تَعْرِفُهُم بِسِيمَاهُمْ ج لَا يَسْأَلُونَ النَّاسَ إِلْحَافًا ط وَمَا تُنفِقُوا مِنْ خَيْرٍ فَإِنَّ اللَّهَ بِهِ عَلِيمٌ ٥ (۲:۲۷۲۔۲۷۳) یعنی جو کچھ مال تم خیرات میں خرچ کرو گے اس کا پورا پورا اجر تمھیں دیا جائے گا اور تمھاری ذرہ برابر بھی حق تلفی نہیں ہوگی۔ (تمھاری) مدد کے مستحق خاص طور پر وہ تنگدست لوگ ہیں جو اللہ کے کام میں ایسے گھر گئے ہیں کہ اپنے روزگار کے لیے زمین میں کوئی دوڑ دھوپ نہیں کر سکتے۔ ان کی خودداری کو دیکھ کر ناواقف آدمی گمان کرتا ہے کہ یہ خوشحال ہیں۔ تم ان کے چہروں سے ان کی اندرونی حالت پہچان سکتے ہو مگر وہ ایسے لوگ نہیں ہیں کہ لوگوں کے پیچھے پڑ کر کچھ مانگیں۔ اُن کی اعانت میں جو کچھ مال تم خرچ کرو گے وہ اللہ سے پوشیدہ نہ رہے گا۔" (مرتب)

آداب اقامت یعنی مقیم لوگوں کے آداب

جب کوئی درویش (سچا مومن) کسی جگہ پر مقیم ہو تو اسے حسب ذیل آداب کی پابندی کرنی چاہیے۔

اس کے پاس کوئی مسافر آئے تو بڑی خوشی اور تعظیم کے ساتھ اس کا استقبال کرے۔ جیسا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے مہمانوں کے ساتھ کرتے تھے۔ قرآن مجید میں آیا ہے کہ جونہی ان کے پاس مہمان آئے فَرَاغَ اِلٰی اَھْلِہٖ فَجَآءَ بِعِجْلٍ سَمِیْنٍ (۲۶:۵۱) یعنی ابراہیم علیہ السلام اندر گئے اور فوراً ان کے لیے ایک موٹا تازہ بھنا ہوا بچھڑا لے آئے۔[1] درویش کو چاہیے کہ مہمان سے یہ نہ پوچھے کہ آپ کون ہیں، کہاں سے آئے ہیں اور کہاں جائیں گے۔ یہ باتیں پوچھنا ادب کے خلاف ہے۔ ان کا آنا اور جانا سب خداوند تعالیٰ کی طرف سے سمجھے۔ اور اس کا نام عبدالحق یا عبداللہ خیال کرے۔ پھر اس بات کا خیال کرے کہ مہمان خلوت کو پسند کرتا ہے یا صحبت میں خوش ہے۔ اگر اسے خلوت پسند ہو تو الگ جگہ کا اس کے لیے انتظام کرے اور صحبت میں خوش ہو تو اس کے ساتھ رہے۔ تا کہ آپس میں محبت اور اس کی خوشی میں اضافہ ہو۔ جب رات کو وہ سوئے تو اس کے پاؤں دبائے۔ لیکن اگر وہ اس کو پسند نہ کرے اور کہے کہ مجھے اس کی عادت نہیں تو اصرار نہ کرے کہ اسے ناگوار نہ ہو۔ مہمان جیسے خوش ہو ویسے ہی کرے۔

صبح اس کے غسل کا اچھا انتظام کرے۔ اگر مقیم میں استطاعت ہو تو اسے کپڑوں کا نیا جوڑا پہنائے۔ ورنہ کم از کم اسی کے کپڑوں کو دھو کر اتنا صاف کر دے کہ وہ نماز پڑھنے کے لائق ہو جائیں۔ مہمان کی خدمت خود کرے، کسی اجنبی کو اس کی خدمت کے لیے مقرر نہ کرے اور یہ اعتقاد

---

[1] حدیث میں آیا ہے کہ اَنَّ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ قَالَ مَنْ کَانَ یُؤْمِنُ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ فَلْیُکْرِمْ ضَیْفَہٗ جَائِزَتُہٗ یَوْمًا وَّ لَیْلَۃً وَضِیَافَتُہٗ ثَلٰثَۃُ اَیَّامٍ فَمَا کَانَ بَعْدَ ذٰلِکَ فَھُوَ صَدَقَۃٌ وَّلَا یَحِلُّ لَہٗ اَنْ یَّثْوِیَ عِنْدَہٗ حَتّٰی یُحْرِجَہٗ (مؤطا امام مالک، کتاب الاحکام متعلق بالطعام)۔ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہے اس کا فرض ہے کہ اپنے مہمان کی عزت و تکریم کرے۔ ایک دن رات تو حسب استطاعت تکلف کرے اور تین دن تک اس کی (بغیر تکلف کے) مہمانداری کرے۔ اس کے بعد جو خدمت وہ کرے گا وہ اس کی طرف سے صدقہ شمار ہوگی۔ اور مہمان کے لیے جائز نہیں ہے کہ ڈیرہ ڈال کر بیٹھ جائے یہاں تک کہ میزبان مشقت میں پڑ جائے۔ (مرتب)

رکھے کہ مہمان کو پاک صاف اور آسودہ کرنے سے میں خود تمام آفتوں سے پاک وصاف اور آسودہ ہو جاؤں گا۔

اگر اپنے شہر میں کوئی بزرگ یا عالم دین یا نیک جماعت ہو تو اس کی زیارت کے لیے مہمان سے کہے۔ اگر وہ منظور کرے تو بہتر ورنہ اصرار نہ کرے۔ لیکن یہ ہرگز جائز نہیں ہے کہ مہمان کو رؤسا اور دوسرے اہلِ دنیا کے سلام یا ان کی مہمانی، بیمار پرسی یا ماتم میں لے جائے۔ جو شخص اپنے مہمان کو گداگری کا ذریعہ بنانا چاہتا ہو کہ اسے گھر گھر لیے پھرے تو ایسی خدمت سے خدمت نہ کرنا بہتر ہے۔ کیونکہ ایسا کرنے سے مہمان کی ذلت ہوتی ہے۔ میں (علی ہجویری بن عثمان جلابی) نے اپنے سفروں میں اس قسم کی مشقتیں اور رنج بہت دیکھے ہیں۔ بعض اوقات نا اہل خادم اور ناپاک مقیم مجھے اٹھاتے اور اس خواجہ کے مکان سے اُس دہقان کے ہاں لے جاتے اور وہاں سے کسی اور کے ہاں۔ میں بے حد کوفت محسوس کرتا اور کراہت سے چلتا۔ ظاہر میں چشم پوشی کرتا مگر دل میں یہ خیال کرتا کہ مقیم (یعنی میزبان) جو زیادتی مجھ پر کر رہے ہیں اگر کسی وقت میں مقیم ہوا تو مسافروں کے ساتھ ایسا کبھی نہیں کروں گا۔ جاہل اور برے لوگوں کی صحبت سے آدمی اسی طرح سے فائدہ حاصل کرسکتا ہے کہ ان کی جو باتیں اور کام اچھے نہ ہوں ان سے وہ خود اجتناب کرے۔

اگر مہمان کوئی دنیاوی ضرورت طلب کرے اور وہ مقیم کے بس میں ہو تو حتی الامکان اسے پوری کرنے کی کوشش کرے۔ لیکن اگر ایسا کرنا محال ہو تو وہ اسے پوری کرنے کا پابند نہیں ہے۔ اور نہ ایسی ضرورتیں طلب کرنا ان لوگوں کا شیوہ ہوسکتا ہے جنھوں نے درویشی کی زندگی خدا کے لیے اختیار کی ہو۔ ایسی چیزوں کے طالب لوگوں کو درویشوں کے ہاں نہیں بلکہ بازاروں میں یا بادشاہوں کے حضور میں جانا چاہیے۔ بہر حال آدمی اپنی توفیق اور استطاعت سے بڑھ کر کسی کی مدد کرنے کے لیے مکلف نہیں ہے۔ چنانچہ ایک دفعہ کا واقعہ ہے کہ میں عراق میں مقیم تھا اور دنیا کی طلب اور اس کے خرچ میں بہت دلیر ہو گیا تھا۔ جس شخص کو کوئی ضرورت پیش آتی میری طرف رجوع کرتا اور میں اسے پورا کرنے کی کوشش کرتا۔ آخر مجھ پر قرض بہت زیادہ ہو گیا اور اس صورتِ حال نے مجھے سخت پریشان اور عاجز کر دیا۔ آخر میری پریشانی کو دیکھ کر وقت کے بزرگوں میں سے

ایک بزرگ نے مجھے لکھا: بیٹا! دیکھو، دوسروں کی فکر میں اپنے آپ کو اس طرح گرفتارِ بلا نہ کرو کہ خدا سے دُور ہو جاؤ۔ خدا کے بندوں کے لیے خدا ہی کافی ہو سکتا ہے، کوئی بندہ ان کے لیے کافی نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ ان کی اس نصیحت سے مجھے اس حال سے خلاصی ہوئی۔

سفر کے آداب

درویش (سچے مومن) کے لیے آدابِ سفر میں سب سے پہلی چیز یہ ہے کہ اس کا سفر خدا کے لیے ہو نہ کہ کسی خواہشِ نفس کی پیروی اور اس کے حصول کے لیے۔ مثلاً حج یا عمرے کے لیے، کسی غزوہ کے سلسلے میں، طلبِ علم یا کسی بزرگ کی زیارت اور اس سے حصولِ فیض کے لیے یا کسی مقدس مقام کی زیارت کے لیے وغیرہ[1]۔ دوسری چیز یہ ہے کہ ضروری سامانِ سفر لے کر نکلے۔ مثلاً گودڑی (یعنی بستر اور ضروری کپڑے)، سجّادہ (یعنی جاءِ نماز)، لوٹا، رسی (بستر بند) اور جوتا یا نعلین (چپل وغیرہ) اور عصا (چھڑی)۔ تاکہ گودڑی سے ستر ڈھانکے اور اوڑھے، سجادہ پر نماز پڑھے، لوٹے سے طہارت کرے، عصا کی مدد سے آفتوں کو اپنے سے دُور کرے اور اس میں اور بھی منافع ہیں اور جوتے سے طہارت اور وضو کے بعد مصلّٰی تک پہنچے۔ ان چیزوں کے علاوہ سنت کی حفاظت و پیروی کے لیے یہ چیزیں بھی چاہے تو ساتھ لے لے: کنگھی، ناخن گیر، سوئی دھاگہ اور سُرمہ دانی اور تیل۔ اگر اللہ تعالیٰ نے اسے نعمت سے نوازا ہو تو اس سے بھی زیادہ سامان اپنے ساتھ لے سکتا ہے۔ کیوں کہ جہاں دنیاداروں کے لیے سامانِ دنیا کی فراوانی خدا سے دُوری کے سبب اور اُس کے تقرب کی راہ کے حجاب کی شکل اختیار کر لیتی ہے، اصحابِ تمکین و استقامت اور خدا کے دوستوں کے لیے یہ ازدیادِ شکر و سپاس کا باعث بنتی ہے۔ چنانچہ شیخ ابوالمسلم فارس بن غالب فارسیؒ بیان کرتے ہیں کہ ایک روز میں شیخ ابوسعید ابوالخیر فضل اللہ بن محمد رضی اللہ عنہ کی زیارت کے لیے ان کی خدمت میں حاضر ہوا تو میں نے آپ کو ایک تخت پر اس حالت میں دیکھا کہ آپ تکیہ سے

---

[1] حدیث میں آیا ہے کہ تین مقامات ایسے ہیں جن کی زیارت کا قصد کر کے ان کی طرف سفر کرنا ثواب ہے۔ ایک مکہ معظمہ میں بیت اللہ، دوسرے مدینہ منورہ میں مسجد نبوی اور تیسرے بیت المقدس۔ (مرتب)

ٹیک لگائے ہوتے تھے اور آپ نے ایک پاؤں کو دوسرے پاؤں پر رکھا ہوا تھا، اوپر ایک مصری چادر اوڑھے ہوئے تھے۔ اور میرے کپڑے میل کچیل سے چمڑے کی مانند ہو رہے تھے، اور میرا جسم تکلیف اور مجاہدہ سے زرد اور مضمحل ہو رہا تھا۔ میں نے ان کا اور اپنا یہ حال دیکھا تو میرے دل میں ان کی بزرگی کا انکار پیدا ہوا۔ اور میں نے اپنے دل میں کہا کہ یہ بھی درویش ہیں اور میں بھی درویش ہوں۔ یہ اس قدر آرام اور آسائش میں ہیں اور میں اس قدر مجاہدے کی زندگی گزار رہا ہوں۔ شیخ نے میرے اس باطن سے اطلاع پائی اور فرمایا: اے ابو مسلم! تو نے کس دیوان میں یہ پایا ہے کہ خود بیں بھی درویش ہوسکتا ہے۔ تو نے صرف اپنے آپ کو دیکھا تو نیچے بیٹھنے کے سوا تیرے حصے میں کچھ نہ آیا اور میں نے اپنے بجائے صرف حق پر نگاہ رکھی اور اس نے مجھے تخت پر بٹھایا۔ حق تعالیٰ اس سے منزہ ہے کہ آدمی بہ تکلف اس کے لیے اپنے آپ کو تکالیف میں مبتلا کرے۔ درویش کو چاہیے کہ اگر اللہ تعالیٰ اسے نعمت سے نوازے تو شکر گزاری کی روش اختیار کرے اور اگر وہ اسے نعمت سے محروم کر کے ابتلاء کو اس کے لیے پسند فرمائے تو صبر کی راہ اختیار کرے۔

شیخ ابو مسلم فرماتے ہیں کہ یہ سن کر میرے ہوش اُڑ گئے اور میرے اِرد گرد اندھیرا چھا گیا۔ جب مجھے ہوش آیا تو میں نے توبہ کی اور میری توبہ قبول ہوئی۔

مسافر کے لیے سنت کی حفاظت لازم ہے اور ہمیشہ لازم ہے۔ جب مقیم کے پاس پہنچے تو بڑی عزت اور احترام کے ساتھ اس کے پاس آئے۔ اور اس کو سلام کہے۔ پہلے بایاں پاؤں جوتے سے نکالے، کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایسا ہی کرتے تھے۔ اور جب جوتا پہنے تو پہلے دائیں پاؤں میں پہنے اور پھر بائیں میں۔ اسی طرح جب پاؤں دھوئے تو پہلے دایاں پاؤں دھوئے اور اس کے بعد بایاں دھوئے۔ منزل پر پہنچ کر درویشوں کی صحبت میں مشغول ہونے سے پہلے دو رکعت نفل سنت کے مطابق پڑھے۔ مقیموں پر اپنی ناگزیر ضروریات کے سوا کسی چیز کا بوجھ نہ ڈالے، نہ ان پر اعتراض کرے، نہ کسی کے ساتھ کوئی زیادتی کرے اور نہ اپنے سفر کی تکالیف اور ذاتی حکایات بیان کر کر کے میزبانوں کو پریشان کرے۔ اگر وہ اسے کسی کی زیارت یا ملاقات کے لیے کہیں تو حتی الامکان ان کی خواہش کا احترام کرے، اور ان کی جو بات ناگوارِ خاطر ہو تو اس کی

کوئی تاویل کر لے اور ان کو معذور خیال کرے۔ اور ڈیرہ ہی ڈال کر نہ بیٹھ جائے کہ اپنے میزبان کے لیے مصیبت بن جائے۔

مختصر یہ کہ درویش مقیم ہو یا مسافر ہمیشہ خداوند تعالیٰ کی رضا کی طلب و جستجو میں لگا رہے اور ہر حالت میں سنت کی حفاظت اور پیروی کا اہتمام کرے۔

ظاہر کے ساتھ باطن کا سفر یہ ہے کہ معصیت اور نافرمانی سے صواب اور حق تعالیٰ کی فرمانبرداری کی طرف کوچ کرے۔

کھانے کے آداب

کھانا آدمی کی ایک ناگزیر بنیادی ضرورت ہے۔ کیونکہ کھانے پینے کے بغیر وہ زندہ نہیں رہ سکتا۔ کھانے کے آداب میں سے پہلی چیز یہ ہے کہ کھانے میں مبالغہ نہ کرے۔ یعنی نہ زیادہ کھائے اور نہ اپنی بساط سے بڑھ کر پُر تکلف کھائے۔ یہ صورت بھی نہیں ہونی چاہیے کہ آدمی رات دن روٹی ہی کی فکر میں مشغول اور سرگرداں رہے۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''مَنْ کَانَ هِمَّتُهُ مَایَدْخُلُ فِیْ جَوْفِهٖ کَانَ قِیْمَتُهُ مَایَخْرُجُ مِنْهُ یعنی جس شخص کی ساری دوڑ دھوپ اُس چیز کے لیے ہو جو وہ اپنے پیٹ میں ڈالتا ہے تو اس کی اپنی قدر و قیمت اس کے برابر ہوگی جو اس کے پیٹ سے برآمد ہوتا ہے۔''

خصوصاً ان لوگوں کے لیے جو خدا کی راہ کے مسافر اور اس کے ارادتمند ہوں، زیادہ کھانے سے بڑھ کر کوئی چیز نقصان دِہ نہیں ہے۔ حضرت ابویزید رحمۃ اللہ علیہ سے مریدوں نے پوچھا کہ آپ بھوک کی تعریف میں اس قدر رطب اللسان کیوں رہتے ہیں؟ آپ نے فرمایا کہ اگر فرعون نے بھوک دیکھی ہوتی تو وہ کبھی اَنَا رَبُّکُمُ الْاَعْلٰی نہ کہتا، اور اگر قارون بھوکا رہتا تو کبھی خدا سے باغی نہ ہوتا۔ دیکھو ثعلبہ[1] جب تک بھوکا رہا سب کے نزدیک قابلِ تعریف اور اصحابِ رسولؐ اللہ

---

[1] ثعلبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا صحابی اور سب کے نزدیک قابل تعریف تھا۔ لیکن تنگ حالی سے پریشان ہو کر حضورؐ کی خدمت میں حاضر ہوا اور درخواست کی یا رسول اللہ! میرے لیے خوش حالی اور برکت کی دعا فرمایئے۔ حضورؐ نے سمجھایا کہ خداوند تعالیٰ کے فیصلہ پر راضی رہو، ایسا نہ ہو کہ دنیا کا مال اور خوش حالی تمھارے لیے ابتلاء بن جائے۔ لیکن اس نے اصرار کیا۔ چنانچہ آپؐ نے اس کے لیے دعا فرمائی اور اس کا مال بڑھنا شروع ہوا۔ تھوڑی ہی مدت میں اس کے پاس اتنے مویشی ہو گئے کہ مدینہ میں ان کی سمائی مشکل (بقیہ حواشی اگلے صفحہ پر ملاحظہ فرمائیں)۔

صلی اللہ علیہ وسلم میں رہا۔ جب پیٹ بھر کر کھانے لگا تو منافق بن گیا۔ کفار کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''ذَرْهُمْ يَأْكُلُوْا وَيَتَمَتَّعُوا وَيُلْهِهِمُ الْاَمَلُ فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ (۱۵:۳) یعنی انھیں اپنے حال پر چھوڑ دو، خوب کھا پی لیں، مزے اُڑا لیں اور اپنی امیدوں میں منہمک رہیں، جلدی ہی ان کو اس کا انجام معلوم ہو جائے گا۔'' نیز فرمایا: ''وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَتَمَتَّعُوْنَ وَيَاْكُلُوْنَ كَمَا تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ وَالنَّارُ مَثْوًى لَّهُمْ (۱۲:۴۷) یعنی جن لوگوں نے کفر کا رویہ اختیار کیا ہے وہ انجام سے بے پروا ہو کر دنیا میں خوب مزے لوٹ رہے ہیں اور جانوروں کی طرح خوب ٹھُس ٹھُس کر کھا رہے ہیں، حالانکہ آگ ان کا ٹھکانا ہوگا۔''

حضرت سہل بن عبداللہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں شراب سے پیٹ بھر لینے کو اس سے بہتر سمجھتا ہوں کہ اس کو حلال کھانے سے بھرا جائے۔ لوگوں نے پوچھا کہ یہ آپ کیا فرما رہے ہیں؟ آپ نے جواب دیا کہ جب آدمی شراب سے شکم بھر لے گا تو اس کی عقل رخصت ہو جائے گی اور مخلوقِ خدا اس کی زبان اور ہاتھ سے مامون اور بے خوف ہوگی۔ لیکن جب وہ پیٹ بھر لے گا خواہ یہ حلال کھانے سے ہی کیوں نہ ہو تو اس کا نفس ابھرے گا، شہوت مضبوط ہوگی اور بیہودہ خواہشات اس پر مسلّط ہوں گی اور مخلوقِ خدا کے لیے وہ مصیبت بنے گا۔ اسی لیے مشائخ رحمہم اللہ نے درویشوں کی صفت میں فرمایا ہے کہ: ''اَكْلُهُمْ كَاَكْلِ الْمَرْضٰى وَنَوْمُهُمْ كَنَوْمِ الْغَرْقٰى وَكَلَامُهُمْ كَكَلَامِ الثَّكْلٰى، یعنی ان کا کھانا مریضوں کی طرح ہوتا ہے، سونا نہایت گہری نیند سونے والوں کی طرح (یعنی نیند میں بالکل غرق اور اس کا سخت غلبہ ہو جانے کی صورت کے سوا وہ سوتے نہیں) اور کلام کے لحاظ سے وہ اس عورت کی مانند گم سم ہو جاتے ہیں جس کا بچہ گم ہو گیا ہو۔''

کھانے کے آداب میں سے دوسری چیز یہ ہے کہ حتی الامکان تنہا نہ کھائے بلکہ دوسرے

(بقیہ حواشی گزشتہ صفحہ): ہو گئی اور اسے شہر سے باہر اپنا ڈیرہ منتقل کر لیا اور حضورؐ کے پیچھے پابندی کے ساتھ نماز کی سعادت سے محروم ہو گیا۔ مال اور بڑھا تو اسے اپنا ڈیرہ مدینہ سے اور فاصلہ پر لے جانا پڑا اور اب وہ صرف جمعہ کے روز مدینہ آتا۔ پھر مال اور زیادہ ہو گیا تو وہ دُور جنگل میں منتقل ہو گیا اور اب جمعہ سے بھی محروم ہو گیا۔ اور پھر دنیا کے مال کی محبت اور زکوٰۃ کے مال کی جو کثیر مقدار اس کے ذمہ نکلتی اس کی کثرت نے مل جل کر یہ صورت پیدا کر دی کہ زکوٰۃ ادا کرتے ہوئے اس کا دل پھٹنے لگا اور آخر اس نے زکوٰۃ ادا کرنے سے انکار کر دیا۔ پھر کچھ مدت بعد اس پر آفات نازل ہونی شروع ہوئیں۔ اس پر وہ زکوٰۃ لے کر حضرت ابوبکرؓ کی خدمت میں حاضر ہوا لیکن آپؓ نے اس کی زکوٰۃ قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ یہ اس کے خارج از اسلام ہونے کا اعلان تھا۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ.

بھائیوں کو اس میں شریک کرے۔ کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے: "شَرُّ النَّاسِ مَنْ اَکَلَ وَحْدَهٗ وَضَرَبَ عَبْدَهٗ وَمَنَعَ رِفْدَهٗ یعنی لوگوں میں سب سے برا ہے وہ شخص جو اکیلا کھائے اور اپنے غلام کو مارے اور اپنی جماعت کی راہ میں رکاوٹیں ڈالے[1]۔"

تیسرا ادب یہ ہے کہ کھانے سے پہلے اللہ کا نام لے یعنی بسم اللہ شریف پڑھے۔ دستر خوان پر کسی چیز کو اس طرح اِدھر اُدھر نہ کرے کہ ساتھیوں کو ناگوار ہو۔ کھانے میں ان کے ساتھ انصاف ہی کا نہیں احسان کا برتاؤ کرے۔ انھیں اپنے اوپر ترجیح دے۔ لقمہ بڑا نہ لے اور خوب چبا کر کھائے۔ جلدی نہ کرے۔ کیونکہ یہ چیزیں سنت کے بھی خلاف ہیں اور ان سے بدہضمی بھی ہوتی ہے۔ کھانے سے فارغ ہو کر خدا کی حمد کرے یعنی "اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ اَطْعَمَنِیْ وَسَقَانِیْ وَجَعَلَنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ پڑھے (سنن اربعہ)۔ یعنی سب تعریف اس خدا کے لیے ہے جس نے مجھے کھلایا اور پلایا اور مسلمان بنایا۔" اس کے بعد ہاتھ دھوئے اور منہ صاف کرے۔

درویش کو چاہیے کہ درویش کی دعوت کو رَد نہ کرے اور حتی الامکان دنیا داروں کی دعوت قبول نہ کرے، نہ ان کے گھر جائے اور نہ ان سے کچھ مانگے۔ کیونکہ ایسا کرنے سے اہلِ دین وطریقت کی توہین ہوتی ہے اور یہ لوگ درویشوں کو عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھتے۔ لیکن یہ بات نگاہ میں رہنی چاہیے کہ محض صاحبِ نعمت اور صاحبِ مال ہونا دنیا دار ہونے کی علامت نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک شخص صاحبِ نعمت ہونے کے باوجود "درویش" ہو اور دوسرا شخص تنگ حال اور افلاس میں مبتلا ہونے کے باوجود "دنیا دار" ہو۔ درویشی اور دنیا داری کا تعلق دل سے ہے نہ کہ مال و دولت سے۔

ایک اور چیز جو کھانے کے آداب میں سے ہے وہ یہ ہے کہ کھانے کے بارے میں تکلف میں نہ پڑے کہ یہ کھاؤں گا اور وہ نہیں کھاؤں گا۔ کھانے کے وقت جو کچھ سامنے آئے اسے کھا لے۔ محض پیٹ بھرنے کے لیے لوگوں کو مشقت میں نہ ڈالے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی کسی کھانے میں نقص نہیں نکالا۔ جو سامنے آتا، اگر

[1] ابوداؤد اور ابن ماجہ میں وحشیؓ بن حرب سے روایت ہے کہ صحابہ کرامؓ نے عرض کیا: "یا رسول اللہ! ہم کھاتے ہیں اور سیر نہیں ہوتے۔" آپؐ نے فرمایا: "شاید تم الگ الگ کھاتے ہو۔" صحابہؓ نے عرض کیا: "ہاں یا رسول اللہ!" آپؐ نے فرمایا: "سب مل کر اور بسم اللہ پڑھ کر کھایا کرو اللہ تعالیٰ تمھارے کھانے میں برکت دے گا۔"

خواہش ہوتی تو کھا لیتے، ورنہ ہاتھ نہ بڑھاتے۔ (متفق علیہ)۔

رفتار (چلنے) کے آداب

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِیْنَ یَمْشُوْنَ عَلَی الْاَرْضِ ھَوْنًا (۲۵:۶۳) یعنی خدا کے بندے زمین میں عاجزی کے ساتھ چلتے ہیں۔'' چلنے میں آدمی کو ہمیشہ اس پر نگاہ رکھنی چاہیے کہ اس کا جو قدم اٹھ رہا ہے وہ خدا کے حکم کی طرف اور اس کے مطابق ہے یا اس کے خلاف اور اس سے ہٹ کر۔ اگر خدانخواستہ دوسری صورت ہو تو اسے فوراً استغفار کرنا چاہیے اور اپنے قدم کو روکنا چاہیے۔ درویش کا ہر قدم خدا کی طرف اور اس کے حکم کے مطابق اٹھنا چاہیے۔ حکایتوں میں آیا ہے کہ ایک روز حضرت داؤد طائی رحمۃ اللہ علیہ نے دوائی پی ہوئی تھی۔ مریدوں نے عرض کیا کہ آپ تھوڑی دیر صحن میں ٹہلیں تاکہ دوائی سے پورا فائدہ حاصل ہو۔ آپ نے فرمایا کہ مجھے شرم آتی ہے کہ کہیں قیامت کے روز یہ قدم میرے خلاف خدا کے روبرو شہادت نہ دیں کہ یہ خدا کے سوا کسی اور کے لیے بھی اٹھائے گئے تھے۔ کیونکہ جبار جلیل نے ارشاد فرمایا ہے کہ: ''وَتَشْھَدُ اَرْجُلُھُمْ بِمَا کَانُوْا یَکْسِبُوْنَ (۳۶:۶۵) یعنی ان کے پاؤں گواہی دیں گے کہ یہ دنیا میں کیا کمائی کرتے رہے ہیں۔''

درویش کو چاہیے کہ چلتے وقت مراقبہ میں (یعنی خداوند تعالیٰ کی طرف رجوع) رہے اور بلا ضرورت اِدھر اُدھر نہ دیکھے۔ اور اگر جماعت کے ساتھ چل رہا ہو تو آگے چلنے کا قصد نہ کرے کہ یہ تکبر کی علامت ہے۔ نیز پیچھے رہنے اور بہ تکلف عاجزی پیدا کرنے کا بھی ارادہ نہ کرے کہ یہ بھی تکبر ہی کی ایک دوسری قسم ہے۔ عام انسانوں کی طرح چلے۔ اپنے جوتے کو گندگی اور پلیدی سے آلودہ ہونے سے بچائے تاکہ اس کا پروردگار اسے رات میں پلید ہونے سے محفوظ رکھے۔ نیز اگر کوئی شخص یا اشخاص ساتھ چل رہے ہوں تو راستہ میں کھڑا ہو کر کسی سے باتیں نہ کرنے لگ جائے اور دوسروں سے اپنا انتظار نہ کرائے۔ نہ بہت تیز چلے کہ بہت تیز چلنا حریصوں کی چال ہے اور نہ بہت آہستہ چلے کہ یہ متکبروں کی چال ہے۔ میانہ چال چلے۔

سونے (نیند) کے آداب

سونے کے بارے میں مشائخ کا اختلاف:

سونے کے بارے میں مشائخ رحمہم اللہ تعالیٰ کے درمیان بہت زیادہ اختلاف ہے۔ ایک گروہ کا کہنا تو یہ ہے کہ مرید کو سونا ہی نہیں چاہیے، الّا یہ کہ نیند کے غلبہ سے بالکل مجبور ہو جائے۔ چنانچہ شبلی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''اِطَّلَعَنِیَ الْحَقُّ فَقَالَ عَلَیَّ مَنْ نَامَ غَفَلَ وَمَنْ غَفَلَ حُجِبَ. یعنی حق تعالیٰ نے مجھے اطلاع دی اور فرمایا کہ جو سویا غافل ہوا اور جو غافل ہوا وہ محجوب ہوا۔'' علی بن سہل ؒ لکھتے ہیں کہ خواب (سونے) سے غفلت لاحق ہوتی ہے۔ اس لیے مُحِب کو چاہیے کہ رات ہو یا دن آرام نہ کرے، کیونکہ اگر اسے غنودگی لاحق ہوئی تو اسی وقت وہ اپنے مقصود سے مفقود (غائب) ہو جائے گا۔ نیز روایتوں میں ہے کہ حق تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کی طرف وحی بھیجی کہ: ''یَادَاوٗدُ کَذَبَ مَنِ ادَّعٰی مُحَبَّتِیْ فَاِذَا جَنَّةُ اللَّیْلُ نَامَ عَنِّیْ. یعنی اے داؤدؑ! جو شخص میری محبت کا دعویٰ کرتا ہے اور پھر جب رات ہوتی ہے تو پڑ کے سو رہتا ہے وہ اپنے دعویٰ محبت میں جھوٹا ہے۔''[1]

اس کے برعکس دوسرا گروہ سونے کو بیداری پر فضیلت دیتا ہے، اور اسے آدمی کے لیے عطیہ خداوندی کہتا ہے۔ چنانچہ حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بیدار خدا کی راہ میں ہمارا معاملہ ہے اور ہمارے اوپر نیند کا طاری ہونا خدا کا فعل ہے، اور جو کام خدا کے حکم کے تحت ہم سے لے اختیار سرزد ہو وہ اس سے کہیں زیادہ مکمل ہوتا ہے جو ہم اپنے اختیار سے کریں۔ وہ کہتے ہیں: ''وَالنَّوْمُ مَوْهِبَةٌ مِّنَ اللّٰهِ تَعَالٰی عَلَی الْمُحِبِّیْنَ یعنی نیند اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے دوستوں کے لیے عطیہ ہے۔'' حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے: ''لَاشَیْئَ اَشَدُّ عَلٰی

---

[1] اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا: ''یٰاَیُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۝ قُمِ الَّیْلَ اِلَّا قَلِیْلًا ۝ یعنی اے کپڑے میں لپٹے ہوئے شخص! رات کے تھوڑے حصے کے سوا رات بھر کھڑے رہا کرو۔'' پھر فرمایا: ''یٰاَیُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝ قُمْ فَاَنْذِرْ ۝ یعنی اے اوڑھے لپیٹے پڑے شخص اٹھ اور لوگوں کو غفلت کے انجام سے ڈرا۔''

اِبلِیس مِن نَومِ العَاصِي، یَقُولُ مَتٰی یَنتَبِهُ وَیَقُومُ حَتّٰی یَعصِيَ اللّٰہَ ۔یعنی ابلیس کے لیے کسی گنہگار آدمی کے سو جانے سے زیادہ ناگوار کوئی چیز نہیں، وہ کہتا ہے کہ یہ کب بیدار ہو گا (اور خدا کی نافرمانی کرے گا) چنانچہ وہ کھڑا رہتا ہے یہاں تک کہ وہ بیدار ہو کر پھر خدا کی نافرمانی میں مصروف ہو جاتا ہے۔'' نیز رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''رُفِعَ القَلَمُ عَن ثَلاثٍ، عَنِ النَّائِمِ حَتّٰی یَنتَبِهَ وَعَنِ الصَّبِيِّ حَتّٰی یَحتَلِمَ وَعَنِ المَجنُونِ حَتّٰی یُفِیقَ. یعنی تین طرح کے لوگ ہیں جن سے قلم اٹھالی گئی ہے (یعنی ان کے اعمال قلم بند نہیں کیے جاتے) ایک وہ شخص جو سو رہا ہو جب تک کہ وہ بیدار نہ ہو، دوسرے بچے سے جب تک کہ وہ احتلام (بلوغت) کی عمر کو نہ پہنچ جائے اور تیسرے مجنون جب تک کہ اس کے حواس ٹھکانے نہ ہو جائیں۔''

قولِ فیصل:

حق یہ ہے کہ اپنے فرائض، واجبات اور ذمہ داریوں سے غافل ہو کر پڑے سوئے رہنا بھی غلط ہے اور زبردستی نیند کو روک روک کر اپنے آپ کو عذاب دینا بھی غلط ہے۔ جیسا کہ حضرت شبلی رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں روایت ہے کہ آپ رات کو ایک کٹورہ نمکین پانی کا اور سلائی پاس رکھ لیتے تھے اور جب نیند کا غلبہ ہوتا تو نمکین پانی لگا کر سلائی آنکھوں میں پھیر لیتے۔ شریعت الٰہی میں سب سے پسندیدہ راہ اعتدال کی راہ ہے۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث میں ہے کہ حضورؐ نے ابوذر غفاریؓ اور سلمانؓ کے درمیان برادری قائم کی۔ یہ دونوں اہلِ صُفّہ کے سپاہی اور باطن کے رئیسوں میں سے تھے۔ ایک دن سلمانؓ ابوذرؓ کے گھر آئے۔ ابوذرؓ کی اہلیہ نے سلمانؓ کے روبرو ابوذرؓ کی شکایت کی کہ تیرا یہ بھائی دن بھر روزے سے رہتا ہے اور رات کو سوتا نہیں۔ سلمانؓ نے کہا کہ کھانے کی کوئی چیز لاؤ۔ جب کھانا لایا گیا تو آپ نے ابوذرؓ سے کہا: اے میرے بھائی تجھے میری موافقت کرنی چاہیے کیونکہ یہ تیرا روزہ فرض نہیں ہے۔ چنانچہ ابوذرؓ نے ان کے ساتھ کھانا کھایا۔ جب رات ہوئی تو سلمانؓ نے کہا کہ بھائی اب سونے میں بھی آپ کو میری موافقت کرنی چاہیے کیونکہ ''اِنَّ لِجَسَدِکَ عَلَیکَ حَقًّا وَاِنَّ لِزَوجِکَ عَلَیکَ حَقًّا، یعنی تیرے وجود کا بھی تجھ پر حق

ہے اور تیری بیوی کا بھی تجھ پر حق ہے۔" دوسرے روز ابوذرؓ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپؐ نے فرمایا کہ میں بھی وہی کہتا ہوں جو کچھ کل سلمان نے تجھ سے کہا تھا۔

سونے کے آداب:

سونے کے آداب یہ ہیں کہ ہر مرتبہ جب سوئے اس نیند کو آخری نیند سمجھے۔ اس لیے اپنے گناہوں سے توبہ کرے۔ جو اس سے ناراض ہوں ان کو راضی کرے۔ پاکیزگی کی حالت میں سوئے۔ اپنے داہنے ہاتھ پر روبقبلہ ہو کر سوئے اور یہ عہد کر کے سوئے کہ اگر اس نیند سے بیدار ہوا تو خدا کی نافرمانی نہیں کروں گا، بلکہ اس کا خیال بھی دل میں لانے سے پرہیز کروں گا۔[1]

چپ رہنے اور کلام کرنے کے آداب

سکوت اور کلام کے بارے میں مشائخ کا اختلاف:

حضرات مشائخ رحمہم اللہ کے درمیان سکوت (چپ رہنے) اور کلام کے بارے میں بھی بہت اختلاف ہے۔ ایک گروہ "سکوت" کو "کلام" پر فضیلت دیتا ہے۔ اور دوسرا گروہ "کلام" کو "سکوت" سے افضل کہتا ہے۔

جو گروہ کلام (بولنے) کو سکوت (خاموشی) سے افضل کہتا ہے اس کا موقف یہ ہے کہ اپنے احوال کو زبان سے بیان کرنا خدا کا حکم ہے۔ کیونکہ اس سے دعویٰ بامعنی قائم ہوگا۔ اگر کوئی شخص

---

[1] حضرت حذیفہؓ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب سونے لگتے تو یہ دعا پڑھتے: "بِاسْمِکَ اللّٰھُمَّ اَمُوْتُ وَاَحْیٰی، یعنی خدایا! میں تیرے ہی نام سے مرتا (سوتا) اور زندہ ہوتا (جاگتا) ہوں۔" (بخاری، مسلم، ابوداؤد، ترمذی وغیرہ)۔ نیز بخاری اور مسلم دونوں میں حضرت ابوہریرہؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "تم میں سے کوئی شخص جب رات کو اپنے بستر پر سے اٹھ کر دوبارہ بستر پر جائے تو پہلے بستر کو تین مرتبہ (یعنی اچھی طرح جھاڑ لے۔ کیونکہ اسے کیا خبر کہ اس کے پیچھے کیا چیز بستر پر آ بیٹھی ہو۔ اور پھر بستر پر لیٹتے ہوئے یہ پڑھے: بِاسْمِکَ اللّٰھُمَّ رَبِّیْ وَضَعْتُ جَنْبِیْ وَبِکَ اَرْفَعُہٗ، فَاِنْ اَمْسَکْتَ نَفْسِیْ فَارْحَمْھَا وَاِنْ اَرْسَلْتَھَا فَاحْفَظْھَا بِمَا تَحْفَظُ بِہٖ عِبَادَکَ الصّٰلِحِیْنَ۔ یعنی اے اللہ! میں تیرے نام کے ساتھ اپنا پہلو بستر پر رکھتا ہوں اور تیرے ہی نام سے اسے اٹھاؤں گا۔ اگر تو میری روح کو روک لے (نیند ہی میں قبض فرما لے) تو اس پر رحم فرمانا اور اگر اسے واپس فرما دے تو اس کی اس طرح حفاظت فرما جس طرح تو اپنے نیک اور صالح بندوں کی حفاظت فرماتا ہے۔ (بخاری، مسلم اور سنن اربعہ)

ہزار برس بھی دل اور باطن میں عارف رہے اور اس کے لیے کوئی عذر شرعی بھی اس کے اظہار میں مانع نہ ہو تو جب تک زبانی اقرار اس معرفت کے ساتھ شامل نہیں ہوگا وہ شخص کافروں ہی کے زمرے میں شمار ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے جس قدر مدح فرمائی ہے وہ مومنوں ہی کی فرمائی ہے۔ اور مومن کے لیے زبانی اقرار بھی ضروری ہے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حکم فرمایا گیا کہ: ''قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَا اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَمَا اُنْزِلَ عَلٰى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ، وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَالنَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ۝ (۳:۸۴) یعنی اے محمدؐ! ان سے کہہ دو کہ ہم اللہ کو مانتے ہیں، اُس تعلیم کو مانتے ہیں جو ہم پر نازل کی گئی ہے، ان تعلیمات کو بھی مانتے ہیں جو ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب اور اولادِ یعقوب پر نازل ہوئی تھیں اور ان ہدایات پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو موسیٰ اور عیسیٰ اور دوسرے پیغمبروں کو ان کے رب کی طرف سے دی گئیں۔ ہم ان کے درمیان فرق نہیں کرتے اور ہم اللہ کے تابع فرمان اور مسلم بن گئے ہیں۔'' دوسری جگہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ واضح حکم دیا کہ: ''وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ (۹۳:۱۱) یعنی اے محمدؐ! اپنے رب کی نعمتوں اور اس کے فضل کا تذکرہ کر۔'' نیز فرمایا: ''وَاذْكُرْ رَّبَّكَ كَثِيْرًا وَّسَبِّحْ بِالْعَشِيِّ وَالْاِبْكَارِ ۝ (۳:۴۱) یعنی اپنے رب کو بہت یاد کر اور صبح و شام اس کی تسبیح کر۔'' نیز فرمایا: ''اُدْعُوْنِيْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ (۴۰:۶۰) یعنی مجھے پکارو میں تمھاری پکار کا جواب دوں گا۔'' نیز فرمایا: ''اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً (۷:۵۵) یعنی اپنے رب کو پکارو زاری کرتے ہوئے اور چھپ کر۔'' اس سلسلے میں ایک شیخ بیان فرماتے ہیں کہ: جو شخص اپنا معاملہ بیان نہیں کرے گا اس کا معاملہ طے نہیں ہوگا۔ قوت گویائی خدا کی نعمتوں میں سے بہت بڑی نعمت ہے اور اس کا شکر اسی طرح سے ادا ہو سکتا ہے کہ اسے بندہ خدا کی راہ میں کام میں لائے۔ اللہ عزّ وجل نے فرمایا: ''وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَآ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا (۴۱:۳۳) یعنی اس شخص سے بڑھ کر اچھی بات اور کس کی ہوگی جو اللہ کی طرف بلائے اور نیک عمل کرے۔'' نیز فرمایا: ''قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَآ اَذًى ط (۲:۲۶۳) اچھی اور میٹھی بات کہہ دینا بہتر ہے اس

صدق سے جس کے پیچھے ایذا دی جائے۔'' ان احکام سے کلام کی فضیلت تو درکنار بعض حالتوں میں اس کا لازم اور فرض[1] ہونا ظاہر ہوتا ہے۔

دوسرا گروہ کہتا ہے کہ یہ بات اپنی جگہ پر صحیح ہے کہ قوت قویائی خدا کی نعمت ہے۔ مگر اس ظاہری نعمت میں بہت بڑی آفت پوشیدہ ہے۔ کلام مثل شراب کے ہے۔ جب آدمی کو اس سے لطف اندوزی کی عادت ہو جاتی ہے تو اس سے چھٹکارا محال ہو جاتا ہے۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اَخوَفُ عَلٰی اُمَّتِیَ اللِّسَان یعنی مجھے اپنی امت کے بارے میں سب سے بڑا اندیشہ اس کی زبان کے بارے میں ہے۔'' نیز فرمایا: ''مَنْ صَمَتَ نَجیٰ، یعنی جو خاموش رہا اس نے نجات پائی۔'' اس گروہ کے مشائخ کہتے ہیں کہ دعویٰ بلا معنیٰ نفاق ہے۔ اور معنیٰ بلا دعویٰ اخلاص۔ یعنی اگر اندر ایمان موجود نہیں اور صرف زبان سے اسے بیان کر رہا ہے تو یہ صریح نفاق ہے۔ لیکن اگر اندر ایمان اور خدا سے گرویدگی موجود ہے اور آدمی اس کا دعویٰ نہیں کرتا تو یہی درحقیقت اخلاص ہے۔ بیان کی ضرورت وہاں ہوتی ہے جہاں جس کے لیے بیان کیا جا رہا ہے اور اسے خبر نہ ہو۔ لیکن خداوند عزّ وجل کو اس کی حاجت نہیں ہے کہ اس کے سامنے بندہ کوئی دعویٰ یا بیان کرے۔ حضرت جنیدؒ فرماتے ہیں: ''مَنْ عَرَفَ اللّٰهَ كَلَّ لِسَانُهٗ، یعنی جس نے اللہ تعالیٰ کو پہچان لیا اس کی زبان بند ہو گئی۔'' خدا کو آخر بندہ کس بات سے باخبر کرے گا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''اَمْ يَحْسَبُوْنَ اَنَّا لَا نَسْمَعُ سِرَّهُمْ وَنَجْوٰهُمْ بَلٰى وَرُسُلُنَا لَدَيْهِمْ يَكْتُبُوْنَ (۸۰:۴۳) یعنی کیا یہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم ان کی سرگوشیوں اور ان باتوں سے جن کو یہ چھپاتے ہیں، ناواقف ہیں؟ نہیں، ہم خوب جانتے ہیں، اور مزید برآں ہمارے فرشتے ان کے پاس بیٹھے لکھتے رہتے ہیں۔''

قولِ فیصل:

میں (علی ہجویری بن عثمان جلابی) کہتا ہوں کہ سکوت اور کلام دونوں کا اپنا اپنا محل ہے اور اپنے اپنے محل میں دونوں یکساں درست اور مطلوب ہیں۔ کلام کی بھی دو قسمیں ہیں اور خاموشی کی

[1] قرآن مجید میں تقریباً ساڑھے تین سو مرتبہ "قُل" کا لفظ استعمال کر کے اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو واضح طور پر یہ حکم دیا ہے کہ مخاطب لوگوں سے یہ بات کہہ دو یا ان کو پہنچا دو۔ (مرتب)

بھی دو قسمیں ہیں۔ ایک کلام حق ہے اور ایک کلامِ باطل ہے۔ اسی طرح سے ایک خاموشی غور وفکر کے لیے یا اس وجہ سے ہوتی ہے کہ کلام کا مقصود حاصل ہو گیا ہے، اور ایک خاموشی غفلت اور جہل کے سبب ہوتی ہے۔ ہر شخص کو کلام کے وقت اس بات پر نگاہ رکھنی چاہیے کہ اگر اس کا کلام حق ہے تو اس کا بولنا اس کی خاموشی سے بہتر ہے۔ اور اگر باطل ہے تو اس کا چپ رہنا اس کے بولنے سے بہتر ہے۔[1] اسی طرح سے اگر کسی کی خاموشی غور وفکر کی خاموشی ہے یا اس وجہ سے ہے کہ اس کے کلام کا مقصود حاصل ہو گیا ہے۔ تو اس کا چپ رہنا کلام سے بہتر ہے۔ اور اگر یہ خاموشی غفلت یا جہل کی وجہ سے ہے تو اسے ان دونوں اسباب کو دُور کرنے کی فکر کرنی چاہیے۔ لیکن بہت سے جاہل اور بے ہودہ لوگ جو ایک مینار اور کنوئیں میں بھی تمیز نہیں کر سکتے، اپنے خاموش اور چپ رہنے کو اپنی ولایت اور بزرگی کی علامت کے طور پر اختیار کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ خاموشی کلام سے افضل ہے۔

کلام کے آداب:

پس کلام کا ادب یہ ہے کہ امر (ناگزیر ضرورت یا حکمِ خداوندی) کے بغیر نہ بولے اور جو اور جتنا بولے امر کے مطابق اور حق بولے۔ اس سے باہر نہ ہو۔ اور خاموشی کا ادب یہ ہے کہ جاہل نہ ہو اور اپنی جہالت پر کبھی راضی اور قانع نہ ہو اور غافل بھی نہ ہو۔ نیز کلام کرتے وقت بزرگوں کے کلام میں دخل اور تصرّف نہ کرے۔ اسے بلا کم وکاست بیان کرے۔ خود جو کچھ کہنا ہو وہ الگ کہے۔ اسے ان کے کلام میں گڈ مڈ نہ کرے کہ سننے والا اسے بزرگوں کا کلام خیال کرے۔ نیز عبارت مشکل، زبان ثقیل اور غیر مانوس اور اندازِ بیان گنجلک نہ اختیار کرے۔ جو کچھ کہنا ہو صاف، سہل اور عام فہم انداز میں بیان کر دے اور مختصر بات کہے۔ پھر اس بات پر بھی نگاہ رکھے کہ جس زبان سے اس نے خدا کی توحید کی شہادت دی ہے اس سے کوئی بات جھوٹ اور چغلی یا مسلمانوں کو دُکھ دینے والی نہ نکلے۔ درویشوں (لوگوں) کو خالی ان کے نام سے نہ پکارے بلکہ احترام کے

---

[1] حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَلْيَقُلْ خَيْرًا أَوْ لِيَصْمُتْ" یعنی جو شخص اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہو اسے چاہیے کہ بولے تو بھلائی کی بات کہے ورنہ پھر خاموش رہے۔" (مؤطا امام مالک، کتاب الاحکام)۔ (مرتب)

ساتھ پکارے۔ بلاضرورت بات نہ کرے۔ حتی الامکان جب تک اس سے بات پوچھی نہ جائے نہ کہے۔ کیونکہ سخن بلاطلب بالعموم بے کار ہوتا ہے۔[1]

جبکہ بولنا فرض ہو جاتا ہے

درویش کی خاموشی کی شرائط میں سے ایک شرط یہ بھی ہے کہ باطل پر خاموش نہ رہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے باطل پر خاموش رہنے والوں کو گونگے شیطان سے تشبیہ دی ہے۔[2]

سوال کے آداب

سوال کرنے کے بارے میں اختلاف:

سوال کرنے کے بارے میں بھی صوفیاء کرام میں اختلاف ہے۔ ایک گروہ خداوند تعالیٰ کے سوا کسی اور سے سوال کرنے سے اور کچھ مانگنے کو جائز نہیں رکھتا۔ اور دوسرا گروہ بندوں سے بھی دنیوی ضروریات کے لیے سوال کرنے کو جائز بلکہ خداوند تعالیٰ کی تعظیم کے مطابق خیال کرتا ہے۔

پہلے گروہ کا کہنا ہے کہ غیر سے سوال کرنا خدا سے منہ پھیرنا ہے اور جب بندہ خدا سے منہ موڑے گا تو اس کے خدا کی درگاہ سے رَد ہو جانے کا اندیشہ ہوگا۔ حکایات میں ہے کہ کسی دنیادار شخص نے رابعہ عدویہؒ سے کہا کہ: ''اے رابعہ! اگر تجھے کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھ سے مانگ تا کہ میں تیری وہ ضرورت پوری کروں۔'' رابعہ نے جواب دیا کہ: ''اے شخص! دنیا تو میں دنیا کے خالق

---

[1] حضرت امام مالکؒ اپنی مؤطا کتاب الاحکام میں فرماتے ہیں کہ حضرت مسیح علیہ السلام نے فرمایا: ''کثیر الکلامی سے بچو اِلّا یہ کہ وہ اللہ کا ذکر ہو۔ زیادہ بولنا دل کو سخت کر دیتا ہے۔ دل کی سختی انسان کو خدا سے دُور کر دیتی ہے اور تمہیں اس کی خبر بھی نہیں ہوتی۔ دوسروں کے گناہوں اور عیوب پر نظر نہ کرو کہ تم اُن کے رب نہیں ہو۔ اپنے گناہوں اور عیوب پر نگاہ رکھو کہ تم بندے ہو۔ لوگ دو میں سے کسی ایک حالت میں مبتلا ہوں گے، یا ابتلاء اور آزمائش میں یا عافیت میں۔ اہل ابتلاء کو دیکھو تو ان پر رحم کرو اور اہل عافیت کو دیکھو تو خدا کا شکر ادا کرو۔ (المصفّٰی شاہ ولی اللہؒ، جلد دوم، ص ۳۳۲)

[2] حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے ایک خطبہ میں ارشاد فرمایا: ''میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ جب لوگوں کا یہ حال ہو جائے کہ وہ برائی کو دیکھیں اور اسے بدلنے کی کوشش نہ کریں۔ ظالم کو ظلم کرتے ہوئے پائیں اور اس کا ہاتھ نہ پکڑیں تو بعید نہیں کہ اللہ اپنے عذاب میں سب کو لپیٹ لے۔ خدا کی قسم تم سب کو لازم ہے کہ بھلائی کا حکم دو اور برائی سے روکو، ورنہ اللہ تم پر ایسے لوگوں کو مسلط کر دے گا جو تم میں سب سے بدتر ہوں گے اور وہ تم کو سخت تکلیفیں پہنچائیں گے۔ پھر تمہارے نیک لوگ خدا سے دعائیں مانگیں گے مگر وہ قبول نہ ہوں گی۔'' (تفہیم القرآن، بسلسلہ تفسیر آیت نمبر ۱۰۵ سورۃ المائدہ)۔

سے مانگتی ہوئی بھی شرماتی ہوں تو بھلا اپنے جیسے ایک انسان سے اسے مانگتے ہوئے کیوں نہ شرماؤں گی۔" ایک اور حکایت ہے کہ خلیفہ ابو مسلم کے زمانے میں ایک درویش کو بے قصور چوری کے الزام میں گرفتار کر لیا گیا اور جیل بھیج دیا گیا۔ اسی رات ابو مسلم نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خواب میں دیکھا۔ حضورؐ نے اس سے فرمایا: اے ابو مسلم! اللہ عزوجل نے مجھے تیرے پاس بھیجا ہے کہ میرا ایک دوست بے قصور تیری قید میں ہے۔ اٹھ اور اسے اسی وقت جیل سے نکال۔ ابو مسلم فوراً اپنے بستر پر سے کودا اور ننگے سر اور ننگے پاؤں دوڑتا ہوا جیل خانہ پہنچا اور حکم دیا کہ فوراً جیل کا دروازہ کھولو اور اس درویش کو باہر لاؤ۔ اس کے بعد ابو مسلم نے اس درویش سے معافی مانگی اور اس سے کہا کہ کوئی حاجت ہو تو مجھ سے کہو۔ اس درویش نے کہا: "اے امیر! جس کا مالک ایسا ہو کہ آدھی رات ابو مسلم کو اپنے بستر پر سے اٹھائے اور اسے بھیجے تاکہ اپنے بندے کو ایذا سے نجات دلائے، اس کے لیے یہ کب جائز ہوگا کہ دوسروں سے سوال کرتا پھرے اور ان کے سامنے اپنی حاجت پیش کرے۔" ابو مسلم یہ سن کر رونے لگا اور درویش وہاں سے چلا گیا۔

دوسرا گروہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیبؐ کو فرمایا: "وَاَمَّا السَّائِلَ فَلَا تَنْهَرْ (۹۳:۱۰) یعنی سائل کو مت جھڑکو"۔ نیز اپنی راہ کے فقیروں کے بارے میں فرمایا: "لَا يَسْئَلُوْنَ النَّاسَ اِلْحَافًا (۲:۲۷۳) یعنی وہ لوگوں کے پیچھے پڑ کر نہیں مانگتے۔" گویا درویش کے لیے مخلوق سے سوال کرنا تو رَوا ہے البتہ لپٹ جانا اور پیچھے پڑ کر مانگنا ناپسندیدہ ہے۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی صحابہؓ اور دین کے کاموں کے لیے سوال فرمایا ہے۔ نیز آپؐ نے ہمیں ہدایت فرمائی کہ: "اُطْلُبُوا الْحَوَائِجَ عِنْدَ حِسَانِ الْوُجُوْهِ یعنی اپنی حاجتیں خوش رو لوگوں سے طلب کرو۔"

جن مقاصد کے لیے سوال کرنا جائز ہے:

چنانچہ مشائخ رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ حسب ذیل تین مقاصد میں سے کسی مقصد کے لیے سوال کیا جائے تو رَوا ہے:

ا۔ دل کو فارغ کرنے کے لیے۔ مثلاً یہ کہ آدمی کو ایک اضطراری ضرورت لاحق ہے، جیسے سخت بھوک، اس صورت میں یہ رَوا ہے کو سوال کر کے روٹی مانگ لے اور اُدھر سے فارغ ہو کر خدا کے کام میں اطمینان سے لگ جائے۔ درویش کے لیے یہ مناسب نہیں کہ کھانے کے انتظار میں پریشان بیٹھا رہے۔ چنانچہ بایزیدؒ نے اپنے مرید شفیقؒ کے متعلق اس کے مرید سے جو بایزیدؒ کی زیارت کے لیے آیا تھا، دریافت کیا کہ شفیقؒ کا کیا حال ہے۔ اس نے جواب دیا کہ وہ مخلوق سے فارغ ہو چکا ہے اور صرف اللہ کے توکل پر بیٹھا ہے۔ ابو یزید رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ جب تو واپس جائے تو اُس سے کہنا کہ خداوند تعالیٰ کو روٹی کے دو ٹکڑوں سے نہ آزما۔ جب تجھے بھوک لگے تو اپنے ہم جنسوں سے دو ٹکڑے روٹی کے مانگ کر کھالے۔ اس توکل سے جو تو نے اختیار کیا ہے کنارہ کش ہو۔ ایسا نہ ہو کہ وہ شہر اور ملک صرف تیرے اس ایک معاملے کی نحوست کی وجہ سے غرق ہو جائے۔

۲۔ دوسرے ریاضتِ نفس کی غرض سے بھی سوال کرنا رَوا اور جائز ہے۔ بلکہ بعض حالتوں میں ضروری ہے تاکہ اس ذلت سے غرورِ نفس اور تکبر سے نجات حاصل ہو۔ اور اپنی اصل قدر و قیمت معلوم ہو۔ چنانچہ جب شبلیؒ حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں آئے تو حضرت جنیدؒ نے ان سے فرمایا: اے ابوبکر! تیرے دماغ میں بھی ابھی یہ کجی اور غرور موجود ہے کہ میں خلیفہ کے حاجب الحجاب (باڈی گارڈوں کے کمانڈر) کا بیٹا ہوں اور سامرہ کا امیر ہوں۔ جب تک تیرے دماغ سے یہ غرّہ نہیں نکلے گا تجھے کچھ نہیں ملے گا۔ بازار میں جاؤ اور ہر ایک سے بھیک مانگو تاکہ تمھیں اپنی قدر و قیمت معلوم ہو۔ انھوں نے ایسا ہی کیا۔ ہر روز بازار جاتے اور ہر ایک سے سوال کرتے۔ آہستہ آہستہ لوگوں نے ان کو نظر انداز کرنا شروع کیا۔ یہاں تک کہ کچھ عرصہ کے بعد ایک روز انھوں نے سارے بازار میں سوال کیا لیکن کسی نے بھی اُن کو کچھ نہ دیا۔ جب وہ واپس حضرت جنیدؒ کے پاس آئے اور اپنا حال بیان کیا تو حضرت جنیدؒ نے فرمایا کہ اے ابوبکر! اب تجھے معلوم ہوا کہ جن لوگوں پر تجھے اتنا بھروسہ تھا ان کے نزدیک تیری کیا قدر و قیمت ہے۔ مخلوق تجھے کسی چیز کے لائق نہیں سمجھتی۔ پس مخلوق میں دل نہ لگاؤ اور جس طرح وہ تمھیں کوئی اہمیت نہیں دیتی، تم بھی

اُس سے بے پرواہ ہو جاؤ ے

گویا یہ سوال کرنا ریاضت کی خاطر ہے، نہ کہ کسب اور کمائی کے لیے۔

۳۔ تیسرے ادبِ خداوندی ملحوظ رکھنے کی وجہ سے خدا کے بجائے ان لوگوں سے سوال کیا جائے جن کو اللہ تعالیٰ نے دنیا میں اپنے مال کا وکیل بنا رکھا ہے اور ان کے ذریعہ سے دوسرے بندوں کو دیتا اور ان سے لیتا ہے۔ یعنی آدمی ایمان اور پختہ یقین تو اسی بات پر رکھتا ہو کہ تمام اموال خدا ہی کا مال ہیں۔ جو کچھ انسان کو پہنچتا ہے خواہ کسی ذریعہ سے پہنچے خدا ہی کی طرف سے ملتا ہے اور جو نہیں ملتا اس کا ظاہری سبب خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو دراصل اللہ ہی کی طرف سے اسے روکا جاتا ہے۔ لیکن چونکہ اموالِ دنیا اللہ تعالیٰ نے تصرف کے لیے بعض انسانوں کی تحویل میں بطور اپنے وکیلوں کے دے رکھے ہیں، اس لیے اگر ان اموال میں سے کسی کی ضرورت ہو تو خدا کے ادب اور تعظیم کا تقاضا یہ ہے کہ ان کو براہِ راست خدا سے طلب کرنے کے بجائے اس کے کسی وکیلِ مال سے مانگا جائے۔ اگر ان سے مل جائے تو اس کو خدا ہی کی طرف سے سمجھے۔ اور اگر نہ ملے تو خیال کرے کہ خدا نے ان کے نصیب میں یہ چیز نہیں لکھی تھی۔ حکایات میں ہے کہ یحییٰ بن معاذؒ کی ایک لڑکی تھی۔ اس نے ایک دن اپنی ماں سے کوئی چیز مانگی۔ ماں نے کہا: ''بیٹی مجھ سے نہیں خدا سے مانگو۔'' اُس نے جواب دیا: اماں، نفس کی خواہش کی کوئی شے خدا سے مانگتے ہوئے مجھے شرم آتی ہے، اور پھر جو کچھ آپ مجھے دیں گی وہ بھی تو خدا ہی کی طرف سے ہوگا۔''

قولِ فیصل:

پس درویش ضرورت سے مجبور ہو تو دوسرے انسان سے سوال کر سکتا ہے۔ لیکن لپٹ کر اور پیچھے پڑ کر مانگنا اس کے لیے صحیح نہیں ہے۔ نیز ہر حال میں امید خداوند تعالیٰ ہی سے رکھے اور سوال کے پورا ہونے اور نہ ہونے کو بھی اسی کی طرف سے سمجھے۔ اور اگر کوئی دوسرا اس سے سوال کرے تو جہاں تک اس کے بس میں ہو اسے پورا کرنے کی کوشش کرے۔ بہر حال سائل کو جھڑکنا کسی طرح بھی جائز نہیں۔ خداوند تعالیٰ نے فرمایا: ''وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ (۹۳:۱۰) یعنی سائل کو جھڑکو

مت۔'' نیز فرمایا: ''قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَآ اَذًى (۲:۲۶۳) یعنی ایک میٹھا بول اور تھوڑی سی درگزر اس خیرات سے بہتر ہے جس کے بعد ستایا جائے اور ذلیل کیا جائے۔''

سوال کرنے کے آداب:

سوال کرنے کے آداب یہ ہیں:

۱۔ سوال کا مخاطب اگر چہ مخلوق ہی میں سے کوئی ہو لیکن حقیقۃً اس کا مخاطب اللہ تعالیٰ ہی کو سمجھے۔ اگر سوال پورا ہو جائے تو اسے اللہ کی طرف سے خیال کرے اور نہ پورا ہو تو بھی اسے خدا ہی کی طرف سے مقدر خیال کرے۔

۲۔ بازاری قسم کے مردوں اور عورتوں سے سوال نہ کرتا پھرے۔ ایسے لوگوں سے رجوع کرے جن کی کمائی کے حلال ہونے کا اسے یقین ہو۔

۳۔ سوال صرف اضطرار کی حالت میں اور ناگزیر ضرورت کو پورا کرنے کی حد تک ہی کرے۔ گھر کی آرائش اور زینت کے لیے سوال نہیں کرنا چاہیے۔ صرف وقتی ضرورت پوری کرے۔ کل کی فکر نہ کرے۔

۴۔ خداوند تعالیٰ کے نام کو اپنی گداگری کا ذریعہ نہ بنائے یعنی لوگوں سے یہ نہ کہتا پھرے کہ خدا کے نام پر مجھے کچھ دو۔ اور نہ لوگوں سے کچھ حاصل کرنے کے لیے اپنی پارسائی کی نمائش کرتا پھرے۔ چنانچہ ایک ذی مرتبہ صوفی بزرگ جنگل سے کوفہ کے بازار میں تشریف لائے۔ کئی دن کے بھوکے تھے اور راستے میں بھی بہت تکلیف اٹھائی تھی۔ بازار میں پہنچ کر آپ نے ایک چڑیا کو اپنے ہاتھ پر بٹھالیا اور لوگوں سے کہنا شروع کیا کہ اس چڑیا کے لیے مجھے کچھ دو۔ لوگوں نے حیرت سے پوچھا کہ تم یہ کیا کہہ رہے ہو؟ انھوں نے جواب دیا کہ اس حقیر دنیا کی چیزوں کے لیے کیا میں خدا کا واسطہ دوں؟ دنیا کی تحصیل کے لیے اس حقیر جانور کی سفارش کافی ہے۔

نکاح کرنے اور مجرد (بلا نکاح) رہنے کے آداب

نکاح کے بارے میں خدا اور رسولؐ کے احکام:

اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا: ''هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ وَاَنْتُمْ لِبَاسٌ لَّهُنَّ (۲:۱۸۷) یعنی وہ (عورتیں) تمھارے لیے لباس ہیں اور تم اُن کے لیے لباس ہو۔'' نیز فرمایا: ''وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ (۴:۲۵) یعنی ان (ماں، بہن، بیٹی وغیرہ چودہ قسم کی عورتوں) کے ماسوا جتنی عورتیں ہیں انھیں اپنے اموال کے ذریعہ سے حاصل کرنا تمھارے لیے حلال کر دیا گیا ہے، بشرطیکہ ان کو حصارِ نکاح میں محفوظ کرو، نہ یہ کہ آزاد شہوت رانی کرنے لگو۔'' پھر فرمایا کہ: ''وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ يَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ فَمِنْ مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ فَتَيٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ (۴:۲۵) یعنی جو شخص تم میں سے اتنی مقدرت نہ رکھتا ہو کہ خاندانی مسلمان عورتوں (محصنٰت) سے نکاح کر سکے اسے چاہیے کہ تمھاری ان لونڈیوں میں سے کسی کے ساتھ نکاح کر لے جو تمھارے قبضہ میں ہوں اور مومنہ ہوں۔'' اسی سلسلے میں فرمایا ''ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ الْعَنَتَ مِنْكُمْ ط وَاَنْ تَصْبِرُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ (۴:۲۵) یعنی یہ سہولت تم میں سے ان لوگوں کے لیے پیدا کی گئی ہے جن کو نکاح نہ کرنے سے بدکاری میں مبتلا ہو جانے کا اندیشہ ہو۔ لیکن اگر ضبط سے کام لو تو یہ تمھارے لیے بہتر ہے۔'' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تَنَاكَحُوْا وَتَكَثَّرُوْا فَاِنِّيْ اُبَاهِيْ بِكُمُ الْاُمَمَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَلَوْ بِالسِّقْطِ یعنی تم نکاح کرو اور اپنی تعداد کو بڑھاؤ، میں قیامت کے روز تمھاری کثرتِ تعداد کے سبب دوسری امتوں پر فخر کروں گا۔ تم تعداد بڑھانے کی کوشش کرو، اگرچہ اس کوشش کا نتیجہ اسقاطِ حمل ہی کی صورت میں ظاہر ہو۔'' نیز فرمایا: ''حُبِّبَتْ اِلَيَّ مِنْ دُنْيَاكُمْ ثَلٰثٌ: اَلطِّيْبُ وَالنِّسَآءُ وَجُعِلَتْ قُرَّةُ عَيْنِيْ فِي الصَّلٰوةِ یعنی تمھاری اس دنیا میں سے تین چیزیں مجھے محبوب ہیں: خوشبو، عورتیں اور نماز جو میری آنکھوں کی ٹھنڈک ہے۔'' آپؐ نے یہ بھی فرمایا: ''تُنْكَحُ

النِّسَاءُ عَلٰى اَرْبَعَةٍ: عَلَى الْمَالِ وَالْحَسَبِ وَالدِّيْنِ، فَعَلَيْكُمْ بِذَاتِ الدِّيْنِ. فَاِنَّهُ مَا اسْتَفَادَ امْرَءٌ بَعْدَ الْاِسْلَامِ خَيْرٌ مِّنْ زَوْجَةٍ مُؤْمِنَةٍ مُوَافِقَةٍ يَسُرُّهَا اِذَا نَظَرَ اِلَيْهَا. یعنی عام طور پر لوگ عورتوں سے چار وجوہ سے نکاح کرتے ہیں: ان کے مال کی وجہ سے اور ان کے خاندان کی وجہ سے اور ان کے حسن کی وجہ سے اور ان کے دین (خیالات وکردار) کی وجہ سے۔ تمھیں چاہیے کہ تم ہر چیز پر اس کے دین کو مقدم رکھو۔ حقیقت یہ ہے کہ اسلام کی نعمت کے بعد آدمی کے لیے سب سے بڑی بھلائی اور فائدے کی چیز مومن اور موافقت کرنے والی بیوی ہے کہ جب آدمی اس کی طرف دیکھے تو اس کا جی خوش ہو جائے۔'' حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا: ''اِنَّ اَعْظَمَ النِّسَاءِ اَقَلُّهُنَّ مُؤْنَةً وَاَحْسَنُهُنَّ وُجُوْهًا وَ اَحْصَنُهُنَّ فُرُوْجًا یعنی سب عورتوں سے بڑے درجے والی وہ عورتیں ہیں جن کا خرچہ ہلکا ہو، چہرے خوبصورت (متبسم) ہوں اور اپنی شرمگاہوں کو محفوظ رکھنے والی ہوں۔''

نکاح اور تجرّد:

خداوند تعالیٰ اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ان ارشادات کی روشنی میں حضرات مشائخ رحمہم اللہ کا بالعموم اس بات پر اتفاق ہے کہ اگر درویش کا دل آفت سے خالی ہو اور اس نے طبیعت ایسی پائی ہو جو گناہ اور شہوات سے منہ موڑنے والی ہو تو تجرد کی زندگی اس کے لیے زیادہ فضیلت رکھتی ہے۔ کیونکہ اس صورت میں وہ زیادہ جرأت وآزادی اور یکسوئی کے ساتھ خدا کی ملازمت کے فرائض انجام دے سکے گا۔ لیکن اگر عورتیں اس کے نزدیک بہت محبوب ہوں تو تجرد رہنے کی نسبت نکاح کر لینا اس کے لیے زیادہ اچھا ہے۔

نکاح اور تجرّد کے درمیان ترجیح کے سلسلے میں ایک بات یہ بھی کہی گئی ہے کہ جو شخص مخلوق کے درمیان رہنا چاہے اس کو نکاح کی زندگی اختیار کرنی چاہیے۔ اور جو مخلوق سے علیحدہ اور آبادی سے دُور رہے اس کے لیے مجرّد رہنا اچھا ہے تا کہ اس کی وجہ سے کوئی نیک بخت پریشانی اور مشکلات میں مبتلا نہ ہو۔

نکاح اور تجرّد کی شرعی حیثیت:

ان دونوں صورتوں میں سے درویش کو کون سی صورت اختیار کرنی چاہیے اس بارے میں اور کسوٹی یہ بیان کی گئی ہے کہ ہر مرد اور عورت کے لیے نکاح کرنا مباح ہے۔ لیکن جس شخص کو نکاح کے بغیر اپنے زنا میں مبتلا ہو جانے کا اندیشہ ہے اُس کے لیے نکاح کرنا فرض ہے۔ ایسے ہی لوگوں کے لیے اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ اُسے اگر آزاد شریف زادی نہ ملے تو کسی لونڈی ہی سے نکاح کر لیں۔

اور جو شخص اہل وعیال کا بار اٹھانے کی استطاعت رکھتا ہو اس کے لیے نکاح کرنا سنت کے درجے میں ہے۔ اسے اگر گناہ میں مبتلا ہو جانے کا اندیشہ نہ بھی ہو تو اسے سنت کی پیروی کے لیے نکاح کرنا چاہیے۔ چنانچہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اَلنِّکَاحُ مِنْ سُنَّتِیْ فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِیْ فَلَیْسَ مِنِّی. یعنی نکاح میری سنت اور میرا طریقہ ہے۔ جو شخص میرے طریقہ سے اجتناب کرے اس کا مجھ سے کوئی واسطہ نہیں۔'' لیکن جن لوگوں میں نکاح اور اہل وعیال کے مصارف اٹھانے کی مقدرت نہ ہو ان کے لیے بہتر اسی کو قرار دیا گیا ہے کہ صبر سے کام لیں: ''اَنْ تَصْبِرُوْا خَیْرٌ لَّکُمْ. (۴:۲۵) یعنی اگر (تنگ دست ہونے کی صورت میں) تم صبر کرو تو یہ تمھارے بہتر ہے۔''

پس درویش کو تجرّد اور نکاح دونوں قسم کی زندگیوں کو اپنے سامنے رکھ کر اور دونوں کو تول کر اپنے بارے میں فیصلہ کرنا چاہیے کہ وہ کیا صورت اختیار کرے۔ اس میں شک نہیں کہ تمام وحشتیں تنہائی میں جمع ہیں اور تمام خوشیاں صحبت میں ہیں۔ اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ''اَلشَّیْطَانُ مَعَ الْوَاحِدِ'' کی خبر دی ہے۔ یعنی یہ کہ ''تنہا آدمی (مرد ہو یا عورت) کا ساتھی شیطان ہوتا ہے۔'' اور وہ شہوانی افعال کو مزیّن اور آراستہ کر کر کے اس کے سامنے پیش کرتا رہتا ہے۔ اور یہ بھی حقیقت ہے کہ مرد اور عورت کی باہمی نکاح کی صحبت سے بڑھ کر اُن کے لیے حرمت پاکیزگی اور گناہ سے امان اور حفاظت کی کوئی صورت نہیں۔ بشرطیکہ باہم ہم جنس اور ان کے

درمیان موافقت ہو۔ لیکن جس طرح تجرد میں آفتیں پوشیدہ ہیں اسی طرح نکاح میں بھی بہت سی آفتیں پوشیدہ ہیں۔

اکیلا رہنے میں دو آفتیں ہیں: ایک سنت کا ترک اور دوسرا اپنے اندر شہوت کو پالنا جو کسی وقت بھی اس کے لیے سخت آفت اور فتنے کا موجب بن سکتی ہے۔ نکاح کرنے میں بھی دو آفتیں ہیں: ایک درویش کے دل کا غیر کی طرف مشغول ہونا اور دوسرا اس کے بدن کا نفس کی لذت میں مشغول ہو جانے کا اندیشہ۔ عورت سے آدمی کی محبت اور اس کی طرف اس کا میلان اس کے لیے سب سے بڑا فتنہ ہے۔ شیطان نے انسان پر سب سے پہلا حملہ اسی راستے سے کیا اور اس کے بعد سے اب تک انسان اس سے نہیں سنبھلا۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مَاتَرَكْتُ بَعْدِیْ فِتْنَةً اَضَرُّ عَلَى الرِّجَالِ مِنَ النِّسَاءِ، یعنی میں اپنے پیچھے مردوں کے لیے عورتوں سے بڑھ کر ضرر رساں فتنہ نہیں چھوڑ رہا ہوں۔'' اور میں (علی ہجویری بن عثمان جلابی) خود اس میں مبتلا ہو چکا ہوں۔ اس لیے اس کی تباہ کاری کو خوب سمجھتا ہوں۔ گیارہ سال تک اللہ تعالیٰ نے مجھے نکاح (تزویج) کی آفت سے بچایا۔ مگر اس فتنہ میں میرا مبتلا ہونا اس نے میری تقدیر میں لکھ رکھا تھا۔ چنانچہ میں ایک پری صفت کا بن دیکھے اس درجہ دل و جان سے گرویدہ ہوا کہ ایک سال اسی میں مُستغرق رہا۔ قریب تھا کہ میرا دل تباہ و برباد ہو جاتا لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے کمال لطف اور مہربانی سے میرے دل پر عصمت و پاکیزگی کا فیضان فرمایا اور اپنی رحمت سے مجھے اس آفت سے نجات بخشی۔

نکاح کے بارے میں سنت کی پیروی:

لیکن جو درویش (خدا کے مطیع فرمان بندے) نکاح کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کہہ کر اختیار کریں اُن کو اس بات پر نگاہ رکھنی چاہیے کہ آیا وہ فی الواقع اسے سنت ہی کی خاطر اختیار کر رہے ہیں یا اصل محرک شہوت کی پیاس بجھانا ہے اور نام اسے سنت کا دے رہے ہیں۔ ایک شخص جو عورت کی حرص میں مبتلا ہو اور کہے یہ کہ میں رسولِ خدا کی سنت کی پیروی کر رہا ہوں وہ بہت بڑی غلطی پر ہے۔ وہ اپنی حرص کو رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت قرار دے رہا ہے۔ پھر اگر وہ نکاح

کو سنت کے طور پر اختیار کر رہا ہو تو بھی اسے اس امر پر نگاہ رکھنی چاہیے کہ سنت کا استعمال اسے ہلاکت میں نہ ڈال دے۔ اور اس کی وجہ سے اس کا دل دنیا کی طلب اور حرام میں نہ مشغول ہو جائے۔ کیونکہ بندے کی ہلاکت اس کے دل کی خرابی ہے۔ اور دل میں خرابی آ جانے سے بڑا انسان کے لیے کوئی نقصان نہیں ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ ایسی عورت سے نکاح کرے جو اس کی ہم جنس اور اس سے موافقت کرنے والی ہو۔

صوفیاء میں تجرّد کے فروغ پانے کی وجہ:

چونکہ ہمارے زمانے میں موافق اور فرماں بردار عورت کا ملنا محال ہو گیا ہے۔ فضول گوئی اور محال چیزوں کے تقاضے کرنے والی بہت ہیں۔ اس لیے لوگوں نے بالعموم مجرد اور بلکار رہنے کو اپنے لیے پسند کیا ہے۔

اور اس کے لیے انھوں نے اس حدیث کا سہارا لیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''خَیْرُ النَّاسِ فِیْ اٰخِرِ الزَّمَانِ خَفِیْفُ الْحَاذِ، قِیْلَ یَارَسُوْلَ اللّٰہِ وَمَا خَفِیْفُ الْحَاذِ؟ قَالَ الَّذِیْ لَا اَھْلَ لَہٗ وَلَا وَلَدَلَہٗ، یعنی یہ کہ آخر زمانے میں سب سے بہتر وہ لوگ ہونگے جو ''خفیف الحاذ'' ہوں۔ لوگوں نے پوچھا: اے اللہ کے رسولؐ! خفیف الحاذ، سے کیسے لوگ مراد ہیں؟ آپؐ نے فرمایا: ''وہ شخص جس کی نہ بیوی ہو اور نہ اولاد۔'' نیز فرمایا: ''سِیْرُوْا، سَبَقَ الْمُفْرِدُوْنَ، یعنی تیز چلو، مجرد لوگ بازی لے گئے۔'' اور آپؐ نے یہ بھی فرمایا: ''لی حرفتان، اَلْفَقْرُ وَالْجِهَادُ یعنی میرے دو کسب ہیں: ایک فقر اور دوسرا جہاد۔'' اور اہل و عیال ان دونوں کی راہ میں حائل ہوتے ہیں۔ نیز وہ حدیث جو اوپر گزر چکی ہے کہ حضورؐ نے فرمایا کہ میں اپنے پیچھے مردوں کے لیے عورتوں سے بڑا فتنہ اور کوئی نہیں چھوڑ رہا ہوں، اس سے بھی تجرد کے حق میں استدلال کیا گیا ہے۔

قولِ فیصل:

اصل حقیقت یہ ہے کہ درویش کے لیے ہلاکت نکاح کرنے یا مجرد رہنے میں نہیں ہے، بلکہ اُسے ہلاک کرنے والی اصل شے خواہشِ نفس کی پیروی اور خدا اور رسولؐ سے آزاد ہو کر اپنے

اختیار کو استعمال کرنا ہے۔ اگر وہ اس بارے میں متنبہ رہے تو کسی حالت میں اس کے لیے اندیشہ نہیں ہے۔ اس کے حالات اجازت دیں تو نکاح کی زندگی اختیار کرے اور یہ نہ ہو سکے تو تجرد کی زندگی پر صبر کرے۔ بہر حال اسے خدا کی اطاعت اور بندگی پر خلوص کے ساتھ قائم رہنا چاہیے کہ عبودیت کا اصل مقصود یہی ہے۔

نکاح اور تجرّد کے آداب

نکاح کے آداب:

۱۔ نکاح کے نتیجے میں درویش کے فرائض و واجبات اور سنن ہی نہیں اس کے وردوں میں سے کوئی وِرد بھی فوت نہ ہونے پائے۔ نہ اُس کا وقت پراگندہ ہو اور نہ احوال ضائع ہوں۔

۲۔ اُس پردہ نشین کے لیے روزی حلال کمائی سے مہیا کرے اور اس کا مہر حلال کمائی سے اَدا کرے۔ اس پر شفقت کرنے والا ہو۔ اس کے لیے نفقہ مہیا کرنے کے لیے ظالم بادشاہوں کی رعایت نہ کرنے لگ جائے تا کہ اولاد صالح پیدا ہو۔ حکایتوں میں ہے کہ احمد بن حرب نیشاپوری رحمۃ اللہ علیہ ایک دن رئیسوں کی ایک جماعت کے ساتھ جو آپ کے سلام کے لیے آئی تھی، تشریف فرما تھے۔ اتنے میں آپ کا فرزند شراب میں مست کنجریوں کی طرح گاتا بجاتا ہوا اندر آیا اور بہت بے حرمتی کے ساتھ آپ کے پاس سے گزرا اور اُس نے اس کا بھی کوئی پاس و لحاظ نہ کیا کہ شرفاء کی ایک جماعت اس کے والد بزرگوار کے پاس بیٹھی ہے۔ سب لوگ یہ صورتِ حال دیکھ کر حیران رَہ گئے۔ حضرت احمدؒ نے ان کے چہروں کو دیکھ کر فرمایا: وہ معذور ہے۔ ایک روز ہمارے ہمسائے سے میرے اور میری بیوی کے لیے کھانا آیا اور ہم نے اسے کھایا۔ اسی رات میں نے بیوی سے صحبت کی جس سے یہ لڑکا پیدا ہوا۔ اس رات مجھ پر نیند اور غفلت کا اس قدر غلبہ ہوا کہ ہمارے سب ورد بھی ضائع ہوئے۔ صبح میں نے اس بارے میں غور و تجسس کیا تو معلوم ہوا کہ وہ کھانا ہمسائے کے ہاں بادشاہ کے ہاں سے آیا تھا۔

۳۔ جب تک خدا کے فرائض اور اس کے حقوق میں سے کوئی چیز باقی ہے اس وقت تک

اپنے نفس کی خواہش میں مشغول نہ ہو۔ اور جب اپنے وِردوں سے فارغ ہو جائے تو اس کے بستر کی طرف قصد کرے اور اللہ تعالیٰ سے اس طرح مناجات کرے کہ: ''خدایا! تو نے شہوت کو آدمی کے خمیر میں گوندھا ہوا ہے تاکہ یہ جہان آباد رہے۔ میرا یہ فعل کرنا تیرے علم میں موجود تھا۔ یا اللہ! اسے میرے لیے خیر و برکت کا ذریعہ بنا۔ حرام کی حرص کو حلال سے بدل دے۔ اور مجھے ایسی اولاد عطا فرما جو تیری ولی اور دوست ہو۔''

مجرّد رہنے کے آداب:

اگر درویش مجرّد ہو تو اسے حسب ذیل باتوں کی پابندی کرنی چاہیے:

اپنی آنکھوں کو ایسی چیزوں کے دیکھنے سے بچائے جو ناشائستہ ہیں اور دیکھنے کے لائق نہیں ہیں۔ جو باتیں سننے کے لائق نہیں ہیں اُن کو نہ سنے۔ جو چیزیں غور و فکر کے لائق نہیں ہیں اُن میں غور فکر نہ کرے۔ اپنی شہوت کی آگ کو بھوک سے کمزور کرے اور اُس کے متعلقات سے بھی دل کی دنیا کی حفاظت کرے۔

اپنی نفسانی خواہشات کو علم اور الہام کا نام نہ دینے لگ جائے اور شیطان کی بوالعجبیوں کی تاویلیں کر کر کے اُن کو طریقت کے مقامات ثابت کرنے کی کوشش نہ کرنا شروع کر دے۔[1]

دسواں کشف الحجاب:

صوفیوں کی زبان اور اصطلاحات کے بارے میں

خاص زبان اور اصطلاحات کی ضرورت:

جس طرح سے دوسرے فنون اور شعبہ ہائے علم کے علماء اور ماہرین نے ان علوم وفنون کے مسائل اور نکات کو بیان اور واضح کرنے کے لیے فن کے لیے ایک خاص زبان اور مخصوص اصطلاحات وضع اور اختیار کی ہیں، اور جب تک آدمی کو اس زبان اور ان اصطلاحات پر عبور حاصل نہ ہو وہ متعلقہ علم وفن کو نہ پوری طرح سے سمجھ سکتا ہے اور نہ ان سے استفادہ کر سکتا ہے، اس طرح سے صوفیائے کرام نے بھی طریقت وحقیقت کے مسائل ونکات کو بیان اور واضح کرنے کے لیے ایک خاص زبان اور کچھ مخصوص اصطلاحات وضع اور اختیار کی ہیں جن کو جانے اور سمجھے بغیر آدمی صوفیائے کرام کی باتوں کی تہہ تک نہیں پہنچ سکتا اور نہ ان سے استفادہ کر سکتا ہے۔

مثال کے طور پر اہل لغت ماضی، حال، مستقبل، واحد، جمع، حاضر، غائب، متکلم، صحیح، معتل، اجوف، لفیف اور ناقص وغیرہ کی اصطلاحات کی مدد سے اپنی بات کو بیان کرتے اور سمجھتے سمجھاتے ہیں۔ اہل نحو نے رفع، نصب، جر، جزم، مُنْصَرِف اور غیر منصرف وغیرہ کی اصطلاحات وضع اور اختیار کی ہیں۔ حساب دانوں نے فرد اور زوج اور جمع اور تفریق اور ضرب اور قسمت اور تنصیف اور جذر اور کعب کی خود ساختہ اصطلاحات اختیار کی ہیں۔ عروضیوں (جیومیٹری والوں) نے نقطہ اور فاصلہ اور خط اور وتر اور دوائر اور بحور وغیرہ۔ فقہاء نے علت اور معلول اور رفع اور التزام اور قیاس اور اجتہاد اور اجماع وغیرہ۔ اور محدثین نے مرفوع اور مرسل اور احاد اور متواتر اور صحیح اور حسن اور ضعیف اور جرح اور تعدیل، اور متکلمین نے عرض اور جوہر اور جز کا کُل اور خبر اور ہیولیٰ وغیرہ کی اصطلاحات وضع کر کے استعمال کی ہیں تاکہ مخاطب کے سامنے اپنے مقصود کو واضح طریق سے بیان کر کے اپنا مدعا اسے سمجھا سکیں۔

لیکن دوسرے اہل فنون کے برعکس صوفیائے کرام نے طریقت کے مسائل اور نکات کے بیان کے لیے جو زبان اور اصطلاحات وضع اور اختیار کی ہیں اس میں ان کے سامنے صرف یہی ایک مقصد نہیں تھا کہ ان مسائل اور نکات کو اچھی طرح سے سمجھا اور بیان کیا جا سکے بلکہ ان کے سامنے یہ مقصد بھی تھا کہ ان باتوں کو جن لوگوں سے چھپانا اور مخفی رکھنا ضروری ہو ان سے ان کو مخفی اور اپنے مطلوب دائرے کے اندر ان کو محدود رکھا جا سکے۔ اس کی ضرورت اس لیے پیش آتی تھی کہ اہل تصوف وطریقت کا تو اصل مشن ہی یہ تھا کہ لوگوں کے اندر اُس حقیقی دینداری اور خدا پرستی کی اصل رُوح کو بیدار اور جاری وساری کیا جائے جو انبیاء علیہم السلام کی دعوت کا اصل مقصود تھا۔ لیکن یہ بات جابر اور ظالم بادشاہوں اور حکمرانوں کو گوارا نہ تھی۔ اس لیے صوفیاء اپنی بات ایسی زبان اور اصطلاحات میں بیان کرتے تھے کہ ان کے اپنے طائفہ کے لوگ تو اس کو اچھی طرح سے سمجھ لیں۔ لیکن اگر یہ بات ان کے حلقہ سے باہر جائے تو دوسرے اس سلسلہ کے بھید کو نہ پا سکیں۔[1]

گویا اہل تصوف کے مختلف گروہوں کی اصطلاحات اس علم وفن کی محض علمی وفنی اصطلاحات ہی نہیں ہیں بلکہ یہ ان گروہوں کی مخصوص زبان (Code) بھی ہے جس کے ذریعے وہ ایک دوسرے کو پہچانتے اور اپنے مشن کو ایک دوسرے تک پہنچاتے تھے۔

اب یہاں ان اصطلاحات کی وضاحت اور تشریح کی جاتی ہے جو اہل تصوف کے مختلف گروہوں نے اپنے ہاں رائج کیں کیونکہ صوفیاء اور مشائخ رحمہم اللہ کے کلام کو پوری طرح سمجھنا محال ہے۔

”وقت“ اور ”حال“ اور اُن کا فرق

وقت:

”وقت“ صوفیاء کرام کے گروہ کی مشہور اصطلاح ہے۔ اس سے مراد وہ وقت ہے جب کہ بندہ اپنے رب کے ساتھ وصل کے محل (ملاقات کی حالت) میں ہوتا ہے، اُس کی اپنی ہستی سمیت دنیا ومافیہا سب اس سے گم ہوتے ہیں، ماضی ومستقبل اور حال سب سے وہ فارغ ہوتا ہے اور

[1] اسی سے یہ بات بھی سمجھ میں آجاتی ہے کہ مختلف بزرگوں اور گروہوں نے ایک ہی مفہوم کے لیے مختلف اصطلاحات کیوں اختیار کیں۔ (مرتب)۔

اپنے اختیار وارادہ سے کلیۃً دست بردار ہو کر وہ اپنے آپ کو اپنے رب کی مرضی اور اس کے امر وارادہ میں گم کر دیتا ہے۔ کشف (اسرار الٰہی اور حقیقت حال کا انکشاف) اسی حالت میں ہوتا ہے۔ یہ بندے کے لیے ایسی بے مثل مسرت اور اطمینان کی حالت ہے کہ اس کے بدلے وہ کسی دوسری چیز کو بخوشی قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ معراج کی رات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آسمانوں اور زمینوں کی بادشاہی کو مزین کر کے پیش کیا گیا لیکن آپ ؐ نے اُس کی طرف کچھ بھی التفات نہ فرمایا۔ اور حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: "میں نے ایک درویش کو جنگل میں دیکھا کہ ایک کیکر کے درخت کے نیچے نہایت سخت وناہموار جگہ پر بہت تکلیف کی حالت میں بیٹھا ہے۔ میں نے دریافت کیا، برادر! یہاں اس حال میں کیوں بیٹھا ہے؟ اس نے جواب دیا، مجھے خداوند تعالیٰ کی بارگاہ میں "وقت" حاصل ہوا تھا جسے میں نے یہاں کھو دیا، اس کے بعد سے یہیں بیٹھا ہوں۔ میں نے دریافت کیا کہ تو یہاں کب سے بیٹھا ہے؟ اس نے کہا کہ بارہ سال ہو گئے ہیں، پھر وہ وقت حاصل نہیں ہوا۔ میرے لیے دعا فرمایئے۔ حضرت جنیدؒ فرماتے ہیں کہ میں حج کے لیے گیا اور میں نے وہاں اس کے لیے دعا کی جو اللہ تعالیٰ نے قبول فرمائی اور اس شخص نے اپنی مراد پائی۔ لیکن جب میں واپس آیا تو وہ شخص اسی جگہ بیٹھا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا: اے جوان! اپنا مقصود پا لینے کے بعد اب کیوں یہاں بیٹھا ہے؟ اس نے جواب دیا کہ: جس جگہ میں نے اپنی گم کردہ متاع کو پایا اس کو کیسے چھوڑ دوں۔ اب تو میں اپنی خاک کو اسی خاک میں ملاؤں گا تاکہ قیامت کے روز اسی خاک سے اپنا سر نکالوں۔

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اہل اللہ کے نزدیک "وقت" کیا شے ہے اور مہاجر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم مکہ معظمہ کے فراق میں کیوں آنسو بہایا کرتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ انھوں نے جو کچھ پایا تھا مکہ ہی کی گلیوں میں پایا تھا۔ گویا انھیں "وقت" مکہ میں نصیب ہوا تھا۔

حال:

"حال" وہ عملی حالت ہے جو، اگر بندہ اسے خدا کی طرف سے عطا کردہ "وقت" کی قدر پہچانے تو اس پر لازماً طاری ہوتی ہے۔ گویا "حال" بندے پر "وقت" کے دوران وارد ہونے والی شے ہے۔ اور "وقت" کو قیام اور استحکام "حال" ہی سے حاصل ہوتا ہے۔ جب تک "حال" قائم

رہے گا وہ تمام زمانہ ''وقت'' ہوگا۔ اور اگر ''حال'' وارد نہ ہوگا تو ''وقت'' ضائع ہو جائے گا۔ یہ صورت، ہوسکتا ہے کہ بندے کی اُخروی ہلاکت پر منتج ہو۔ اور وہ راندۂ درگاہ قرار پا جائے۔ کیوں کہ مالکِ کائنات نے تو اُس کی اس درجہ توقیر فرمائی کہ اسے اپنی بارگاہ میں حضور کا وقت عطا فرمایا لیکن اُس نے اس کی قدر نہ کی۔ اسی لیے مشائخ رحمہم اللہ علیہم فرماتے ہیں: ''اَلْوَقْتُ سَیْفٌ قَاطِعٌ اِمَّا ھَلَکَ وَاِمَّا مَلَکَ، یعنی وقت دودھاری تلوار ہے، ہوسکتا ہے کہ آدمی کو بادشاہ بنادے اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اسے ہلاک کردے۔'' یعنی اگر اس نے ''وقت'' کی قدر کی اور اس سے فائدہ اٹھایا تو وہ اللہ کے قرب وولایت سے بہرہ ور ہوسکتا ہے اور اگر اس نے اسے ضائع کر دیا تو وہ راندۂ بارگاہ قرار پاسکتا ہے۔[1]

صاحبِ حال آدمی کو کائنات کی ہر شے میں حق وصداقت اور ہر طرف معرفتِ الٰہی کے آثار نظر آتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُسی سورج، چاند اور ستاروں کو جن کو ان کی ساری قوم پوج رہی تھی، جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دیکھا تو انھیں ان میں حق ہی کا جلوہ نظر آیا۔ اور انھوں نے واشگاف فرمادیا: ''یٰقَوْمِ اِنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِکُوْنَ (۶:۷۸) یعنی اے برادرانِ قوم! میں ان سب سے بیزار ہوں جن کو تم خدا کا شریک ٹھہراتے ہو۔''

یاد رہے کہ صاحبِ حال آدمی لوگوں پر اپنی بزرگی اور ولایت کی دھونس نہیں جماتا پھرتا۔ ایسے شخص کی پوری زندگی اور اس کے تمام اعمال وحرکات زبانِ حال سے اس بات پر گواہ ہوتے ہیں کہ وہ کس قافلے کا فرد اور کس منزل کا راہی ہے۔ چنانچہ بزرگوں کا ارشاد ہے: اَلْحَالُ سُکُوْتُ اللِّسَانِ فِیْ فُنُوْنِ الْبَیَانِ یعنی صاحبِ حال کی زبان اپنے واردات کے بیان سے خاموش ہوگی۔ البتہ اس کا حال اللہ تعالیٰ سے اس کے تعلق کا شاہد ہوگا۔

''مقام'' اور ''تمکین''

مقام:

حق کے مریدوں (خدا کی راہ کے مسافروں) میں سے ہر ایک کا اپنا ایک مقام ہوتا ہے جو

[1] اسی بات کو حضرت مسیح علیہ السلام نے اس طرح بیان فرمایا کہ جو شخص ایک پیسے میں چور ثابت ہوگا اس کے سپرد ایک لاکھ کی امانت نہیں کی جائے گی۔ (مرتب)

اس کی نیت کی صحت واخلاص، فہم واجتہاد کی بلندی اور خدا کے حقوق کی ادائیگی کے لیے اس کی کمر بستگی اور ذوق وشوق کے لحاظ سے متعین ہوتا ہے۔ پھر جس قدر آدمی اپنی نیت کی صحت واخلاص اور خدا کے حقوق کی ادائیگی کے لیے اپنی کمر بستگی اور ذوق وشوق میں بڑھتا جائے گا، اللہ کی بارگاہ میں اس کا مقام بلند ہوتا جائے گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ مِّمَّا عَمِلُوْا ط وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ (۱۳۲:۶)۔ یعنی ہر شخص کے لیے (ہماری بارگاہ میں) ایک درجہ اور مقام مقرر ہے جو اس کے عمل کے لحاظ سے مقرر ہوتا ہے اور تمھارا رب لوگوں کے اعمال سے بے خبر نہیں ہے۔''

بندوں ہی کا نہیں خدا کی بارگاہ میں ہر فرشتے کا بھی ایک مقرر مقام ہے ''وَمَا مِنَّا اِلَّا لَهٗ مَقَامٌ مَّعْلُوْمٌ (۱۶۴:۳۷) یعنی ہم (فرشتوں) میں سے کوئی ایسا نہیں ہے جس کا خداوند تعالیٰ کی بارگاہ میں ایک مقام مقرر نہ ہو۔''

تمکین:

''تمکین'' بندے کے لیے خدا کی جناب میں بلند ترین اور کمال کا درجہ ہے۔ ''اہل مقامات'' سارے ''مقامات'' طے کر لینے کے بعد ''تمکین'' کے درجہ میں پہنچتے ہیں۔ گویا ''تمکین'' منتہیوں کی قرارگاہ ہے۔ اور ''مقامات'' ''تمکین'' کی راہ کی درمیانی منزلیں ہیں۔ جو شخص ہر قسم کے تذبذب وتزلزل سے پاک ہو کر کامل یکسوئی کے ساتھ خدا کے دوستوں کے ساتھ قرار پکڑ لیتا ہے اسے تمکین کا درجہ حاصل ہو جاتا ہے۔ اللہ عزّ وجل نے فرمایا: ''اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَ جَاهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ط اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ٥ (۱۵:۴۹) اصل مومن صرف وہ ہیں جو اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان لائے اور پھر ڈگمگائے نہیں اور خدا کی راہ میں اپنے مالوں اور جانوں سے جہاد کیا۔ ایسے لوگ ہیں صادق العہد''۔ ایک شیخ فرماتے ہیں: ''اَلتَّمْكِيْنُ رَفْعُ التَّلْوِيْنِ یعنی ''تمکین'' ہر قسم کے تزلزل وتغیر سے بالاتر ہو جانا ہے۔''

''محاضرہ'' اور ''مکاشفہ''

محاضرہ:

''محاضرہ'' حضورِ دل کو کہتے ہیں۔ یعنی آدمی کی کیفیت یہ ہو کہ گویا وہ خداوند عزّ وجل کے حضور حاضر ہے۔ یہ وہی چیز ہے جسے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں ارشاد فرمایا ہے کہ: ''اَنْ تَعْبُدَ اللّٰہَ کَاَنَّکَ تَرَاہُ، یعنی تو خدا کی بندگی اس طرح کر کہ گویا تو اسے دیکھ رہا ہے۔'' کیفیت محاضرہ کی علامت بندے کا خداوند تعالیٰ کے افعال اور اس کی آیات میں تفکر کی عادت ہے۔ چنانچہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے حضورِ دل کے ساتھ آسمانوں اور زمین کی بادشاہی پر تامل و تفکر کی نظر ڈالی تو فعل سے صاف فاعل کو پالیا۔ یہاں تک کہ کمالِ معرفت میں فرمایا: ''اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِکِیْنَ (۶:۷۹) یعنی میں نے تو یکسو ہو کر اپنا رُخ اُس ہستی کی طرف کر لیا جس نے زمین اور آسمانوں کو پیدا کیا اور میں ہر گز شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔'' گویا اُس مالکِ ارض وسما کو چھوڑ کر کسی اور کو خدا ماننا اور اس کے آگے سر اطاعت خم کرنا تو درکنار میں تو کسی حیثیت سے بھی کسی اور کو اس کے ساتھ آسمان یا زمین کی خدائی میں شریک تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔

مکاشفہ:

''مکاشفہ'' اسرارِ الٰہی (یعنی اس ظاہری کائنات کے پیچھے کارفرما حقائق) میں سے کسی حقیت کے انکشاف یا بالفاظِ دیگر اس کے بارے میں یقینی علم حاصل ہونے کا نام ہے جو ''محاضرہ'' کی حالت میں تامّل وتفکّر کرنے (مگر بہرحال خدا کی عطا ہی) سے حاصل ہوتا ہے۔ مکاشفہ کی علامت مشائخ رحمہم اللہ نے تحیّر یعنی حیران رہنا بیان کی ہے، جو خداوند تعالیٰ کے جلال اور اس کی عظمت کے احساس وشعور سے اور اسی کی نسبت سے پیدا ہوتا ہے۔ ''مکاشفہ'' کے بعد حجت ودلیل ختم ہو جاتی ہے اور صرف بے چون وچرا اطاعت اور تسلیم کے سوا کچھ باقی نہیں رہتا۔ چنانچہ روایت ہے کہ حضرت ابوسعید خرازؒ اور ابراہیم سعد علویؒ دریا کے کنارے پر جا رہے تھے کہ انھوں

نے خدا کے ایک دوست کو دیکھا۔ انھوں نے اس سے پوچھا: ''خدا کی طرف راستہ کدھر سے جاتا ہے؟'' اس نے کہا کہ خدا کی طرف جانے کے دو راستے ہیں۔ ایک تو عوام کا راستہ ہے اور دوسرا خواص کا۔ انھوں نے کہا براہ کرم اپنے اس ارشاد کی کچھ وضاحت فرمائیے۔ اللہ کے اس دوست نے جواب دیا کہ عوام کا راستہ تو وہی ہے جس پر تو چل رہا ہے کہ دلیل ہی سے بات کو قبول کرتا ہے اور دلیل ہی سے رَد کرتا ہے۔ اور خواص کا راستہ یہ ہے کہ وہ نہ علت کو دیکھتے ہیں اور نہ معلول کو، اور نہ انھیں کسی دلیل و حجت کی ضرورت ہوتی ہے۔ بلکہ جب معلوم ہو جائے کہ بات ''ان'' کی ہے تو بلا چون و چرا سرِ تسلیم خم کر دیتے ہیں۔

''قبض'' اور ''بسط''

جس طرح سے عام طبعی علوم میں ان کے ماہرین پر مختلف کیفیات طاری ہوتی رہتی ہیں کہ کسی وقت تو وہ دقیق سے دقیق اور مشکل ترین مسائل و معاملات کو منٹوں میں سلجھاتے اور حل کرتے چلے جاتے ہیں اور کسی وقت بعض موٹی موٹی باتوں کی طرف بھی اُن کی توجہ نہیں جاتی۔ اسی طرح سے صاحبِ دل لوگوں کا بھی کسی وقت تو یہ حال ہوتا ہے کہ اسرارِ الٰہی ان کے قلب و روح پر بلا کسی خاص کاوش کے کھلتے اور منکشف ہوتے چلے جاتے ہیں اور دل خود ہی خدا کی طرف کھچا چلا جاتا ہے۔ اور کسی وقت خواہش و کاوش کے باوجود نہ دل کی کلی کھِلتی ہے اور نہ روح اِدھر راغب ہوتی ہے۔ اوّل الذکر صورت ''بسط'' کی حالت ہے اور مؤخر الذکر ''قبض'' کی۔ ''بسط'' میں دل مسرور ہوتا ہے اور نفس مقہور و مغلوب۔ اور ''قبض'' میں اس کے برعکس دل مقہور و مغلوب ہوگا اور نفس مسرور۔ چنانچہ حضرت بایزیدؒ فرماتے ہیں: ''قَبْضُ الْقُلُوْبِ فِیْ بَسْطِ النُّفُوْسِ وَبَسْطُ الْقُلُوْبِ فِیْ قَبْضِ النُّفُوْسِ. یعنی نفس بسط کی حالت میں ہو تو قلب قبض کی حالت میں ہوگا۔ اور جب قلب بسط کی حالت میں ہوگا تو نفس قبض کی حالت میں ہوگا۔ ''قبض'' کے معنی سکڑنے اور بند ہونے کے ہیں اور بسط کے معنی کھلنے اور کشادہ و وسیع ہونے کے ہیں۔ قلب پر یہ دونوں حالتیں اگرچہ اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے طاری ہوتی ہیں، لیکن اس کا ارشاد ہے کہ: ''اَللّٰهُ یَجْتَبِیْ اِلَیْهِ مَنْ

يَشَاءُ وَيَهْدِيْ اِلَيْهِ مَنْ يُّنِيْبُ (۴۲:۱۳)۔(اس میں شک نہیں کہ) اللہ کھینچ لیتا ہے طرف اپنی جس کو چاہتا ہے، مگر وہ راہ دکھاتا ہے طرف اپنی اُس شخص کو جو اُس کی طرف رجوع کرتا ہے۔''

''ہیبت'' اور ''اُنس''

''ہیبت'' اور ''اُنس'' خدا کے راستہ کو طے کرنے والوں کی دو حالتیں ہیں۔ ''ہیبت'' اللہ تعالیٰ کے جلال و جبروت سے خوف کی حالت ہے اور ''اُنس'' اس کے جمال اور بے پایاں رحمت اور عنایات کی وجہ سے اس سے محبت و شیفتگی کی حالت ہے۔ مشائخ رحمہم اللہ کے ایک گروہ کے نزدیک ''ہیبت'' عارفوں کا درجہ ہے اور ''اُنس'' مریدوں (خدا کی راہ کے ابتدائی درجہ کے مسافروں) کا درجہ ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ خدا کی معرفت حاصل ہو جانے کے بعد ''ہیبت'' کے سوا کچھ اور ممکن نہیں۔ کیونکہ اللہ کی صفت عظمت ہے اور عظمت سے ''ہیبت'' ہی پیدا ہوتی ہے۔ ''اُنس'' صرف اپنی ہم جنس سے ہوسکتا ہے۔ جب بندہ نہ خدا کا ہم جنس ہے اور نہ ہم شکل تو ''اُنس'' کیسے صورت پذیر ہوگا۔ ہاں خدا کی یاد اور اس کے ذکر سے ''اُنس'' ہوسکتا ہے۔ حضرت ابوبکر شبلیؒ فرماتے ہیں کہ کچھ مدت میں نے گمان کیا کہ میں خدا کی محبت میں خوش ہوں اور اس کے مشاہدہ سے قرار پاتا ہوں، لیکن اب مجھ پر کھلا کہ ''اُنس'' صرف اپنی جنس سے ہوسکتا ہے۔

لیکن میرے (حضرت علی ہجویریؒ کے) شیخ فرماتے ہیں کہ میں اس شخص پر تعجب کرتا ہوں جو یہ کہتا ہے کہ حق تعالیٰ سے ''اُنس'' ممکن نہیں۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ خود اپنے بندوں کو بار بار نہایت محبت بھرے الفاظ میں یاد فرماتا ہے: ''نَبِّئْ عِبَادِیْ اَنِّیْ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ (۱۵:۴۹) یعنی اے نبیؐ! میرے بندوں کو خبر دے دو کہ میں بہت ہی درگزر کرنے والا اور رحیم ہوں۔'' قُلْ یٰعِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰی اَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ ط اِنَّ اللّٰهَ یَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِیْعًا ط (۳۹:۵۳) یعنی اے پیغمبرؐ! لوگوں سے کہہ دو کہ اے میرے بندو! جنھوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے، اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو جاؤ، اللہ تو سارے گناہ معاف کر دیتا ہے۔'' ''وَاِذَا سَاَلَکَ عِبَادِیْ عَنِّیْ فَاِنِّیْ قَرِیْبٌ ط اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ ط

(۱۸۶:۲) یعنی اے نبیؐ! میرے بندے اگر میرے متعلق تم سے پوچھیں تو انھیں بتا کہ میں اُن سے قریب ہی ہوں۔ پکارنے والا جب مجھے پکارتا ہے، میں اس کی پکار سنتا اور جواب دیتا ہوں۔'' نیز فرمایا: ''یٰعِبَادِ لَا خَوْفٌ عَلَیْکُمُ الْیَوْمَ وَلَآ اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ (۶۸:۴۳) یعنی اے میرے بندو! تم پر آج کوئی خوف نہیں اور نہ تمھیں کوئی غم یا افسوس ہوگا۔'' ظاہر ہے کہ جب بندہ خداوند عزّ وجل کی یہ عنایات اور اپنے بندوں کے ساتھ یہ معاملہ دیکھتا ہے تو لامحالہ اس کے دل میں اُنس اور محبت پیدا ہوتے ہیں۔ اُنس اور محبت دوستی کی لازمی علامت ہے اور ہیبت بیگانگی کو ظاہر کرتی ہے۔ منعم سے اُنس پیدا ہوا کرتا ہے نہ کہ خوف اور ہیبت۔

میں علی بن عثمان جلابی کہتا ہوں کہ دونوں گروہ خواہ مخواہ اختلاف میں پڑے ہیں اور ان کا یہ اختلاف محض زاویہ نگاہ کا اختلاف ہے۔ دراصل جو لوگ ''اہل فنا'' ہوتے ہیں وہ ''ہیبت'' کو مقدم رکھتے ہیں اور جو لوگ ''اہل بقا'' ہیں وہ ''اُنس'' کو فضیلت دیتے ہیں۔ بہر حال انسان جب تک انسان ہے وہ کبھی نفس اور اس کی خواہشات پر پوری طرح قابو نہیں پا سکتا اور نہ ان کو فنا کر سکتا ہے۔ اور خواہشاتِ نفس کی طرف میلان کی صورت میں صاحبِ ایمان آدمی پر ہیبت طاری ہونی ہی چاہیے۔ کیوں کہ جب تک خداوند تعالیٰ کے جلال و جبروت اور اس کی عظمت کی ہیبت اس پر نہ طاری ہو، نافرمانی کی طرف بندے کا میلان رُک نہیں سکتا۔ اور دوسری طرف خداوند تعالیٰ کی رضا کی راہ میں پُرخلوص استقامت ممکن ہی نہیں ہے جب تک کہ بندے کو اپنے رب کے ساتھ اُنس نہ ہو۔ اس طرح سے ''ہیبت'' اور ''اُنس'' دونوں ہی ضروری ہیں۔ اور دونوں کا اپنا اپنا محل اور مقام ہے۔

''قہر'' اور ''لطف''

صوفیاء کی اصطلاح میں ''قہر'' سے مراد اپنی مرادوں کو فنا کرنے، نفس کی آرزوؤں کو روکنے اور مشقت اور ریاضت کی زندگی گزارنے کے ہیں۔ اور ''لطف'' سے مراد نعمت و آسائش کی زندگی میں مَن کی مُرادوں کو حاصل کرتے ہوئے خدا کی رضا کی راہ پر چلنا ہے۔ ایک گروہ ''لطف'' کو افضل قرار دیتا ہے اور اپنی تائید میں اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کو پیش کرتا ہے کہ ''اَللّٰہُ لَطِیْفٌ

بِعِبَادِهٖ (۱۹:۴۲) یعنی اللہ اپنے بندوں پر قہر کرنے والا ہے۔'' لیکن یہ ایک مناظرانہ جھگڑا[1] ہے۔ اللہ تعالیٰ جو صورت بندے کے لیے پسند فرمائے اسے اس پر قانع ہونا چاہیے۔ اپنی طرف سے کسی خاص قسم کی زندگی کی خواہش نہیں کرنی چاہیے۔ کیونکہ جو کچھ ہم اپنے لیے پسند کرتے ہیں وہ ہماری بلا ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ اسی کو آزمائش بنا کر ہم پر مسلّط کر دیتا ہے۔ اس لیے میں (علی ہجویری بن عثمان جلابی) اپنے لیے وہی چاہتا ہوں جو خداوند کریم میرے لیے پسند فرماتا ہے۔ چنانچہ حق تعالیٰ نے اس بارے میں مجھے آفت سے بچائے رکھا ہے اور میرے نفس کی شرارتوں سے ہمیشہ میری حفاظت فرمائی ہے۔ اگر وہ مجھے ''قہر'' میں رکھے تو میں ''لطف'' کی خواہش نہیں کرتا اور اگر ''لطف'' میں رکھے تو میں ''قہر'' کی آرزو نہیں کرتا۔ چنانچہ ایک شیخ فرماتے ہیں: ''اِخْتِیَارُ الْحَقِّ لِعَبْدِهٖ مَعَ عِلْمِهٖ لَعَبْدِهٖ خَیْرٌ مِّنْ اِخْتِیَارِ عَبْدِهٖ لِنَفْسِهٖ مَعَ جَهْلِهٖ بِرَبِّهٖ، یعنی اللہ تعالیٰ اپنے بندے کے لیے اپنے علم کے ساتھ جو صورت اختیار فرماتا ہے وہ اس کے بندے کے لیے اس صورت سے بہتر ہوتی ہے جو بندہ خود اپنے لیے اپنے رب سے ناواقفیت کی حالت میں اختیار کرتا ہے۔'' ظاہر بات ہے کہ آدمی اپنے نہایت محدود علم ونظر اور لاتعداد متضاد ومتصادم خواہشات کے ساتھ کبھی بھی اپنے لیے بالکل صحیح صورت نہیں اختیار کر سکتا۔

''نفی'' اور ''اثبات''

اہل تصوف کی زبان میں ''نفی'' کے معنی نفسانی یعنی مذموم اور ناپسندیدہ صفات کو اپنے اندر سے دُور کرنے اور مٹانے کے ہیں اور ''اثبات'' کے معنی اپنے آپ پر حقیقت کو غالب کر کے اپنے اندر خصائل محمودہ کو پیدا و پرورش اور ثبت کرنے کے ہیں۔ نیز ''نفی'' کے معنی اپنے اختیار کی نفی کرنا اور ''اثبات'' کے معنی اللہ تعالیٰ کے اختیار کو ثابت کرنا ہے۔ یعنی بندہ اپنے اختیار سے اللہ تعالیٰ کے حق میں کلیۃً دست بردار ہو جائے۔ اپنے اختیار کو اس طرح سے پاؤں تلے روند ڈالے کہ اللہ کے

[1] یہاں یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ ''قاہر'' کے معنی سخت گیر اور سختی کرنے والے کے نہیں ہیں۔ جیسا کہ صوفیاء کے اس گروہ کے اس استدلال سے ظاہر ہوتا ہے۔ وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ کے معنی ہیں اور وہ اپنے بندوں پر کامل اختیارات رکھتا ہے۔ یعنی ان میں سے کوئی بھی اس کی گرفت سے باہر نہیں اور نہ باہر ہو سکتا ہے۔ (مرتب)

اختیار کے سوا کچھ باقی نہ رہے۔ چنانچہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی یَکُوْنَ ھَوَاہُ تَبَعًا لِمَا جِئْتُ بِہٖ (مشکوۃ شریف، کتاب الایمان) یعنی تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اپنی خواہشِ نفس تک کو بھی اس شے کے تابع نہ کر دے جو میں لے کر آیا ہوں۔''

تفویض الی اللہ اور راضی برضا ہونے سے متعلق حکایات میں آیا ہے کہ ایک درویش دریا میں غرق ہو رہا تھا۔ کنارے پر سے ایک شخص نے پکارا: اے بھائی! میں تیری مدد کروں؟ اس نے کہا کہ نہیں۔ اس شخص نے کہا: تو پھر کیا تو غرق ہونا چاہتا ہے؟ اس نے جواب دیا کہ نہیں۔ اس شخص نے پھر پوچھا کہ عجیب بات ہے کہ نہ تو اپنی جان بچانا چاہتا ہے اور نہ غرق ہونا چاہتا ہے۔ اس نے جواب دیا کہ مجھے نجات و ہلاکت سے کوئی سروکار نہیں۔ میں وہی کچھ چاہتا ہوں جو میرا رب میرے لیے پسند فرمائے۔

''مسامرہ'' اور ''مُحادثہ''

''مسامرہ'' رات کے اوقات میں وہ وقت ہوتا ہے جبکہ بندہ اپنے رب کے ساتھ مشغول ہوتا ہے، اور ''محادثہ'' دن کے اوقات میں وہ وقت ہوتا ہے جب کہ بندہ اپنے رب کے ساتھ ظاہر و باطن میں سوال و جواب کرتا ہے۔ چنانچہ رات کی مناجات کو ''مسامرہ'' کہتے ہیں اور دن کی دعاؤں کو ''محادثہ'' کہا جاتا ہے۔ ''مسامرہ'' کی اصل اور اس کا تعلق حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی معراج سے ہے جو رات کو ہوئی اور جس میں آپؐ نے خداوند تعالیٰ سے راز کی باتیں کیں اور اُس سے راز کی باتیں سنیں۔ اور جب حق تعالیٰ کے جلال و عظمت کے سامنے آپؐ کی زبان بیان سے عاجز ہوئی تو آپؐ نے بے ساختہ کہا: ''لَا اُحْصِیْ ثَنَاءً عَلَیْکَ یعنی میں تیری ثنا بیان کرنے سے قاصر ہوں۔'' ''محادثہ'' کا تعلق اور اس کی اصل حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کوہِ طور پر اللہ تعالیٰ سے ہم کلامی ہے۔

''علم الیقین''، ''حق الیقین'' اور ''عین الیقین''

''علم الیقین'' سے مراد یہ ہے کہ آدمی کو علمی دلائل سے کائنات کے پس پردہ حقیقت کا یقین ہو جائے۔ یہ علماء کا درجہ ہے۔ ''حق الیقین'' اس کے بعد اگلا درجہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ کائنات اور خود آدمی کے اپنے نفس میں حقیقت کے جو آثار اور آیات موجود ہیں ان کے مشاہدہ سے حقیقت کے بارے میں یقین اس قدر پختہ ہو جائے کہ اس کے حق ہونے کے بارے میں کوئی شک یا تردّد باقی نہ رہ جائے اور دل بالکل مطمئن ہو جائے، یہاں تک کہ آدمی کی زندگی اس حقیقت میں فنا کی آئینہ دار ہو اور اس کے ہر عمل و حرکت اور معاملہ میں اس یقین کی شہادت صاف جھلک رہی ہو۔ ''حق الیقین'' خدا کے دوستوں (اولیاء) کا درجہ ہے۔ اس سے آگے اور خاص الخاص درجہ عین الیقین کا ہے۔ اس کا مطلب ایسے یقین کے ہیں جیسے کہ آدمی کو آنکھوں دیکھی چیز کا یقین ہوتا ہے۔ یہ خدا کے عارفوں کا مقام ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ آدمی کا حقیقت کے بارے میں یقین اتنا پختہ ہو کہ اگر حقیقت پر سے پردہ اٹھا دیا جائے تو عارف کے یقین میں کوئی اضافہ نہیں ہوگا۔ اس درجے پر پہنچ جانے کے بعد ہی انبیاء کو نبوت و رسالت کا خلعت عطا ہوتا ہے۔ یہی وہ مقام تھا جس پر پہنچ کر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے نتائج سے بے پرواہ ہو کر دوٹوک اعلان فرما دیا: ''یٰقَوْمِ اِنِّیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ○ اِنِّیْ وَجَّهْتُ وَجْهِیَ لِلَّذِیْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِیْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ○ (۶:۷۸-۷۹) یعنی اے میری قوم کے لوگو! میں ان سب سے بیزاری کا اعلان کرتا ہوں جن کو تم خدا کا شریک ٹھہراتے ہو۔ میں نے بالکل یکسو ہو کر اپنا رُخ اس ہستی کی طرف کر لیا ہے جس نے زمین اور آسمانوں کو پیدا کیا ہے اور میں ہرگز شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔''

''علم'' اور ''معرفت''

''علم'' کے معنی کسی چیز کو جاننے کے ہیں، قطع نظر اس کے کہ وہ ''علم'' اپنے جاننے والے کے عقیدہ وعمل پر کوئی اثر ڈالے یا نہ ڈالے۔ لیکن ''معرفت'' کے معنی اس علم کے اپنے جاننے والے کی زندگی کا ایک جزو لاینفک بن جانے کے ہیں۔ معرفت حاصل ہو جانے کے بعد یہ ناممکن ہے کہ آدمی کے عقیدہ وعمل سے لے کر اس کے عادات وخصائل تک زندگی کا کوئی گوشہ اس کے علم کے تقاضوں کے خلاف ہو۔ گویا ''عالم'' اپنے علم کو اپنی زبان سے بیان کرتا ہے اور ''عارف'' اپنے حال سے۔

''شریعت'' اور ''حقیقت''

بعض لوگ جن میں مشبّہ اور قرامطہ اور مُشبِّعہ اور موسوسان پیش پیش ہیں، کہتے ہیں کہ جس طرح سے تصدیق اور اقرار ایک دوسرے سے علیحدہ دو الگ چیزیں ہیں، اسی طرح سے حقیقت اور شریعت بھی ایک دوسرے سے الگ ہیں۔ اور جب بندے پر حقیقت منکشف ہو جائے تو شریعت کی پابندیاں اُس پر سے اٹھ جاتی ہیں۔ اس کے بعد پھر آدمی کے لیے شریعت کی پابندی اور پیروی کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ لیکن ایسی باتیں کہنے والے لوگ بے دین اور ملحدوں کا گروہ ہیں۔ شریعت اور حقیقت میں سے کسی ایک کا قیام دوسرے کے بغیر نہ روا ہے اور نہ ہی اس سے کوئی فائدہ حاصل ہوسکتا ہے۔ جس طرح سے نہ تو اقرار کے بغیر محض تصدیق ایمان ہوتا ہے اور نہ ہی تصدیق کے بغیر محض اقرار ایمان ہوتا ہے، اسی طرح سے ''حقیقت'' کے بغیر ظاہری اتباع شریعت محض ریا اور نفاق اور ظاہر میں اتباع شریعت کے بغیر دعویٰ حقیقت سراسر زندقہ اور الحاد ہے۔ اقرار اور تصدیق کی طرح سے شریعت اور حقیقت بھی لازم وملزوم اور باہم غیر منفک ہیں۔ کسی ایک کا قیام دوسرے کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ شریعت کی مثال اگر جسم کی ہے تو حقیقت کی مثال اس کے اندر روح کی ہے۔ جس طرح سے روح اور جسم کے اتصال ہی سے انسان وجود

میں آتا ہے اسی طرح سے حقیقت اور شریعت کے باہم اتصال ہی سے دین صورت پذیر ہوتا ہے۔ ''حقیقت'' کا انسانی زندگی میں عملی ظہور ''شریعت'' ہے، اور اعمالِ ''شریعت'' کے اندر باطنی روح اور اخلاص نیت ہی کا نام ''حقیقت'' ہے۔ نہ ''شریعت'' ''حقیقت'' سے الگ کوئی شے ہے اور نہ ''حقیقت'' کا ''شریعت'' سے الگ کوئی وجود ہو سکتا ہے۔ ''شریعت'' کے احکام کو اخلاص، صحتِ نیت اور خدا کی سچی محبت اور اس کے حقیقی خوف کے ساتھ بجا لانے ہی کا نام ''حقیقت'' اور ''تصوف'' ہیں۔[1]

اس سلسلے کی دوسری اصلاحات

الحق:

''الحق'' سے مراد خداوند تعالیٰ کی ذات ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے ناموں (اسماء حسنہ) میں سے ایک نام ہے۔

اَلْحَقِیْقَۃُ:

''الحقیقۃ'' وہ اصل صورتِ واقعہ ہے جو اس کائنات کے پیچھے کارفرما ہے۔ اس کو پانے سے مراد خداوند تعالیٰ کی ذات، اس کی صفات اور اس کے حقوق و اختیارات کا علم اور اُن کی معرفت ہے۔

---

[1] حضرت مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ اپنے مکتوبات میں فرماتے ہیں: ''طریق صوفیاء پر چلنے سے مقصود یہ ہے کہ شرعی معتقدات پر جو ایمان کی حقیقت ہیں، یقین محکم حاصل ہو جائے اور فقہی احکام کے ادا کرنے میں آسانی میسر ہو نہ کہ اس کے سوا کچھ اور۔ کیونکہ رویت (خداوند تعالیٰ کے دیدار و مشاہدہ) کا وعدہ آخرت میں ہے۔ یہ دنیا میں واقع نہیں ہوگا۔ جن مشاہدات اور تجلیات سے صوفی حضرات خوش ہیں وہ محض شبہ اور مثال سے تسلی حاصل کرتے ہیں۔ ورنہ حق تعالیٰ (انسانی حواس سے) وراء الوراء ہے۔'' (مکتوب ۲۰۷۔ دفتر اول)

اور مکتوبات کے دوسرے دفتر کے پہلے مکتوب میں اس بات کو واضح فرماتے ہوئے کہ خداوند اقدس پر ایمان بالغیب لائے بغیر چارہ نہیں مشاہدۂ حق تعالیٰ کے اس دنیا میں ناممکن ہونے پر زور دیتے ہوئے فرماتے ہیں: ''حق تعالیٰ تمام اسماء و صفات..... تمام تجلیات و ظہورات، تمام مشاہدات و مکاشفات اور تمام محسوسات و معقولات اور تمام موہومات و متخیلات سے وراء الوراء ثم وراء الوراء ہے۔''

اور تصوف میں حضرت مجدد الف ثانی اور حضرت علی ہجویری رحمہما اللہ سے بڑھ کر کوئی سند نہیں ہے۔ (مرتب)

اَلۡخَطَرَات:

''خطرات'' وہ آفات اور وسوسے ہیں جو خدا کی راہ پر چلتے ہوئے سالک کے دل میں لاحق اور اس پر حملہ آور ہوتے ہیں۔

اَلۡوَطَنَات:

''الحقیقۃ'' کے علم اور اسرار الٰہی میں سے جو چیزیں سالک کے دل میں ٹھہراؤ اور قیام اختیار کر لیتی ہیں ان کو ''وطنات'' کہتے ہیں۔

اَلۡعَلَائِق:

''علائق'' وہ اسباب ہیں جن سے تعلق میں مشغولیت کی وجہ سے خدا کی راہ کا مسافر (سالک) اپنی مراد کو پہنچنے سے باز رہتا ہے۔ اس میں وہ سب کچھ شامل ہے جو آدمی کی توجہ کو خدا سے ہٹا کر اپنی طرف کھینچے۔

اَلۡوَسَائِط:

یہ ''واسطہ'' کی جمع ہے۔ اس سے مراد وہ ذرائع ہیں جن سے سالک اپنی مراد کو حاصل کر سکتا ہے۔ ''وسائط'' اور امر الٰہی کی اخلاصِ دل اور صحتِ نیت کے ساتھ پیروی اور منہیات سے صدق دل کے ساتھ اجتناب[1] ہے۔

اَلزَّوَائِد:

''زوائد'' سے مراد نوافل و مستحبات ہیں۔ فرائض و سنن کی ادائیگی کے بعد آدمی نوافل

---

[1] یہ دراصل وہی چیز ہے جس کے لیے قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ نے ''وسیلہ'' کی اصطلاح استعمال فرمائی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَ ابۡتَغُوۡۤا اِلَیۡهِ الۡوَسِیۡلَةَ وَ جَاهِدُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِهٖ (۵:۳۵) یعنی اے ایمان لانے والو! اللہ سے ڈرو اور اس کی بارگاہ میں باریابی کا ذریعہ تلاش کرو اور اس کی راہ میں مجاہدہ کرو۔ ''وسیلہ'' سے مراد ہر وہ ذریعہ ہے جس سے بندہ اللہ کا تقرب حاصل کر سکے اور اس کی رضا کو پہنچ سکے۔ اور اللہ کی راہ میں مجاہدہ کرنے کے معنی یہ ہیں کہ جو قوتیں اللہ کی راہ میں مزاحم ہوں، جو آدمی کو خدا کی مرضی کے مطابق چلنے سے روکتی یا اس کی راہ سے ہٹانے کی کوشش کرتی ہوں اور خدا کے بجائے اپنا یا اس کے سوا کسی اور کا بندہ بن کر رہنے پر مجبور کرتی ہوں، ان کے خلاف اپنی پوری طاقت اور سارے ذرائع سے کشاکش اور جدوجہد کی جائے۔

مستحبات کا جس قدر اہتمام کرے گا اسی قدر زیادہ اس کا قلب انوار الٰہی کا مسکن بنے گا اور خدا کا تقرب اسے حاصل ہوگا۔

اَلْمَلْجَاء اور اَلْمَنْجَاء:

ملجاء سے مراد وہ جگہ یا ہستی ہے جہاں آدمی بچاؤ کے لیے پناہ لے۔ اور اس پر بھروسہ کر کے اپنے آپ کو اس کے سپرد کردے۔ منجاء سے مراد وہ جگہ یا وہ ہستی ہے جہاں آدمی آفتوں سے نجات اور خلاصی پائے۔ اور ظاہر ہے کہ سالک کے نزدیک یہ دونوں حیثیتیں خداوند تعالیٰ کی ہیں۔ وہی اس کا ''ملجا'' ہے اور وہی اس کا ''منجا'' ہے۔

اَللَّوَامِع اور اَلطَّوَالِع:

''لوامع'' دل پر روشنی کے ظاہر ہونے کو کہتے ہیں اور ''طوالع'' دل پر معارف کے طلوع ہونے کو کہتے ہیں۔ یعنی معرفت کے درجہ سے نچلا درجہ لوامع کا ہے اور لوامع سے اگلا درجہ طوالع کا ہے۔

اَلطَّوَارِق:

رات کو مناجات کے دوران کسی بشارت یا ڈانٹ کے نزول وظہور کو ''طوارق'' کا نام دیا گیا ہے۔

اَلْوَارِد:

امور الٰہی میں سے کسی امر کی حقیقت اور اس کے معنی کے دل میں گھس جانے کو ''الوارد'' کہتے ہیں۔ یعنی وہ شے جو وارد ہوئی۔

اَلْاِنْتِبَاہ:

الانتباہ ہر وہ چیز ہے جس سے دل کی غفلت زائل ہو جائے اور آدمی سنبھلنے کی طرف متوجہ ہو جائے۔ یا وہ اس طرف متوجہ ہو سکتا ہو، اگر وہ ایسا کرنا چاہے۔

اَلْاِشْتِبَاہ:

حق اور باطل کے درمیان مذبذب ومشتبہ ہونے کی حالت کو''الاشتباہ'' کہتے ہیں۔ دینی لحاظ سے یہ ایک خطرناک صورت ہے۔ قرآن مجید میں ایسے لوگوں کے بارے میں ارشاد ہے: ''مُذَبْذَبِیْنَ بَیْنَ ذَالِکَ لَآ اِلٰی هٰٓؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰی هٰٓؤُلَآءِ ط وَمَنْ یُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَلَهٗ سَبِیْلًا. (۴:۱۴۳) یعنی یہ دونوں (کفر وایمان) کے درمیان ڈانواں ڈول ہیں۔ نہ پورے اس طرف نہ پورے اُس طرف۔ جسے اللہ نے بھٹکا دیا ہو اُس کے لیے تم کوئی راستہ نہیں پا سکتے۔''

اَلْقَرَارُ:

''القرار'' کے معنی حقیقتِ حال کے بارے میں تردّد کو دُور کرنے اور اس بارے میں جماؤ اور سکون حاصل کرنے کے ہیں۔ یعنی اس سے مقصود یہ ہے کہ تزلزل وتذبذب کو رفع کر کے قرار حاصل کیا جائے۔

اَلْاِنْزِعَاجُ:

جب آدمی ہوتو توحید کی حالت میں لیکن اس کے باوجود بے چین و بے قرار ہو تو اس کی اس حالت کو''انزعاج'' کی اصطلاح سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس کے لغوی معنی بیقراری و بے چینی کے ہیں۔

اصطلاحات جو اہل طریقت توحید کے بیان ووضاحت کے لیے استعمال کرتے ہیں

اَلْعَالَمُ:

عالم سے مراد خداوند تعالیٰ کے سوا ساری موجودات ہے اور یہ سب اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے اس کو پھر دو حصوں میں تقسیم کرتے ہیں: ایک عالَم عُلوی یا عالَمِ بالا اور دوسرا عالَمِ سفلی یعنی یہ دنیا۔

اَلْقَدِیْم:

وہ جو اتنا اور ایسے پہلے سے ہو کہ ہمیشہ سے موجود ہو۔ جس کی ہستی سب ہستیوں سے پہلے موجود رہی ہو۔ ''قدیم'' اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔ اسی کی ذات مبارک ہے جو ہمیشہ سے موجود ہے۔

اَلْمُحْدَث:

وہ جو پہلے موجود نہیں تھا اور پھر وجود میں آیا۔ عالَم سب کا سب مُحْدَث ہے۔

اَلْاَزَل:

جس کے لیے ابتدا نہیں ہے۔

اَلْاَبَد:

وہ جس کے لیے انتہا نہیں ہے۔

اَلذَّات:

کسی شے کا وجود، اس کی ہستی اور اس کی حقیقت۔ (Body or Person of a thing or Being)

اَلصِفَۃ:

جو اپنی ذات کے ساتھ موجود نہ ہو اور کسی مخصوص ذات کو قبول نہ کرے (Quality or Attribute) جیسے حُسن، عدل، رَحم وغیرہ۔

اَلشَّیْئَان:

وہ دو چیزیں جن کا وجود ایک ساتھ ممکن بھی ہو اور رَوا بھی یعنی ان کا ساتھ موجود ہونا (Coexist کرنا) ممکن بھی ہو اور جائز بھی۔ جیسے عدل اور رحم۔

اَلضِّدَّان:

وہ دو چیزیں جن میں سے ایک کا وجود دوسری کے وجود کے بقا کے ساتھ نہ ممکن ہی ہو اور نہ رَوا ہو۔ یعنی ایسی دو چیزیں جو ایک دوسری کی ضد ہوں جیسے ریاء اور اخلاص۔

اَلْغَيْرَانِ:

ان چیزوں کو کہتے ہیں جن میں سے ہر ایک کا وجود دوسری کے وجود کی فنا کا متقاضی ہو جیسے سچ اور جھوٹ۔

اَلْجَوْهَرُ:

جوہر سے مراد ایک شے کی وہ اصل ہے جو اپنی ذات سے قائم ہو جیسے رُوح۔

اَلْعَرْض:

عرض وہ ہے جو جوہر کے ساتھ قائم ہو۔ مثلاً آدمی آدمیت کے ساتھ ہی آدمی ہے۔ اس جوہر کو کھو دینے کے بعد وہ محض ایک حیوان ہے۔

اَلْجِسْمُ:

جسم وہ ہے جو اجزائے پراگندہ سے مل کر بنا ہے اوران اجزاء کے منتشر ہو جانے سے ختم ہو جائے۔

اَلسُّوَالُ:

حقیقت معلوم کرنے کی طلب کو "سوال" کہتے ہیں۔

اَلْجَوَابُ:

سوال میں جس بات کو جاننے کی طلب ظاہر کی گئی ہو، اس کی خبر دینے کو جواب کہتے ہیں۔

اَلْحُسْنُ:

حسن وہ ہے جو "امر" کے موافق ہو۔ گویا جو کچھ حق تعالیٰ کے امر اور اس کی رضا کے مطابق ہے وہ حسن ہے اور جو اس کے خلاف ہو وہ بدصورتی ہے۔

اَلْقُبْحُ:

جو چیز "امر" (حکمِ خداوندی) کے خلاف ہو وہ قبح (بدصورت) ہے۔

اَلسَّفَهُ:

امر کے ترک اور اس سے غفلت برتنے کو سفاہت (بیوقوفی اور جہالت) کہتے ہیں۔

اَلظُّلْمُ:

کسی چیز کو اس کی ٹھیک جگہ اور اس کے صحیح مقام پر نہ رکھنے کا نام "ظلم" ہے۔

اَلْعَدْلُ:

کسی چیز کو اس کی جگہ اور اس کے مقام پر رکھنا "عدل" ہے۔

اَلْمَلِكُ:

جس کے حکم اور عمل پر اعتراض نہ کیا جا سکے وہ مَلِک (مقتدرِ اعلیٰ Sovereign) ہے۔

اَلْخَاطِرُ:

خاطر وہ وسوسے اور برے خیالات ہیں جو آدمی کے دل میں آتے اور اس میں گزرتے رہتے ہیں اور ان سے آدمی کو خطرہ لاحق ہو سکتا ہے، لیکن یہ دل میں جگہ نہیں پکڑنے پاتے۔

اَلْوَاقِعُ:

واقع وہ خیال و وسوسہ ہے جو دل میں پیدا ہو اور اس میں بقا پا جائے۔ گویا یہ "خاطر" کے برعکس ہے۔ "خاطر" دل میں تو آتا ہے مگر اس میں جمنے نہیں پاتا۔ اور واقع دل میں داخل ہو کر جم جاتا ہے۔ چنانچہ مشائخ ؒ نے فرمایا کہ "خَطَرَ عَلٰی قَلْبِیْ وَ وَقَعَ فِیْ قَلْبِیْ یعنی "خطرہ" میرے دل پر سے گزرا اور "واقع" میرے دل میں گھر کر گیا۔"

دوسری متفرق اہم اصطلاحات جو صوفیاءؒ استعمال کرتے ہیں

اَلْاِخْتِیَارُ:

''الاختیار'' سے مراد بندے کا اپنے اختیار اور ارادے سے خدا کے اختیار کو اپنے لیے پسند کر لینا ہے۔ اللہ تعالیٰ چاہتا تو اپنے اختیار سے بندے کو بھی دوسری مخلوق کی طرح سے بے اختیار بنا دیتا مگر اس نے ایسا نہیں کیا اور بندے کو اختیار وارادے کی آزادی سے نوازا۔ بندگی واحسان مندی کا تقاضا یہ ہے کہ بندہ اپنے اختیار سے خدا کی رضا کی راہ کو اپنے لیے پسند اور اختیار کرے۔ حضرت ابویزید رحمۃ اللہ علیہ سے لوگوں نے پوچھا کہ ''امین'' کون ہوتا ہے؟ آپؒ نے جواب دیا: امین وہ ہے جس نے اپنا ذاتی اختیار نہ رکھا ہو اور خدا کے اختیار کو کلیۃً اپنے لیے پسند کر لیا ہو۔ حضرت جنید رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں روایت ہے کہ ایک مرتبہ آپ کو بخار آیا تو آپ نے اللہ تعالیٰ سے عرض کیا: ''بارخدایا! مجھے اس سے صحت عطا فرما۔'' آپؒ کے اندر سے آواز آئی کہ: تو کون ہے جو ہمارے ملک میں مداخلت کرتا ہے۔ ہم اپنے ملک کی تدبیر کو تجھ سے بہتر جانتے ہیں۔ تیرا مقام میرے اختیار کو اختیار کرنا ہے، نہ کہ اپنے اختیار کو ہمارے کاموں میں مداخلت کے لیے استعمال کرنا۔

اَلْاِمْتِحَانُ:

''الامتحان'' سے مراد اللہ تبارک وتعالیٰ کا مختلف قسم کی آزمائشیں اور آفتیں بھیج کر اپنے دوستوں کے دل کا امتحان کرنا ہے۔ حق تعالیٰ اپنے دوستوں کا مقام متعین کرنے، خود ان پر اس کو واضح کرنے اور ان کے اندر مزید مراتب کی قابلیت وصلاحیت پرورش کرنے کے لیے مختلف قسم کی آفات کے ذریعے سے اُن کا امتحان کرتے رہتے ہیں۔ چنانچہ ایسے لوگوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ امْتَحَنَ اللّٰہُ قُلُوْبَھُمْ لِلتَّقْوٰی لَھُمْ مَغْفِرَۃٌ وَّاَجْرٌ

عَظِيمٌ (۳:۴۹) یعنی یہ وہ لوگ ہیں جن کے دلوں کو اللہ تعالیٰ نے تقویٰ کے لیے جانچ لیا ہے، ان کے لیے بخشش اور اجرِ عظیم ہے۔'' نیز فرمایا: ''وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ ط وَبَشِّرِ الصَّابِرِيْنَ o (۲:۱۵۵) یعنی ہم ضرور تمھیں خوف وخطر، فاقہ کشی، جان ومال کے نقصانات اور آمدنیوں کے گھاٹے میں مبتلا کر کے تمھاری آزمائش کریں گے۔ ان حالات میں جو لوگ صبر سے کام لیں انھیں خوش خبری دے دو۔''

اَلْبَلَاءُ:

''بلا'' ان مشقتوں، تکالیف اور بیماریوں اور دوسرے مختلف قسم کے عوارض کو کہتے ہیں جن کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کا امتحان فرماتا ہے۔ جس قدر 'بلا' بندہ پر زور پکڑے گی اسی قدر اسے خدا کا قرب حاصل ہوگا۔ ''بلاء'' گویا اولیاء اللہ کا لباس اور صوفیاء کا گہوارہ ہے اور انبیاء کرام علیہم السلام کی غذا ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''نَحْنُ مَعَاشِرُ الْاَنْبِيَاءِ اَشَدُّ النَّاسِ بَلَاءً یعنی ہم جو انبیاؑ کا گروہ ہیں سب سے زیادہ مصائب ہم پر آتے ہیں۔'' نیز فرمایا: ''اَشَدُّ النَّاسِ بَلَاءً اَلْاَنْبِيَاءُ ثُمَّ الْاَوْلِيَاءُ ثُمَّ الْاَمْثَلُ فَالْاَمْثَلُ، یعنی سب لوگوں سے بڑھ کر انبیاء پر بلائیں آتی ہیں، پھر ان سے دوسرے درجہ پر اولیاء پر اور پھر درجہ بدرجہ دوسرے لوگوں پر جو جس حد تک ان کے مثل ہوں۔''

درحقیقت بلا نیکوکاروں پر خدا کی طرف سے نعمت ہوتی ہے۔ اس کا صرف ظاہر تکلیف ومشقت کی صورت رکھتا ہے۔ جب وہ اسے تحمل اور بردباری سے برداشت کرتے ہیں تو اس سے اُن کو ثواب اور خدا کا قرب حاصل ہوتا ہے۔ اس کے برعکس جو مصائب وتکالیف کفار اور خدا کے نافرمانوں پر آتی ہیں وہ بلا نہیں ہوتیں بلکہ وہ ان کی بدبختی اور ان کے لیے سزا کے طور پر آتی ہیں۔

اَلتَّحَلِّیْ:

لغت کی رُو سے تحلّی کے معنی مزیّن وآراستہ ہونے اور زیور پہننے کے ہیں۔ گویا تحلّی ایک ظاہری آرائش کا نام ہے۔ اور اہلِ طریقت کی اصطلاح میں اس سے مراد کسی شخص کا حقیقت سے

قطع نظر کر کے اپنے قول وعمل کو ظاہری طور پر کسی گروہ کے مشابہ بنانا ہے۔ ایسے لوگ دنیا میں بھی بسا اوقات بہت جلد رسوا ہو جاتے ہیں۔ جہاں تک آخرت کا تعلق ہے وہاں تو بہر حال رسوا ہوں گے ہی، حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''لَیْسَ الْاِیْمَانُ بِالتَّحَلِّیْ وَالتَّمَنِّیْ اِلَّا مَا وَقَرَفِی الْقُلُوْبِ وَصَدَّقَ الْعَمَلُ، یعنی ایمان ظاہری آرائش وتزئین اور زبانی تمناؤں کا نام نہیں ہے، جب تک ان چیزوں کی دل میں توقیر نہ پیدا ہو اور عمل اس کی صداقت کی شہادت نہ دے۔''

اَلتَّجَلِّی:

اللہ عزّ وجلّ اپنے مقبول بندوں کے دلوں میں اپنے انوار کا جو اثر ڈالتا ہے اسے تجلی کہتے ہیں۔ اس کا ان پر اثر یہ ہوتا ہے کہ وہ چاہیں تو اپنے دل کی آنکھوں سے حق تعالیٰ کا مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ دل سے مشاہدے اور آنکھ سے دیکھنے میں فرق یہ ہے کہ دل سے مشاہدہ کرنے والا شخص (یعنی متجلّی) اگر دیکھنا چاہے تو دیکھتا ہے اور اگر نہ دیکھنا چاہے تو وہ کچھ نہیں دیکھتا، یا ایک وقت دیکھتا ہے اور دوسرے وقت نہیں دیکھتا۔ رویت عینی (آنکھ سے دیکھنے) کی صورت میں وہ لازماً دیکھے گا، جیسا کہ جنت میں اہل جنت حق تعالیٰ کو دیکھیں گے۔ وہاں یہ نہ ہو سکے گا کہ کوئی نہ دیکھنا چاہے تو نہ دیکھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تجلّی میں حجاب حائل ہو سکتا ہے رویت میں حجاب حائل نہیں ہو سکتا۔[1]

اَلتَّخَلِّیْ:

تَخَلّٰی مِنْهُ وَعَنْهُ کے معنی کسی چیز کو چھوڑنے اور اس سے الگ ہونے کے ہیں۔ اور اہل تصوف کی اصطلاح میں تخلّی سے مراد ان مشغلوں کو ترک کرنا اور ان سے منہ موڑنا ہے جو اللہ تعالیٰ سے بندے کے تعلق توڑنے یا اس سے اسے دور کرنے والے ہوں۔ جیسے علائق دنیا، خواہشات نفس، خدا سے پھرے ہوئے لوگوں کی صحبت وغیرہ۔

---

[1] آنکھوں سے اس زندگی میں حق تعالیٰ کی رویت جیسا کہ اوپر مجدد الف ثانی کے مکتوبات کے حوالہ سے گزر چکا ہے ممکن نہیں ہے۔ یہاں پر تجلیات ہی زیادہ سے زیادہ حاصل ہو سکتی ہیں۔ رویت عینی اہل جنت کو جنت میں حاصل ہوگی۔ (مرتب)

اَلشُّرُوْدُ:

آفتوں اور حجابوں اور بے قراری سے خلاصی پانے کے لیے حق کی جستجو کا نام "شُرُود" ہے۔ مثلاً اس غرض کے لیے سالک کوئی سفر کرتا ہے، کسی محمود چیز سے تعلق جوڑتا ہے یا کسی مذموم شے سے تعلق منقطع کرتا ہے۔ گویا کشفِ حجاب کے لیے سالک جو سعی بھی کرتا ہے وہ سب شُرُود ہیں۔

اَلْقُصُوْد:

"قصود" اپنے مقصود کی طلب میں عزیمت پر قائم ہونا ہے۔

اَلْاِصْطِفَاءُ:

اِصطفٰی کے معنی چن لینے اور برگزیدہ کرنے کے ہیں۔ اصطلاحاً اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ تعالیٰ بندے کے دل کو خاص اپنی معرفت کے لیے فارغ کرتا ہے۔ اس درجہ میں تمام مومن برابر ہیں خواہ خواص ہوں یا عوام اور مطیع وفرمانبردار ہوں یا گناہگار اور اولیاء ہوں یا انبیاء۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: "ثُمَّ اَوْرَثْنَا الْكِتٰبَ الَّذِيْنَ اصْطَفَيْنَا مِنْ عِبَادِنَا فَمِنْهُمْ ظَالِمٌ لِّنَفْسِهٖ وَمِنْهُمْ مُّقْتَصِدٌ وَّمِنْهُمْ سَابِقٌ بِالْخَيْرٰتِ (۳۲:۳۵) یعنی پھر ہم نے ان لوگوں کو کتاب کے وارث بنایا جن کو ہم نے اپنے بندوں میں سے چن لیا تھا۔ پھر ان میں سے بعض اپنے اوپر ظلم کرنے والے ہیں اور کچھ متوسط درجے میں ہیں اور کچھ ایسے بھی ہیں جو بھلائی کے کاموں میں سبقت کرنے والے ہیں۔" گویا جس شخص کو بھی اللہ تعالیٰ نے ایمان کی توفیق دے دی اُسے اس نے اپنے کام کے لیے منتخب کرلیا۔ اب اس کے بعد اس کی اپنی مرضی اور کوشش پر منحصر ہے کہ وہ ظالموں میں شامل ہو یا مقتصد بندوں میں یا سابقین بالخیرات ہیں۔

اَلْاِصْطِلَامُ:

اِصطلام کے معنی جڑ سے اکھاڑنے اور ہلا مارنے کے ہیں۔ اور اہل طریقت کے ہاں "اَلْاِصْطِلَامُ" سے مراد بندے کی وہ حالت ہے جب کہ اللہ تعالیٰ کی تجلیات اسے قہر اور سخت مشقت میں مبتلا کردیتی ہیں۔ یہ خدا کے دوستوں کے امتحان کی صورت ہوتی ہے۔ چنانچہ انبیاء

علیہم السلام اور ان کے ساتھیوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''مَسَّتْهُمُ الْبَاْسَآءُ وَالضَّرَّآءُ وَزُلْزِلُوْا حَتّٰى يَقُوْلَ الرَّسُوْلُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ نَصْرُ اللّٰهِ (۲:۲۱۴) یعنی اُن پر سختیاں گزریں، مصیبتیں آئیں، ہلا مارے گئے، یہاں تک کہ رسولؐ اور اس کے ساتھی اہل ایمان چیخ اُٹھے کہ اللہ کی مدد کب آئے گی۔''

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ''الاصطلام'' اور ''الامتحان'' ہم معنی اصطلاحیں ہیں۔

اَلرَّيْنُ:

انسان کے دل پر کفر اور گمراہی سے جو پردہ اور حجاب پڑ جاتا ہے اسے رَین کہتے ہیں۔ رَین کا علاج اور اس کا کسی دل سے دُور ہونا ایمان کے سوا ممکن نہیں ہے۔ قرآن مجید میں آیا ہے: ''كَلَّا بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ مَّا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ (۸۳:۱۴) یعنی نہیں، اصل بات یہ ہے کہ ان کے اعمالِ بد کی وجہ سے ان کے دلوں پر زنگ بیٹھ گیا ہے۔'' اس سے نجات کی واحد راہ سچی توبہ اور مخلصانہ ایمان ہے۔

اَلْغَيْنُ:

''غین'' بھی دل کا ایک حجاب ہے۔ اور یہ دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک غینِ خفیف اور دوسرا غینِ غلیظ۔ 'غین غلیظ' غفلت میں پڑے ہوئے اور کبائر کا ارتکاب کرنے والے لوگوں کے دلوں کو لاحق ہوتا ہے۔ اس کے لیے توبہ ضروری ہے۔ یعنی یہ کہ گناہ کی زندگی کو ترک کر کے خدا کی فرمانبرداری کی زندگی کو اختیار کیا جائے۔ 'غین خفیف' ہر ایک کے دل کو لاحق ہوتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ اولیاء اور انبیاء بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ خود حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بارے میں فرمایا: ''اِنَّهٗ لَيُغَانُ عَلٰى قَلْبِيْ وَاِنِّيْ لَاَسْتَغْفِرُ اللّٰهَ فِيْ كُلِّ يَوْمٍ مِائَةَ مَرَّةٍ، یعنی واقعہ یہ ہے کہ میرے دل پر بھی غین ڈالا جاتا ہے اور میں روز سو مرتبہ اللہ تعالیٰ سے استغفار کرتا ہوں۔'' گویا غینِ خفیف استغفار اور سچے دل سے خدا کی طرف رجوع کرنے سے دُور ہو جاتا ہے۔

اَلتَّلْبِيْسُ:

''تلبیس'' کے معنی مشتبہ کرنے اور مشکل بنانے کے ہیں۔ چنانچہ خداوند تعالیٰ نے فرمایا:

''وَلَلَبَسْنَا عَلَيْهِمْ مَّا يَلْبِسُوْنَ (۹:٦) یعنی اور اس طرح انھیں اسی شبہ میں مبتلا کر دیتے جس میں یہ اب پڑے ہوئے ہیں۔''

صوفیاء کرام کی اصطلاح میں ''تلبیس'' مخلوق خدا کو کوئی چیز اس کی اصل حقیقت کے خلاف دکھانے کو کہتے ہیں۔ خواہ یہ عمدہ خصلتوں کو بری صفات میں پوشیدہ کر کے پیش کرنے کی صورت میں ہو یا بری خصلتوں کو عمدہ صفات کی شکل میں پیش کرنے کی صورت میں، اور خواہ نعمت کو مصیبت بنا کر دکھایا جائے یا اس کے برعکس۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم دعا فرمایا کرتے تھے: ''اَللّٰھُمَّ اَرِنَا حَقَائِقَ کُلِّ الْاَشْیَاءِ کَمَا ھِیَ، یعنی اے اللہ! ہمیں تمام اشیاء کو اُن کی اُس اصل حقیقت کے مطابق دکھا جو کہ ان کی فی الواقع ہے۔''

اَلشُّرْبُ:

اللہ تعالیٰ کی فرماں برداری میں جو مٹھاس اور اُس سے اُنس میں جو راحت اور لذت ہے اسے صوفیاء کرم ''شُرب'' کہتے ہیں۔ اور حقیقت یہ ہے کہ کوئی شخص شُرب کی لذت کے بغیر زیادہ عرصہ تک خدا کی بندگی کا کام نہیں کر سکتا۔ جس طرح سے جسم پانی سے سیراب ہو کر لطف اندوز ہوتا ہے اس سے بڑھ کر مومن کا دل اطاعتِ الٰہی کی حلاوت اور اس سے حاصل ہونے والی راحت سے لذّت اور لطف پاتا ہے۔

اَلذَّوْقُ:

''ذوق'' بھی شُرب ہی کی قبیل سے اور اس کا ہم معنی ہے۔ دونوں میں فرق یہ ہے کہ شُرب کا اطلاق صرف راحتوں اور لذتوں پر ہوتا ہے اور ''ذوق'' راحت اور تکلیف دونوں پر محیط ہے۔ اور یہ حلاوت، راحت اور بلاء سب کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ جیسے ذُقْتُ الْحَلَاوَةَ وَذُقْتُ الْبَلَاءَ وَذُقْتُ الرَّاحَةَ سب درست ہیں۔ یعنی میں نے حلاوت کا مزہ چکھا اور میں نے مصیبت کا مزہ چکھا اور میں نے راحت کا مزہ چکھا۔ محبوب کی خاطر سے مشقت اور دکھ اٹھانے کی لذت کسی بڑی سے بڑی راحت کے لطف سے کسی طرح کم نہیں ہے۔ دیکھیے، ایک عام آدمی اپنی اولاد کے لیے کس قدر مزے اور شوق کے ساتھ بڑے سے بڑے دکھ اٹھاتا ہے۔

گیارھواں کشف الحجاب:

سماع کے بارے میں

سماع کی حقیقت اور اہمیت:

اللہ تعالیٰ نے انسان کو علم حاصل کرنے کے پانچ ذرائع عطا فرمائے ہیں: بصر (دیکھنے کی قوت)، سَمع (سننے کی قوت)، ذائقہ (چکھنے کی قوت)، شامّہ (سونگھنے کی قوت) اور لامسہ (چھونے کی قوت)۔ دیکھنے کا کام انسان صرف آنکھوں سے، سننے کا کام صرف کانوں سے، چکھنے اور ذائقہ معلوم کرنے کا کام صرف زبان سے اور سونگھنے کا کام صرف ناک سے لے سکتا ہے۔ لیکن نرم اور سخت اور سرد اور گرم معلوم کرنے (چھونے) کی حِس اُس کے سارے جسم میں رکھ دی گئی ہے۔ جس طرح سے دیکھنے، سونگھنے، چکھنے اور چھونے کی قوتوں کے استعمال کے جائز یا ناجائز اور مباح یا مکروہ ہونے کا انحصار اس بات پر ہے کہ ان کو کہاں، کس طرح اور کس نیت سے استعمال کیا گیا، اسی طرح سے قوتِ سمع (یا سماع) کے جائز اور ناجائز اور مباح یا مکروہ ہونے کا انحصار اس پر ہے کہ کس چیز کا سماع کیا اور کس حالت اور کس نیت وارادے سے ایسا کیا۔ پس مجرد ''سماع'' پر کوئی حکم نہیں لگایا جائے گا۔ جو حکم بھی لگایا جائے گا وہ شے مسموع (سنی جانے والی شے) اور سننے والے کی نیت، حالت اور کیفیت سب کو سامنے رکھ کر لگایا جائے گا۔

حقیقت یہ ہے کہ علم کا سب سے وسیع اور مؤثر ذریعہ ''سماع'' ہی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اہل سنت کان کو آنکھ پر فضیلت دیتے ہیں۔ اس لیے کہ آدمی سن کر ہی ایمان لاتا ہے اور رسولوں کی اطاعت بھی اس پر ان کی دعوت سے روشناس ہونے کے بعد واجب ہوتی ہے اور اس روشناسی کا ذریعہ بھی سماعت ہی ہے۔

سماع کی اقسام:

بندے کے لیے بعض چیزوں کا سماع (سننا) فرض وواجب ہے۔ بعض کا پسندیدہ، بعض کا مباح اور بعض کا سماع حرام ہے اور بعض کا مکروہ وناپسندیدہ۔

جن چیزوں کا سماع فرض ہے

قرآن مجید اور تعلیماتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا سماع (سننا) بندے کے لیے فرض ہے۔ تمام انسان اور بالخصوص وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں (خواہ مطیع فرمان ہوں یا نافرمان) سب اس امر پر مامور اور مکلف ہیں کہ ان کو خاموشی اور توجہ سے سنیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ o (۷:۲۰۴) یعنی جب قرآن تمھارے سامنے پڑھا جائے تو اسے توجہ سے سنو اور خاموش رہو۔ شاید کہ تم پر بھی رحمت ہو جائے۔'' پھر فرمایا: ''فَبَشِّرْ عِبَادِهِ الَّذِيْنَ يَسْتَمِعُوْنَ الْقَوْلَ فَيَتَّبِعُوْنَ اَحْسَنَهٗ ط اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ هَدٰهُمُ اللّٰهُ وَاُولٰٓئِكَ هُمْ اُولُو الْاَلْبَابِ o (۳۹:۱۸،۱۷) یعنی میرے جو بندے بات کو توجہ سے کان لگا کر سنتے ہیں اور اس کے بہترین پہلو کی پیروی کرتے ہیں اُن کو خوشخبری سنادو۔ یہی ہیں وہ لوگ جن کو اللہ نے راہِ راست دکھائی ہے اور یہی لوگ دانش مند ہیں۔'' یہ بھی فرمایا: ''اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِيْمَانًا (۲:۸) یعنی اُن لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جنھوں نے کہا کہ ہم نے سنا حالانکہ وہ نہیں سنتے۔'' اس طرح کے لوگوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے یہ خبر دی ہے کہ قیامت کے روز وہ حسرت کے ساتھ کہیں گے: ''لَوْ كُنَّا نَسْمَعُ اَوْ نَعْقِلُ مَا كُنَّا فِيْ اَصْحٰبِ السَّعِيْرِ (۶۷:۱۰) یعنی اے کاش! ہم نے خدا کی نازل کردہ تعلیم کو سنا ہوتا یا کچھ عقل سے کام لیا ہوتا تو ہم اہلِ دوزخ میں شامل نہ ہوتے۔''

حدیث میں آیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ بن مسعودؓ سے فرمایا: ''اِقْرَاْ عَلَیَّ

فَقَالَ اَنَا اَقْرَءُ هٗ عَلَيْكَ وَعَلَيْكَ اُنْزِلَ فَقَالَ عَلَيْهِ السَّلَامُ اِنِّیْ اُحِبُّ اَنْ اَسْمَعَهٗ مِنْ غَیْرِیْ یعنی آپؐ نے ابن مسعودؓ سے فرمایا: مجھے قرآن سناؤ۔ عبداللہ بن مسعودؓ نے عرض کیا: میں آپ کو قرآن سناؤں؟ حالانکہ آپؐ پر قرآن نازل ہوا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہاں بے شک یہ مجھ پر نازل ہوا ہے لیکن مجھے یہ زیادہ محبوب ہے کہ اسے دوسرے سے سنوں۔'' چنانچہ اس حدیث سے بعض بزرگوں نے یہ بات اخذ کی ہے کہ قرآن مجید کی قرأت سے اس کا سماع زیادہ فضیلت اور کمال رکھتا ہے۔ کیونکہ ایک تو نطق میں ایک طرح کا تکبر پایا جاتا ہے اور سننے میں تواضع اور انکساری پائی جاتی ہے اور دوسرے قاری کے بارے میں نہیں کہا جا سکتا کہ وہ اپنے حال سے پڑھ رہا ہے یا دوسرے کی فرمائش وطلب پر۔ مگر سماعت کی طلب کرنے والا بجز حال اور طلب سماع کے نہیں سنتا۔ قرآن مجید کے سماع کی فضیلت درج ذیل واقعہ سے بھی ظاہر ہے:۔

حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے:

كُنْتُ فِیْ عَصَابَةٍ فِیْهَا ضُعَفَاءُ الْمُهَاجِرِیْنَ وَ اِنَّ بَعْضَهُمْ یَسْتُرُ بَعْضًا مِّنَ الْعُرٰی وَقَارِیٌ یَقْرَءُ عَلَیْنَا وَنَحْنُ نَسْتَمِعُ الْقِرَاْۃَ قَالَ فَجَاءَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ حَتّٰی قَامَ عَلَیْنَا فَلَمَّا رَاٰهُ الْقَارِیُ سَكَتَ، قَالَ فَسَلَّمَ، فَقَالَ مَاذَا كُنْتُمْ تَصْنَعُوْنَ؟ قُلْنَا كَانَ قَارِیٌ یَقْرَاءُ عَلَیْنَا وَنَحْنُ نَسْتَمِعُ بِقِرَاْتِهٖ، فَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ جَعَلَ فِیْ اُمَّتِیْ مَنْ اُمِرْتُ اَنْ اَصْبِرَ نَفْسِیْ مَعَهُمْ، قَالَ ثُمَّ جَلَسَ وَسْطَنَا لِیَعْدِلَ نَفْسَهٗ فِیْنَا، ثُمَّ قَالَ بِیَدِهٖ هٰكَذَا فَتَحَلَّقَ الْقَوْمُ فَلَمْ یَعْرِفْ رَسُوْلَ اللّٰهِ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ مِنْهُمْ اَحَدٌ، قَالَ فَكَانُوْا ضُعَفَاءُ الْمُهَاجِرِیْنَ فَقَالَ النَّبِیُّ صَلَّی اللّٰهُ عَلَیْهِ وَسَلَّمَ اَبْشِرُوْا صَعَالِیْكَ الْمُهَاجِرِیْنَ بِالْفَوْزِ التَّامِ یَوْمَ الْقِیَامَةِ تَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ قَبْلَ اَغْنِیَاءِ كُمْ بِنِصْفِ یَوْمٍ كَانَ مِقْدَارُهٗ خَمْسُ مِائَةِ عَامٍ.

''میں غریب مہاجرین کی ایک جماعت میں بیٹھا تھا جن کے پاس ستر چھپانے کے لیے بھی کافی کپڑے نہ تھے۔ وہ ایک دوسرے کو عریاں ہونے سے بچائے بیٹھے تھے اور ایک قاری ہمیں قرآن مجید سنا رہا تھا اور ہم سب سن رہے تھے۔ ابوسعید خدریؓ کہتے ہیں کہ اتنے میں رسول اللہ صلی

اللہ علیہ وسلم تشریف لائے یہاں تک کہ بالکل ہمارے سر پر آ کر کھڑے ہوئے۔ جب قاری نے آپ کو دیکھا تو وہ خاموش ہو گیا۔ ابو سعید خدریؓ کہتے ہیں کہ حضورؐ نے ہمیں سلام علیکم کہا اور پوچھا کہ تم لوگ کیا کر رہے تھے؟ ہم نے عرض کیا، قاری قرآن مجید پڑھ کر سنا رہا تھا اور ہم سن رہے تھے۔ یہ سن کر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: شکر ہے اس خدا کا جس نے میری امت میں ایسے لوگ پیدا کیے کہ مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں اپنے آپ کو ان میں شامل کروں۔ ابو سعید خدریؓ کہتے ہیں کہ پھر حضورؐ ہمارے درمیان میں اس طرح سے بیٹھ گئے کہ گویا ہم ہی میں سے ہماری طرح کے ایک شخص ہیں۔ پھر آپؐ نے ہاتھ سے اشارہ فرمایا کہ یوں کرو۔ چنانچہ لوگوں نے حلقہ بنالیا۔ اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی ان سے الگ نہیں پہچان سکتا تھا۔ پھر نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان غریب مہاجرین سے فرمایا: اے مہاجر فقراء! تمھارے لیے قیامت کے روز کامل فتحمندی کی خوش خبری ہے۔ تم اپنے ساتھی دولت مندوں سے نصف دن پہلے جنت میں داخل ہو گے۔ اور وہ نصف دن پانچ سو برس کا ہو گا۔"

سماعِ قرآن مجید کے اثر کے چند واقعات

نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر اثر:

حدیث میں آیا ہے کہ ایک روز حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم گھر میں تشریف فرما تھے۔ اٹھنے کے بعد آپؐ نے اپنے ہاتھوں کو زمین پر رکھا اور زور لگایا۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ موجود تھے۔ انھوں نے یہ حال دیکھ کر عرض کیا: اے اللہ کے رسولؐ! یہ آپ کو کیا ہو گیا، ابھی تو آپؐ ماشاء اللہ جوان اور تندرست ہیں۔ آپؐ نے فرمایا: شَیَّبَتْنِیْ ھُوْدُ وَ اَخَوَاتُھَا یعنی مجھے سورۂ ہود اور اس کی ہم مضمون سورتوں نے بوڑھا (خستہ) کر دیا ہے۔"

ایک مرتبہ صحابہؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے یہ آیت پڑھی: "اِنَّ لَدَیْنَآ اَنْکَالًا وَّجَحِیْمًاo وَّطَعَامًا ذَا غُصَّۃٍ وَّعَذَابًا اَلِیْمًاo (۷۳:۱۲۔۱۳) یعنی ہمارے پاس بیڑیاں ہیں اور آگ کا الاؤ ہے اور گلا گھونٹنے والا کھانا ہے اور دردناک عذاب ہے۔" تو اسے سن کر آپؐ بے

ہوش ہوکر گر پڑے۔"

حضرت عمرؓ پر اثر:

روایت ہے کہ ایک شخص نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے سامنے اس آیت کو پڑھا: "اِنَّ عَذَابَ رَبِّکَ لَوَاقِعٌ ۝ مَّالَهُ مِنْ دَافِعٍ ۝ (۵۲:۷۔۸) یعنی تیرے رب کے عذاب کا آنا ایک امر شدنی ہے اور کوئی نہیں جو اسے روک یا ٹال سکے۔" آپؓ نے اسے سنا تو آپؓ کے منہ سے چیخ نکلی اور بیہوش ہوکر گر پڑے۔ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم آپؓ کو اٹھا کر گھر لے گئے۔ آپؓ اللہ تعالیٰ کے خوف سے ایک ماہ بیمار رہے۔

حضرت عبداللہ بن حنظلہؓ پر اثر:

روایت ہے کہ ایک شخص نے حضرت عبداللہ بن حنظلہ رضی اللہ عنہ کے سامنے یہ آیت پڑھی: "لَهُمْ مِنْ جَهَنَّمَ مِهَادٌ وَّمِنْ فَوْقِهِمْ غَوَاشٍ (۷:۴۱) یعنی ان کے لیے جہنم ہی کا بچھونا ہوگا اور جہنم ہی کا اوڑھنا ہوگا۔" تو اسے سنتے ہی بے اختیار رونے لگے اور یہ حال ہوگیا کہ لوگوں نے سمجھا کہ آپ کی رُوح جسم سے پرواز کرگئی ہے۔ کچھ دیر کے بعد آپ اُٹھ کر کھڑے ہوگئے۔ لوگوں نے عرض کیا کہ آپ بیٹھ جائیں۔ آپؓ نے جواب دیا کہ اس آیت کی ہیبت مجھے بیٹھنے نہیں دیتی۔

حضرت زُرارہ بن ابی اوفیؓ پر اثر:

حضرت زرارہ بن ابی اوفیٰ رضی اللہ عنہ کبار صحابہؓ میں سے اور لوگوں کے امام تھے۔ آپؓ نے قرآن مجید کی ایک آیت پڑھی اور نعرہ مارا اور آپؓ کی رُوح تن سے پرواز کرگئی۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ۔

ابوبکر شبلی رحمۃ اللہ علیہ پر اثر:

روایت ہے کہ کسی شخص نے حضرت ابوبکر شبلیؒ کے سامنے یہ آیت پڑھی: "وَاذْكُرْ رَّبَّكَ اِذَا نَسِيْتَ (۱۸:۲۴) یعنی جب تم بھول جاؤ تو اپنے رب کا ذکر کرو۔" تو فرمایا، میرے رب کا

ذکر تو تمام جہان مل کر کرنے سے عاجز ہیں اور نعرہ مار کر بے ہوش ہو گئے۔ جب ہوش آیا تو فرمایا، مجھے اس شخص کی جان پر حیرت ہوتی ہے جو خداوند تعالیٰ کا کلام سنے اور اپنے قالب سے جدا نہ ہو۔

شیخ ابوالعباس اشقانیؒ پر اثر:

ایک دفعہ میں شیخ ابوالعباس اشقانی رحمۃ اللہ علیہ کے پاس آیا تو آپ پڑھ رہے تھے: ''ضَرَبَ اللّٰهُ مَثَلًا عَبْدًا مَّمْلُوْكًا لَّا يَقْدِرُ عَلٰى شَيْءٍ (۱۶:۷۵) یعنی مثال دیتا ہے اللہ ایک غلام کی جو دوسرے کا مملوک ہے اور کسی چیز پر اختیار نہیں رکھتا۔'' اور رو رہے تھے۔ روتے روتے آپ بے ہوش ہو گئے اور مجھے ایسا معلوم ہوا کہ آپ دنیا سے رخصت ہو گئے۔ میں نے ہلا کر عرض کیا: اے شیخ! آپ کو کیا ہوا؟ انھوں نے کہا: گیارہ برس سے اسی جگہ رُکا ہوا ہوں۔ اس سے آگے نہیں بڑھ سکا۔

شیخ ابوالعباس عطارؒ پر اثر:

ابوالعباس اشقانیؒ نے شیخ ابوالعباس عطار رحمۃ اللہ علیہ سے پوچھا: اے شیخ! آپ روزانہ کتنا قرآن مجید پڑھتے ہیں؟ انھوں نے جواب دیا کہ: پہلے تو یہ حال تھا کہ ایک دن رات میں دو ختم کرتا تھا۔ لیکن اب یہ حال ہو گیا ہے کہ چودہ برس شروع کیے ہو گئے ہیں آج سورۂ انفال پر پہنچا ہوں۔

آپؒ نے قاری ابوالقاسم کو فرمایا کہ پڑھ۔ انھوں نے پڑھا: ''يٰٓاَيُّهَا الْعَزِيْزُ مَسَّنَا وَاَهْلَنَا الضُّرُّ وَجِئْنَا بِبِضَاعَةٍ مُّزْجٰةٍ (۱۲:۸۸) یعنی اے سردار با اقتدار! ہم اور ہمارے اہل وعیال سخت مصیبت میں مبتلا ہیں اور ہم کچھ حقیری پونجی لے کر آئے ہیں۔'' آپ نے فرمایا اور پڑھ۔ قاری نے پڑھا: ''قَالُوْٓا اِنْ يَّسْرِقْ فَقَدْ سَرَقَ اَخٌ لَّهٗ مِنْ قَبْلُ (۱۲:۷۷) یعنی یوسفؑ کے بھائیوں نے کہا کہ اگر اس نے چوری کی تو کچھ تعجب کی بات نہیں اس سے پہلے اس کا بھائی بھی چوری کر چکا ہے۔'' آپؒ نے فرمایا، اور پڑھ۔ اب قاری نے پڑھا: ''لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ يَغْفِرُ اللّٰهُ لَكُمْ وَهُوَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ○ (۱۲:۹۲) یعنی آج تم پر کوئی گرفت نہیں، اللہ تمھیں معاف فرمائے وہ سب سے بڑھ کر رحم فرمانے والا ہے۔'' یہ سن کر شیخ ابوالعباس عطارؒ نے فرمایا:

اے میرے مولا! میں بے شک یوسفؑ کے بھائیوں سے بھی بڑھ کر خطا کار ہوں لیکن تو یوسفؑ سے کہیں بڑھ کر کرم فرمانے والا ہے۔ تو میرے ساتھ وہی معاملہ فرما جو یوسف نے اپنے بھائیوں سے کیا۔

ایک نیک بخت خاتون کا واقعہ:

حضرت ابراہیم نخعی رحمۃ اللہ علیہ بیان کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ میں کوفہ کے دیہات میں ایک گاؤں میں گیا۔ میں نے وہاں ایک بڑھیا کو نماز میں کھڑے دیکھا۔ نیک بختی کے آثار اس کی ہر چیز سے ظاہر تھے۔ وہ نماز سے فارغ ہوئی تو میں نے برکت کے لیے آگے بڑھ کر سلام عرض کیا۔ اس نے مجھ سے پوچھا: بیٹا! تمھیں کچھ قرآن یاد ہے؟ میں نے جواب دیا کہ جی ہاں۔ اس نے کہا کہ مجھے کچھ سنا۔ میں نے ابھی ایک دو آیتیں ہی پڑھی تھیں کہ اس کے منہ سے چیخ نکلی اور اس کی رُوح پرواز کر گئی۔

اسی طرح سے احمد بن ابی الجواریؒ بیان کرتے ہیں کہ ایک روز میں نے جنگل میں ایک جوان کو دیکھا کہ میلی سی گودڑی پہنے کنوئیں کے کنارے کھڑا ہے۔ مجھے دیکھ کر اس نے کہا: اے احمد! تم بہت اچھے وقت پہنچے، مجھے اس وقت سماع کی شدید خواہش لاحق ہو رہی تھی۔ مجھے کوئی آیت سناؤ۔ احمد کہتے ہیں کہ میرے دل میں فوراً اس آیت کا القا ہوا: ''اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ ۝ (۴۱:۳۰)

یعنی جن لوگوں نے کہا کہ رب ہمارا اللہ ہے اور پھر وہ اس پر ڈٹ گئے، اُن پر فرشتے نازل ہوتے ہیں (اور ان سے کہتے ہیں کہ) نہ ڈرو اور نہ غم کرو بلکہ خوش ہو جاؤ اس جنت کی بشارت سے جس کا تم سے وعدہ کیا گیا ہے۔'' اس جوان نے کہا: اے احمد! کعبہ کے رَب کی قسم تو نے وہی آیت پڑھی جو فرشتہ میرے سامنے پڑھ رہا تھا۔ یہ کہنا تھا کہ وہ گرا اور جان دے دی۔

جنوں پر قرآن مجید کا اثر:

طائف کے سفر کے دَوران رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم راستے میں صبح کی نماز پڑھ رہے تھے کہ جنوں کی ایک جماعت اتفاقاً قریب سے گزری اور اُن کے کان میں آپ کی آواز پڑی۔ انھوں نے ٹھیر کر حضور کی زبان سے اس کلام کو سنا اور اس درجہ متاثر ہوئے کہ اس پر وہیں ایمان لے آئے۔ قرآن مجید اس بارے میں ہمیں خبر دیتا ہے: ''اَنَّهُ اسْتَمَعَ نَفَرٌ مِّنَ الْجِنِّ فَقَالُوْآ اِنَّا سَمِعْنَا قُرْاٰنًا عَجَبًا o يَّهْدِيْٓ اِلَى الرُّشْدِ فَاٰمَنَّا بِهٖ ط وَلَنْ نُّشْرِكَ بِرَبِّنَآ اَحَدًا o (۷۲:۱۔۲) یعنی جنوں میں سے ایک جماعت نے قرآن مجید کو سنا۔ پھر اپنی قوم کے پاس واپس جا کر انھوں نے ان کو بتایا کہ ہم نے ایک عجیب وغریب کلام سنا جو نیک بختی کی طرف رہنمائی کرتا ہے۔ بھائیو! ہم نے تو اسے مان لیا ہے اور اب ہم تو اپنے رب کے ساتھ کسی اور کو شریک نہیں ٹھیرائیں گے......''

مشائخ رحمہم اللہ میں سے ایک بزرگ فرماتے ہیں کہ ایک دفعہ میں قرآن مجید پڑھ رہا تھا، جب میں نے یہ آیت پڑھی: ''وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ (۲:۲۸۱) یعنی اس دن کی مصیبت سے ڈرو جب کہ اللہ کے پاس واپس جاؤ گے۔'' تو آواز آئی: خدا کے لیے آہستہ پڑھو۔ اس آیت کی ہیبت سے چار جن مر گئے ہیں۔

قرآن مجید کا کفار پر اثر:

قرآن مجید کا یہ معجزہ ہے کہ کفار قریش جنھوں نے قرآن اور صاحبِ قرآن کو ناکام کرنے میں دن رات ایک کر رکھا تھا ان میں سے بھی بہت سے لوگ بلکہ اُن کے لیڈر تک راتوں کو چھپ چھپ کر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو نماز میں قرآن مجید پڑھتے ہوئے سنتے۔ یہاں تک کہ نضر بن حارث جو اُن میں سب سے زیادہ فصیح تھا، عتبہ بن ربیعہ جس کی بلاغت جادو اثر تھی اور ابوجہل بن ہشام جو خطابت اور دلائل دینے میں جواب نہ رکھتا تھا وہ بھی چھپ چھپ کر قرآن مجید سنتے۔ یہاں تک کہ ایک رات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن پڑھتے ہوئے سن کر عتبہ بے ہوش ہو کر گر پڑا۔

اور اس نے ابو جہل سے کہا: میں نے یہ جان لیا کہ یہ انسان کا کلام نہیں ہے۔

حضرت عمرؓ جن دنوں ابھی ایمان نہیں لائے تھے اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شدید مخالفت کرنے والے نمایاں ترین آدمیوں میں سے ایک تھے، اپنے اس زمانے کا یہ واقعہ بیان کرتے ہیں کہ:

''ایک رات میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ستانے کے خیال سے گھر سے نکلا۔ آپؐ مسجد حرام کو جا رہے تھے۔ میں ابھی کچھ فاصلے پر تھا کہ آپ مسجد میں داخل ہو گئے اور جا کر نماز شروع کر دی۔ میں دیوار کے ساتھ لگ کر سننے لگا۔ آپؐ نے سورۃ الحاقہ پڑھی۔ میں کلام کے نظم، اسلوب اور دل کشی کو دیکھ کر حیرت زدہ ہو گیا۔ میرے دل میں خیال آیا کہ خدا کی قسم یہ بڑا زبردست شاعر ہے۔ یہ خیال آنا ہی تھا کہ آپؐ نے پڑھا:

''اِنَّهٗ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ كَرِيْمٍ وَّمَا هُوَ بِقَوْلِ شَاعِرٍ ط قَلِيْلًا مَّا تُؤْمِنُوْنَ o یہ ایک رسولِ کریم کا کلام ہے، کسی شاعر کا کلام نہیں ہے۔ لیکن تم میں سے کم لوگ ہی ایمان لاتے ہیں۔''
(۶۹:۴۰۔۴۱)

میں نے یہ سنا تو فوراً خیال آیا کہ اوہو، یہ تو میرے دل کی بات جان گیا، یہ ضرور کاہن ہے۔ یہ خیال آنا تھا کہ آپؐ نے یہ آیت پڑھی: ''وَلَا بِقَوْلِ كَاهِنٍ ط قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ o تَنْزِيْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ o (۶۹:۴۲۔۴۳) یعنی یہ کہ یہ کسی کاہن کا کلام نہیں ہے، مگر تم لوگ کم ہی نصیحت حاصل کرتے ہو۔ یہ کلام تمام جہانوں کے پروردگار کی طرف سے نازل ہوا ہے۔'' جب آپؐ نے یہ سورۃ ختم کی تو میں نے ایسا محسوس کیا کہ اسلام میرے دل میں گھسا جا رہا ہے۔''

حقیقت یہ ہے کہ اگر انسان سمجھ اور توجہ کے ساتھ قرآن مجید کی طرف رجوع کرے تو اس کی مثل مؤثر کوئی اور کلام نہیں ہے۔ اس کی نصیحتیں سب نصیحتوں سے اچھی، اس کا اندازِ بیان سب بیانوں سے مختصر، اس کے احکام سب حکموں سے لطیف و دُور رس، اس کی نہی تمام نہیوں سے بڑھ کر متنبہ کرنے والی، اس کے وعدے سب وعدوں سے زیادہ دلربا، اس کی وعیدیں تمام وعیدوں سے زیادہ دل گداز، اس کے قصے سب قصوں سے زیادہ سبق آموز اور اس کی مثالیں سب مثالوں سے

زیادہ فصیح ہیں۔ دنیا کے غالب ومقتدر لوگ جو اسے رَدّ کر دیں ان کو یہ ذلیل کر کے رکھ دیتا ہے۔ اور جن کو دنیا ذلیل وخوار سمجھتی ہے وہ اس کے تابع ہو جاتے ہیں تو ان کو یہ مقتدر اور غالب بنا دیتا ہے۔

دوسری چیزوں کے سماع کے بارے میں

قرآن مجید اور تعلیمات رسولؐ کے علاوہ دوسری چیزوں کے سماع کے بارے میں یہ اصولی بات سمجھ لیجیے کہ جس طرح سے سب حلال ومفید خوبصورت چیزوں کو دیکھا اور خوشبودار چیزوں کو سونگھنا اور سب حلال وطیب چیزوں کو کھانا اور جسم کے لیے نرم اور آرام دِہ سب حلال چیزوں کو استعمال کرنا جائز اور مباح ہے، اسی طرح سے ان آوازوں کو چھوڑ کر جو فحش یا فساد انگیز یا انسانی اخلاق کو بگاڑنے اور اس پر برا اثر ڈالنے والی ہوں، باقی تمام آوازوں کا سماع (یعنی ان کو سننا) بالکل جائز اور مباح ہے۔ خواہ وہ نثر ہوں یا نظم اور شعر۔ اور خواہ وہ رَواں پڑھی جائیں یا سُر کے ساتھ۔ کیونکہ خوش آوازی اور خوش بیانی انسان کو متاثر کرنے کے نہایت مؤثر ذرائع میں سے ہیں۔ اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ خوش آوازی وخوش الحانی اور سُر اسے اچھی نہیں لگتی تو یا تو وہ غلط بیان کر رہا ہے یا نفاق سے کام لے رہا ہے یا پھر وہ انسانوں کے زمرے میں ہی داخل نہیں، بلکہ تمام جانداروں سے الگ کوئی اور مخلوق ہے۔ کیونکہ خوش آوازی سے انسان ہی نہیں تمام جاندار انتہائی حد تک متاثر ہوتے ہیں۔

خوش آوازی کے اثر کی چند مثالیں

۱۔ روایت ہے کہ ایک دفعہ اسحاق موصلی باغ میں بیٹھے ایک رُباعی گا رہے تھے اور بلبل چہک رہی تھی۔ اُن کو گاتے سن کر بلبل خاموش ہو گئی اور اُس پر اُن کی آواز کا یہ اثر ہوا کہ تھوڑی دیر میں وہ درخت سے گری اور مر گئی۔

۲۔ ابراہیم خواص رحمۃ اللہ علیہ بیان کرتے ہیں کہ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ میں عرب قبائل میں سے ایک قبیلہ میں گیا اور ایک سردار قبیلہ کے مہمان خانہ میں اترا۔ میں نے دیکھا کہ صحن میں

ایک حبشی غلام زنجیروں میں جکڑا ہوا باہر دھوپ میں پڑا ہے اور اُس کے اوپر خیمہ ڈالا ہوا ہے۔ مجھے اس کا یہ حال دیکھ کر بہت رحم آیا۔ چنانچہ میں نے اُس کی سفارش کا ارادہ کیا۔ جب کھانا آیا تو میزبان سردار خود بھی آیا اور اُس نے میرے ساتھ مل کر کھانے کا ارادہ ظاہر کیا۔ لیکن میں نے کھانا کھانے سے انکار کر دیا۔ ایک عرب کے لیے اس سے بڑھ کر سخت بات کوئی نہیں کہ مہمان کھانا کھانے سے انکار کر دے۔ چنانچہ وہ سردار بہت پریشان ہوا اور اس نے مجھ سے کہا: بھائی! میرا کھانا کھانے سے تجھے کیا چیز روک رہی ہے؟ تو کھانا کھا، میرے ملک کی سب چیزیں تیرے لیے حاضر ہیں۔ میں نے اسے کہا کہ: مجھے تیرے ملک کی حاجت نہیں، فقط یہ غلام میرے حوالے کر دو۔ اس نے کہا کہ: پہلے اس کا جرم تو معلوم کرو کہ اس نے کیا کیا ہے، پھر اس کی رہائی کے لیے اس قدر پریشان ہونا۔ بہر حال تم کھانا کھاؤ، جب تک تو میرا مہمان ہے میری تمام املاک پر تجھے حکم لگانے کا حق ہے۔ میں نے اس غلام کا جرم پوچھا تو اس نے بتایا کہ یہ غلام نہایت خوش آواز حُدی خواں ہے۔ میں نے اپنے اونٹ دے کر اسے اپنی زمین پر بھیجا کہ جا کر ان پر غلہ لادلائے۔ اس نے ہر اونٹ پر دو دو اونٹوں کا بوجھ لادا اور راستے میں حُدی خوانی شروع کر دی۔ اونٹ مست ہو کر بھاگتے اور یہ تھوڑی ہی دیر میں دوگنا غلہ لے کر آ گیا۔ لیکن جب اونٹوں پر سے غلہ اتارا تو سب اونٹ ایک ایک کر کے مر گئے۔ میں نے اس سے کہا کہ اے امیر! تیری بزرگی سے میں یہ توقع نہیں رکھتا کہ آپ سچائی کو کسی حال میں چھوڑیں گے۔ لیکن یہ بات اس قدر تعجب انگیز ہے کہ میں ثبوت کے بغیر اسے نہیں مان سکتا۔

ابراہیم خواصؒ کہتے ہیں کہ ہم یہ باتیں کر ہی رہے تھے کہ جنگل سے کچھ اونٹ سامنے پانی پینے کے لیے آئے۔ سردار نے غلاموں سے پوچھا کہ ان اونٹوں نے کتنے روز سے پانی نہیں پیا؟ انھوں نے بتایا کہ یہ اونٹ تین روز کے پیاسے ہیں۔ سردار نے اس غلام کو حدی خوانی کا حکم دیا۔ جب اس نے آواز نکالی تو تمام اونٹ پانی چھوڑ کر اس کی آواز کی طرف متوجہ ہو گئے اور اس کے بعد کسی نے پانی کی طرف منہ نہ کیا اور انھوں نے بھاگنا شروع کر دیا۔ اور جنگل میں پھیل گئے۔ اس کے بعد اس سردار نے غلام کو میرے حوالے کر دیا۔

یہ حقیقت ہے کہ اونٹوں اور گدھوں والے جب گاتے ہیں تو اونٹوں اور گدھوں میں ایک قسم کی خوشی پیدا ہوتی ہے اور اس کا اثر ان کی چال ڈھال سے ظاہر ہوتا ہے۔

۳۔ خراسان اور عراق کے لوگوں کی عادت ہے کہ رات کے وقت جنگل میں ہرنوں کا شکار کرنے کے لیے وہ کانسی کے تھال ایک خاص انداز سے بجاتے ہیں۔ ہرن اس کی آواز کو سن کر رُک جاتے ہیں۔ خود ہندوستان کے بارے میں میں نے سنا ہے کہ ایک گروہ ہے جو جنگل میں جا کر سرود شروع کر دیتے ہیں اور ہرن آ کر ان کے گرد گھومنا شروع کر دیتے ہیں، یہاں تک کہ ان کے سُرود کی لذت سے اُن کی آنکھیں بند ہونے لگتی ہیں اور وہ سو جاتے ہیں اور یہ لوگ ان کو پکڑ لیتے ہیں۔[1]

قرآن مجید کو خوش الحانی سے پڑھنے کا حکم

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''زَیِّنُوْا اَصْوَاتَکُمْ بِالْقُرْاٰنِ یعنی قرآن مجید کو پڑھتے وقت اپنی آوازوں کو سنوارو۔'' مفسرین کہتے ہیں کہ یَزِیْدُ فِی الْخَلْقِ مَایَشَاءُ (۳۵:۱) میں خوش آوازی کا عطیہ بھی شامل ہے کہ اللہ جس کو چاہتا ہے اس سے دوسروں کی نسبت زیادہ نوازتا ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مَنْ اَرَادَ اَنْ یَّسْمَعَ صَوْتَ دَاوٗدَ فَلْیَسْمَعْ صَوْتَ اَبِیْ مُوْسَی الْاَشْعَرِیْ یعنی جو شخص چاہے کہ داؤد علیہ السلام کی آواز کو سنے وہ ابوموسیٰ اشعریؓ کی آواز کو سن لے۔

شعر کے سماع کے بارے میں

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے شعر کے بارے میں لوگوں نے سوال کیا تو آپؐ نے فرمایا: ''کَلَامٌ حَسَنُہٗ حَسَنٌ وَقَبِیْحُہٗ قَبِیْحٌ، یعنی شعر بھی ایک کلام ہے، جو اس میں اچھا ہو وہ اچھا

[1] اب اس زمانے میں تو یہاں تک تجربات کیے گئے ہیں کہ خوش آوازی کا اثر نباتات پر بھی پڑتا ہے، اور کہا جاتا ہے کہ اس ذریعہ سے پیداوار میں بہت اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ (مرتب)

ہے اور جو برا ہو وہ برا ہے۔" یعنی جو چیزیں عام گفتگو یا نثر میں بیان کرنا اور سننا جائز ہے وہ شعر میں بھی جائز ہے۔ اس سلسلے میں یہ بھی روایت ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: "اِنَّ مِنَ الشِّعْرِ لَحِکْمَۃً، یعنی بعض شعر یقیناً دانائی کی بات پر مشتمل ہوتے ہیں۔" اور آپؐ نے یہ بھی فرمایا: "وَالْحِکْمَۃُ ضَالَّۃُ الْمُؤْمِنِ حَیْثُ وَجَدَھَا فَھُوَا اَحَقُّ بِھَا، یعنی حکمت (دانائی کی بات) مومن کی گم شدہ چیز ہے۔ جہاں بھی اسے ملے وہ اس کا زیادہ حقدار ہے۔" نیز یہ بھی ثابت ہے کہ صحابہؓ نے شعر کہے ہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے شعر سنے ہیں۔ چنانچہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اَصْدَقُ کَلِمَۃٍ قَالَتْھَا الْعَرَبُ قَوْلُ لَبِیْدٍ

اَلَا کُلُّ شَیْئٍ مَاخَلَا اللّٰہَ بَاطِلٌ   وَکُلُّ نَعِیْمٍ لَامَحَالَۃَ زَائِلٌ

یعنی اہل عرب میں سے جو سب سے سچی بات کسی نے کہی ہے وہ لبید کا یہ شعر ہے کہ: اللہ کے سوا تمام چیزیں باطل ہیں اور دنیا کی ساری نعمتیں بہرحال ختم ہو جانے والی ہیں۔

نیز عمرو بن شرید رضی اللہ عنہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ: "اِسْتَنْشَدَنِیْ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ ھَلْ تَرْوِیْ مِنْ شِعْرِ اُمَیَّۃَ ابْنِ اَبِی الصَّلْتِ شَیْئًا؟ فَاَنْشَدْتُہٗ مِائَۃَ قَافِیَۃٍ فَجَعَلْتُ کُلَّمَا مَرَرْتُ عَلٰی بَیْتٍ قَالَ ھِیْہِ، فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ کَانَ یُسْلِمُ فِیْ شِعْرِہٖ، یعنی نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا کہ اگر تمھیں امیہ بن ابی صلت کے اشعار میں سے کچھ یاد ہے تو سناؤ۔ چنانچہ میں نے آپ کو ایک سو شعر سنائے۔ جب میں ایک شعر ختم کرتا تو آپؐ فرماتے، اور کہو۔ پھر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ اپنے شعروں میں اسلام لاتا ہے۔"

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ شعر کے بارے میں احتیاط برتنے کی ہدایت فرماتے تھے، کیونکہ لوگ اس میں بالعموم غلطی یعنی افراط و تفریط میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ عملاً یہی ہوا کہ ایک گروہ تمام اشعار کا سننا حرام ٹھیراتا ہے حالانکہ یہ لوگ خود رات دن مسلمانوں کی چغلی اور غیبت کرتے رہتے ہیں اور اس میں انھیں کوئی برائی نظر نہیں آتی۔ اور دوسرا گروہ ہر قسم کے اشعار کا سننا

سننے سنانے میں مشغول رہتا ہے۔

اس سلسلے میں صحیح صورت بہر حال وہی ہے جو خود حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرما دی ہے کہ: شعر بھی ایک کلام ہے۔ جو اس میں اچھا ہے وہ اچھا ہے اور جو برا ہے وہ برا ہے۔

گانا اور راگ سننے کے بارے میں

شعر کو خوش الحانی کے ساتھ پڑھنے کا نام گانا اور مل کر گانے کا نام راگ ہے۔ اور فقہاء اس پر متفق ہیں کہ جب راگ کے ساتھ ساز و سامان نہ ہو اور اس کے سننے سے دل میں فسق پیدا ہونے کا اندیشہ نہ ہو تو اس کا سننا مباح ہے، یعنی اُس کے سننے میں حرج نہیں۔ اس کے ثبوت میں جو آثار اور احادیث وہ پیش کرتے ہیں ان میں سب سے اہم حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی یہ روایت ہے:

''قَالَتْ كَانَتْ عِنْدِیْ جَارِيَةٌ تُغَنِّیْ فَاسْتَأْذَنَ عُمَرُ فَلَمَّا اَحَسَّتْهُ وَسَمِعَتْ حِسَّهُ فَرَّتْ فَلَمَّا دَخَلَ عُمَرُ تَبَسَّمَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَقَالَ لَهٗ عُمَرُ مَا اَضْحَكَكَ يَا رَسُوْلَ اللّٰهِ؟ قَالَ كَانَتْ عِنْدَنَا جَارِيَةٌ تُغَنِّیْ فَلَمَّا سَمِعَتْ حِسَّكَ فَرَّتْ، فَقَالَ عُمَرُ: لَا اَبْرَحُ حَتّٰى اَسْمَعَ مَا كَانَ سَمِعَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ، فَدَعَا رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ وَسَمِعَ، یعنی حضرت عائشہؓ بیان فرماتی ہیں کہ میرے پاس ایک لونڈیہ بیٹھی گا رہی تھی کہ اتنے میں حضرت عمرؓ آئے اور انھوں نے اندر آنے کی اجازت طلب کی۔ جب لونڈیہ کو حضرت عمرؓ کے آنے کا پتہ چلا تو وہ اٹھ کر بھاگ گئی۔ جب حضرت عمرؓ اندر تشریف لائے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسکرائے۔ حضرت عمرؓ نے آپؐ سے پوچھا کہ اے اللہ کے رسولؐ! آپ ہنس کیوں رہے ہیں؟ آپؐ نے فرمایا کہ لونڈیہ ہمارے پاس بیٹھی گا رہی تھی، جب اسے معلوم ہوا کہ آپ آ رہے ہیں تو وہ بھاگ گئی۔ اس پر حضرت عمرؓ نے کہا کہ جب تک میں اس چیز کو نہ سن لوں جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سنا ہے میں اس بات کو نہیں چھوڑوں گا۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے بلایا اور سنا۔''

راگ اور گانے کے بارے میں صوفیاء کی آراء

اس روایت سے ملتی جلتی روایتیں اور بھی بہت سے صحابہ سے آئی ہیں۔ اور شیخ ابو عبدالرحمٰن السلمیؒ نے ان سب احادیث کو اپنی کتاب ''السّماع'' میں جمع کر کے سَماع (گانا سننے) کے قطعی مباح ہونے کا فیصلہ صادر کیا ہے۔

لیکن مشائخ صوفیاء رحمہم اللہ کے نزدیک کسی چیز کا مباح ہونا اس کے لیے کافی نہیں ہے کہ اسے عمل میں بھی لایا جائے اور اسے اختیار کیا جائے۔ وہ فرماتے ہیں کہ بندے کو طلب اس چیز کو کرنا چاہیے جس میں کوئی مثبت فائدہ ہو۔ محض اباحت کا طلب کرنا عوام کا کام ہے۔ بلکہ اصل حقیقت یہ ہے کہ اباحت چوپایوں کا مقام ہے۔ آدمی کو اللہ تعالیٰ نے مکلف اور اشرف المخلوقات بنایا ہے۔ اسے چاہیے کہ اپنے ہر کام سے فائدہ طلب کرے اور غیر مفید اور لاحاصل کاموں سے پرہیز کرے۔

صاحبِ کشف المحجوب کی اپنی رائے:

ایک دفعہ میں (علی ہجویری بن عثمان جلابی) مرو میں تھا۔ وہاں ایک مشہور اہل حدیث امام تھا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ میں نے سَماع کی اباحت میں ایک کتاب مرتب کی ہے۔ میں نے کہا کہ یہ تو دین میں ایک بہت بڑی آفت ظاہر ہوئی کہ آپ جیسے ایک امام ومقتداء نے اس لہو ولعب کو جو تمام گناہوں کی جڑ ہے، جائز کر دیا۔ اس نے کہا کہ اگر آپ اسے حلال نہیں سمجھتے تو سماع کیوں کرتے ہیں؟ میں نے کہا کہ اس کا حکم دل پر اس کی تاثیر کے لحاظ سے ہے۔ اگر یہ حلال کی تاثیر ہو تو یہ حلال ہوتا ہے، مباح کی تاثیر ہو تو مباح ہوتا ہے، ورنہ حرام ہوتا ہے۔

دل پر سماع کی تاثیر کا انحصار دو باتوں پر ہے۔ ایک یہ کہ جو چیز سنی جا رہی ہے وہ کیسی ہے، اور دوسرے یہ کہ سننے والا کون اور کس طبیعت اور مذاق کا آدمی ہے۔ اگر چیز اچھی بھی ہو، مگر سننے والے کی طبیعت میں فساد ہو تو وہ جو کچھ سنے گا اس سے اس کے اندر فساد ہی میں اضافہ ہوگا۔

جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''فَاَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا فَیَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ وَاَمَّا الَّذِیْنَ كَفَرُوْا فَیَقُوْلُوْنَ مَاذَآ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ۘ یُضِلُّ بِهٖ كَثِیْرًا وَّیَهْدِیْ بِهٖ كَثِیْرًا ط (۲:۲۶)

یعنی جو لوگ حق بات کو قبول کرنے والے ہیں وہ اسی بات کو سن کر جان لیتے ہیں کہ یہ حق ہے جو ان کے رب کی طرف سے آیا ہے، اور جو ماننے والے نہیں ہیں وہ اسی بات کو سن کر کہنے لگتے ہیں کہ ایسی باتوں سے اللہ کو کیا سروکار؟ اس طرح اللہ ایک ہی بات سے بہتوں کو گمراہی میں مبتلا کر دیتا ہے اور بہتوں کو راہِ راست دکھا دیتا ہے۔''

حضرت ذوالنون مصریؒ کی رائے:

اس سلسلے میں حضرت ذوالنون مصری رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے: ''اَلسَّمَاعُ وَارِدُ الْحَقِّ تَزْعَجُ الْقُلُوْبُ اِلَی الْحَقِّ فَمَنْ اَصْغٰی اِلَیْهِ بِحَقٍّ تَحَقَّقَ وَمَنْ اَصْغٰی اِلَیْهِ بِنَفْسٍ تَزَنْدَقَ یعنی سماع بندے پر خدا کی طرف سے وارد ہوتا ہے اور یہ دلوں کو حق کی طرف مائل کرتا ہے۔ مگر جو شخص حق کے لیے اس کی طرف جھکتا ہے وہ حق کی راہ پا لیتا ہے اور جو لذتِ نفس کے لیے اس کی طرف آتا ہے وہ بے دینی کی راہ پڑ جاتا ہے۔''

حضرت ابوبکر شبلیؒ کی رائے:

حضرت ابوبکر شبلیؒ فرماتے ہیں کہ جس شخص کا دل سرتاپا خدا کی باتوں میں ڈوبا ہوا نہ ہو، اس کے لیے سماع فتنہ اور آفت ہے۔

حضرت ابوعلی رودباریؒ کی رائے:

حضرت ابوعلی رودباری رحمۃ اللہ علیہ سے ایک شخص نے سماع (گانا اور راگ سننے) کے بارے میں سوال کیا تو آپؒ نے فرمایا: ''لَیْتَنَا نَخْلُصُ مِنْهُ رَأْسًا بِرَأْسٍ، یعنی اے کاش! ہم اس (سماع) سے سر بسر خلاصی پاتے۔''

چنانچہ صوفیاء کرام رحمہم اللہ کا ایک گروہ اپنے مریدوں کو سماع سے منع کرتا ہے کہ مبادا وہ بلا میں مبتلا ہو جائیں۔

حضرت جنید بغدادیؒ کی رائے:

حضرت جنید رضی اللہ عنہ نے اپنے ایک مرید کو نصیحت فرمائی کہ اگر تو اپنے دین کو سلامت رکھنا چاہتا ہے اور اپنی توبہ کی حفاظت کرنا چاہتا ہے تو صوفیوں کے سماع میں کبھی نہ شامل ہونا۔ جب تک تو جوان ہے اپنے آپ کو اس کا اہل نہ سمجھنا اور اس کا منکر رہنا۔ اور جب تو بوڑھا ہو جائے تو کوئی بیہودہ کام نہ کرنا۔ گویا 'سماع' جوانوں کے لیے فتنہ اور بوڑھوں کے لیے ایک بیہودہ کام ہے۔

محتاط صوفیاءؒ کا مسلک:

محتاط صوفیائے کرام رحمہم اللہ کہتے ہیں کہ جب عوام کے لیے سماع میں فتنہ ہے اور ہمارے سننے سے ان کا اعتقاد خراب ہوتا ہے، اور ہماری دیکھا دیکھی وہ ایک فضول کام میں مبتلا ہوتے ہیں، تو عوام پر ہماری شفقت کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اس کام سے ہاتھ اٹھالیں۔ کیونکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ: ''مِنْ حُسْنِ اِسْلَامِ الْمَرْءِ تَرْکُ مَالَا یَعْنِیْہِ یعنی یہ کہ آدمی کے اسلام کی خوبی یہ ہے کہ فضول باتوں کو بھی چھوڑ دے۔'' مطلب یہ کہ یہی نہیں کہ وہ گناہ اور نافرمانی کے کاموں کو چھوڑ دے، بلکہ جن باتوں کا کوئی فائدہ اور حاصل نہیں ہے ان سے بھی اجتناب کرے۔ مزید برآں گانے کے بارے میں تو یہ روایات بھی موجود ہیں کہ:

۱۔ نبی کریم ﷺ نے حضرت حسان بن ثابت کی کنیز کو گانے کی بناء پر ڈانٹا اور سخت تنبیہہ فرمائی۔

۲۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک صحابی کو گانے (غنا کرنے) کی وجہ سے کوڑے لگوائے۔

۳۔ امیر معاویہؓ پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو منجملہ دوسرے اعتراضات کے ایک اعتراض یہ بھی تھا کہ وہ گانے والی لونڈیاں رکھتے ہیں، اور

۴۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے حضرت حسنؓ کو اس حبشی عورت کو دیکھنے سے منع فرمایا جو گا رہی تھی۔ آپؓ نے فرمایا کہ وہ شیطان کی ساتھی ہے۔

چنانچہ بعد کے زمانے میں راگ وسرود کے مکروہ ہونے پر امت کا اجماع ہو گیا۔[1]

وجد کے بارے میں

''وجد'' کے معنی یافتن (پانے) اندوہ گین (غمگین) ہونے اور مالا مال ہونے کے ہیں۔ مطلب یہ کہ بندے پر یہ کیفیت طاری ہو کہ وہ اپنی مراد پا لینے کی خوشی یا اپنے مطلوب کے غم میں اپنے آپ کو کھو دے۔ عوام اگرچہ وجد کی حالت کو ایک بلند پایہ مرتبہ اور ولایت کی علامت سمجھتے ہیں، لیکن مشائخ رحمہم اللہ اس امر پر متفق ہیں کہ علم اور ہوش کی حالت وجد کی حالت سے قوی تر ہے۔ کیونکہ وجد کی حالت میں آدمی خطرے کے محل میں ہوتا ہے، اور علم کی حالت میں امن کے محل میں۔ طالب کو تمام احوال میں شریعت اور علم کا پیرو ہونا چاہیے۔ مگر جب وہ وجد کی حالت میں ہو گا تو خطاب، ثواب، عذاب، عزت اور ذلت سب چیزیں اس سے ساقط ہو جائیں گی۔ اس حالت میں اس کا حکم مجنون کا ہو گا نہ کہ اولیاء اور مقربین کا۔ جب حال علم پر غالب ہوتا ہے تو بندہ خدا کی حدوں سے بے نیاز ہو جاتا ہے۔ علم کی حالت میں وہ امر اور نہی کی پناہ میں ہوتا ہے۔

رقص کے بارے میں

یہ بات اچھی طرح سے ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ شریعت اور طریقت میں رقص کی کوئی اصل نہیں ہے۔ وجد کی حالت میں بھی رقص تمام اہل عقل کے نزدیک لہو ہے۔ اور اگر ہزلیات کے

---

[1] ہمارے اب دور میں راگ اور گانے کا مزامیر (آلاتِ موسیقی) کے بغیر تصور ہی ناپید ہے اور حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: ''میں آلاتِ موسیقی کو توڑنے کے لیے بھیجا گیا ہوں۔'' (رسائل ومسائل مولانا مودودی، جلد اوّل، صفحہ ۲۰۵)۔ لہٰذا اس راگ ورنگ کے جواز کی کوئی گنجائش نہیں۔ ہاں مزامیر کے بغیر پاکیزہ کلام تنہا یا مل کر بھی خوش آوازی اور سر کے ساتھ گا یا سن لیا جائے تو اس میں حرج نہیں۔ ایسے گانے پر حضورؐ کے اس ارشاد کا اطلاق ہو گا جو اوپر گزرا ہے کہ ''شعر بھی کلام کی ایک نوع ہے، اس میں جو اچھا ہے وہ اچھا ہے اور جو برا ہے وہ برا ہے۔'' بے جا اور حد سے زیادہ پابندیاں لگانے سے بھی انسانی طبائع بغاوت کی طرف مائل ہونے لگتی ہے اور اصلاح کے بجائے فساد کی راہ پر پڑ جاتی ہیں۔ صحیح راہ اعتدال و توسط ہی کی راہ ہے جس کی نشاندہی خود حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے مذکورہ ارشاد میں فرما دی ہے۔ (مرتب)

ساتھ ہوتو سراسر لغو ہے۔ مشائخ میں سے کسی نے بھی اس کو اچھا نہیں سمجھا۔ یہ بھرتی کے صوفیوں کا مشغلہ ہے اور وہ اس کی تائید میں جو آثار لاتے ہیں وہ سب کے سب باطل ہیں۔ ناچنا عقل اور شریعت دونوں کی رو سے سب لوگوں کے نزدیک برا ہے۔ اور محال ہوگا کہ اسے بزرگ آدمی اختیار کریں۔ پھر جو نوجوانوں کی صحبت میں اسے اختیار کرنے اور نوجوانوں میں بیٹھ کر اس کا نظارہ کرنے کو جائز کہے وہ تو بلاشبہ کافر ہی ہوگا۔[1]

کپڑے پھاڑنے کے بارے میں

کپڑوں کا پھاڑنا صوفیوں کے ایک طائفہ کی عادت ہو گیا ہے۔ خصوصاً بڑے بڑے مجمعوں میں جہاں بڑے بزرگ حاضر ہوں اس کا وقوع بہت ہوتا ہے۔ لیکن علماء کا ایک گروہ درست لباس کو پھاڑ کر چیتھڑے کرنے کو ناجائز اور فساد کہتا ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ لباس کو پھاڑنا طریقت میں کوئی اصل نہیں رکھتا۔ اور سماع میں صحت حال کی حالت میں ایسا نہیں کرنا چاہیے۔ کیونکہ ایسا کرنے سے اسراف کے سوا کچھ حاصل نہ ہوگا۔ ہاں اگر سننے والے پر غلبہ ظاہر ہو اور وہ قابلِ خطاب نہ رہے اور بے خبر ہو جائے تو ایسا شخص معذور سمجھا جائے گا۔

سماع کے آداب

سماع (جو راگ فسق پر ابھارنے والا نہ ہو اس کے سننے) کے آداب و شرائط یہ ہیں کہ:

۱۔ آدمی کی طبیعت سماع کے وقت نہ صرف یہ کہ لہو ولعب کی طرف مائل نہ ہو بلکہ مثبت طور پر اس سے متنفر ہو۔ مطلب یہ کہ اس کی غرض صرف دل میں رقت پیدا کرنے یا روح میں ارتعاش پیدا کرنے کے لیے سماع کو بیرونی تحریک کے طور پر استعمال کرنا ہو۔

[1] پس شریعت وطریقت میں کسی حالت میں کسی نوع کے رقص کی کوئی گنجائش نہیں۔ اور اس وقت ہمارے اور دوسرے بہت سے مسلمان ممالک کے کلبوں اور ہوٹلوں میں جو کچھ ہو رہا ہے اس میں مبتلا لوگوں کے بارے میں حکم صاحب کشف المحجوب کی اس رائے سے بآسانی سمجھا جاسکتا ہے۔ (مرتب)

۲۔ مذکورہ بالا قسم کی ضرورت کے بغیر سماع نہ کرے اور نہ اس کو عادت بنائے۔ کبھی کبھار اس سے مدد لے۔

۳۔ سماع کے وقت لازم ہے کہ اس جگہ پیر موجود ہو۔

۴۔ سماع کی جگہ عوام سے خالی ہو۔

۵۔ قوّال ایسے ہوں جن کی اس کے دل میں عزت اور احترام ہو۔

۶۔ ہر قسم کے تکلف و تصنع سے دل پاک ہو اور دوسرے تمام مشغلوں سے الگ ہو کر خدا کی طرف یکسو ہو چکا ہو۔

۷۔ مبتدیوں کو سماع کی مجلس میں نہ بٹھایا جائے۔

۸۔ نوعمر لڑکوں کو بھی مجلس میں نہ شریک کیا جائے تاکہ ایسا نہ ہو کہ جاہل صوفی اس کو نظیر بنا کر ان باتوں کو اپنا مذہب بنالیں، اور حقیقت کو گم کر کے صرف ظاہر باتوں کو لے کر لوگوں کو گمراہ کرتے پھریں۔

۹۔ قوالوں کے گانے کی اچھائی یا برائی کا اظہار نہ کرے۔ اچھا گا رہے ہوں تو، اور برا گا رہے ہوں تو، حوالہ بخدا کرے اور نہ کسی دوسرے شخص کے سماع میں مداخلت کرے۔

۱۰۔ سماع سے جو کیفیت (وجد یا اس کے سوا) پیدا ہو اسے نہ بہ تکلف اپنے سے دُور کرنے کی کوشش کرے اور نہ مصنوعی طور پر اسے طول دینے کی کوشش کرے۔

سیکیورٹی وارڈ۔ سنٹرل جیل منٹگمری

۳۱ مارچ ۱۹۶۲ء

ٹھیک ۵ بجے شام

تکمیل نظر ثانی بتاریخ ۲۱ ستمبر ۱۹۶۷ء

۵۔ اے ذیلدار پارک، اچھرہ، لاہور

☆☆☆☆☆

اسلامک پبلیکیشنز پرائیویٹ لمیٹڈ
منصورہ ملتان روڈ، لاہور پاکستان